127427 12-12-09.

tle - IBN-E-AL WAQT.

uthor - Nazeer Ahmad Dehelvi.

ublisher - Majlis Taraqqi Urdu (Lahore).

ate - N.A.

ges - 350

ject - Urdu Novel.

دیباچه

ابن الوقت ایک معاشرتی اور سیاسی تصنیف ہے؛ مولوی نذیر احمد (۱۸۳۶ء–۱۹۱۲ء) نے یہ کتاب قصے کے پیرایے میں اس غرض سے لکھی تھی کہ ''وضع ظاہر، لباس اور طرز تمدن میں انگریزوں کی تقلید کے نقصان دکھا کر مسلمانوں کو اس سے باز رکھا جائے'' («ابن الوقت» کے پہلے ایڈیشن کے سرورق کی عبارت)۔ دوسرا مقصد جو کتاب پڑھنے سے ظاہر ہو جاتا ہے یہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ دار و گیر کے باعث مسلمانوں بالخصوص دھلی کے مسلمانوں میں انگریزی عملداری سے جو شدید نفرت پائی جاتی تھی، اُس کا اثر کم کیا جائے تا کہ مسلمان اُس سیاسی تحریک سے دور رہیں جو قومی حقوق کی خاطر ملک میں شروع ہو چکی تھی۔ ان مقاصد کی روشنی میں دیکھا جائے تو آج اس کتاب کی قیمت پرانی جنتری کے اوراق پارینہ سے زیادہ نہ ہوگی کیوں کہ دولت انگلشیہ کی تمام 'برکتوں اور خوبیوں'' کے باوصف ہمارا ملک تیرہ سال گذرے غیر ملکی تسلط سے آزاد ہو چکا ہے۔ رہا مغربی وضع ظاہر، لباس اور طرز تمدن'' کی تقلید کا سوال، سو تاریخ اس کا جواب بھی دے چکی ہے؛ چنانچہ تمام دنیا کے روشن خیال مسلمان اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ مغربی طرز معاشرت کو اپنانے سے ہمارے مذہبی عقائد کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا اور یہ کہ مسلمانوں کی نجات اسی میں ہے کہ وہ دانایان مغرب سے ترقی اور خوش حالی کا راز سیکھیں اور اپنے معاشرے میں زندگی کے لیے

نئے تقاضوں کے مطابق ضروری تبدیلیاں کریں (البتہ اس کتاب میں جو چیز ابھی تک زندہ ہے اور جو اسے مدت تک زندہ رکھے گی، وہ مولوی نذیر احمد کا دلکش طرز نگارش ہے، شوخی اور ظرافت سے بھرا ہوا اُن کا دلچسپ انداز بیان ہے، اُن کی بول چال کی میٹھی، سلیس اور ٹکسالی زبان ہے)

مولوی نذیر احمد دسمبر ۱۸۳۶ء میں ضلع بجنور کے ایک گاؤں ریہڑہ میں پیدا ہوئے، اُن کے والد مولوی سعادت علی بڑے دین دار مگر غریب آدمی تھے۔ نذیر احمد نے ابتدائی تعلیم کچھ مکتب میں، کچھ باپ سے حاصل کی؛ پھر بجنور میں ایک ڈپٹی کلکٹر سے پانچ سال تک عربی نحو، منطق اور فلسفہ پڑھا۔ بڑے ہوئے تو والد اُن کو دھلی لائے اور مدرسۂ مسجد اورنگ آبادی کے مدرس مولوی عبدالخالق کے سپرد کر گئے مگر اس مدرسے میں علم سے زیادہ ٹکر گدائی کا سبق دیا جاتا تھا۔ مولوی نذیر احمد کو یہاں بڑی بڑی ذھنی اور جسمانی اذیتیں اُٹھانی پڑیں۔ اتفاق سے ایک دن دھلی کالج میں داخلے کی صورت نکل آئی اور وہ دھلی کالج میں منتقل ہو گئے مگر والد کی ھدایت کے بموجب اُنھوں نے کالج میں انگریزی نہ سیکھی۔

آٹھ سال تک کالج میں تعلیم پانے کے بعد مولوی نذیر احمد ۱۸۵۴ء میں کنجاہ، ضلع گجرات (پنجاب) میں چالیس روپے ماھوار پر مدرس مقرر ہوئے۔ دو برس بعد ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو کر کانپور چلے گئے مگر انگریز انسپکٹر سے نہ بنی اس لیے استعفیٰ دے کر دھلی آ گئے کیوں کہ والد کے انتقال کے بعد مولوی نذیر احمد نے اپنے پرانے اُستاد مولوی عبدالخالق کی پوتی سے شادی کر کے دھلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی

لیکن کانپور سے ابھی دھلی نہ پہنچے تھے کہ ۱۸۵۷ء کی شورش شروع ہوگئی۔ اس ھنگامے میں مولوی صاحب نے ایک انگریز عورت کی جان بچائی؛ «ابن الوقت» میں غدر کے جو واقعات درج ھیں مع نوبل صاحب کی جان بچانے اور تیمارداری کے واقعات کے، وہ بڑی حد تک مولوی نذیر احمد کی آنکھوں دیکھی باتیں ھیں۔ انگریز عورت کی جان بچانے کے صلے میں وہ الہ آباد میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ھوئے، وھیں اُنھوں نے حالات سے مجبور ھو کر انگریزی زبان سیکھی، تب گورنمنٹ نے انکم ٹیکس کے قانون اور قانون تعزیرات ھند کے ترجمے کا کام سپرد کیا۔ قانون تعزیرات ھند کا ترجمہ مولوی نذیر احمد کا بہت بڑا کارنامہ ھے؛ اس کے صلے میں اُن کو کانپور میں تحصیل دار مقرر کیا گیا، کچھ عرصے بعد ترقی کر کے مولانا ڈپٹی کلکٹر ھوگئے اور چودہ سال تک یوپی کے مختلف ضلعوں میں اسی عہدے کے فرائض انجام دیتے رھے۔

یہی زمانہ اُن کی اصلاحی تصانیف کی ابتدا کا بھی ھے۔ اس کا آغاز کیوں کر ھوا خود مصنف کی زبانی سنیے: ''میں اپنے بچوں کے لیے ایسی کتابیں چاھتا تھا کہ وہ اُن کو چاؤ سے پڑھیں، ڈھونڈھا، تلاش کیا، کہیں پتا نہ لگا؛ ناچار میں نے ھر ایک کے مناسب حال کتابیں بنانی شروع کیں: بڑی لڑکی کے لیے «مراۃ العروس» چھوٹی کے لیے «منتخب الحکایات» بشیر کے لیے «چند پند»۔ یہ نہیں کیا ھے کہ کتابیں سالم لکھیں تب پڑھانی شروع کریں؛ نہیں، بلکہ ھر ایک کتاب کے چار چار پانچ پانچ صفحے لکھ کر ھر ایک کے حوالے کر دیے مگر وہ بچوں کو ایسی بھائیں کہ جس کو پاؤ صفحے کے پڑھنے کی طاقت تھی وہ آدھے صفحے کے لیے اور جس کو ایک صفحے کی استعداد تھی وہ ورق کے

لیے مستعجل تھا، جب دیکھو ایک نہ ایک متقاضی کہ میرا سبق رہ گیا ہے۔ میں اس وقت قلم برداشتہ لکھ دیا کرتا؛ یوں کتابوں کا پہلا گھان تیار ہوا۔"

اتفاق سے ان کتابوں پر سر رشتہ تعلیم کے ڈائرکٹر کی نظر پڑی، اُس نے "مراۃ العروس" کو بہت پسند کیا، حکومت سے ایک ہزار روپیہ انعام دلوایا اور کتاب کو چھپوانے کی سفارش کی؛ چنانچہ "مراۃالعروس" ۱۸۶۹ء میں "بنات النعش" ۱۸۷۳ء میں اور "توبۃ النصوح" ۱۸۷۷ء میں شائع ہوئیں اور بے حد مقبول ہوئیں۔

مولوی نذیر احمد کی شہرت دکن پہنچی تو سر سالار جنگ نے اُنھیں حیدرآباد بلوایا جہاں ترقی کرتے کرتے وہ بورڈ آف ریونیو کے ممبر ہوگئے مگر اُنھوں نے سر سالار جنگ کی وفات کے بعد وہاں کی درباری سازشوں سے گھبرا کر، پنشن لے لی اور ۱۸۸۳ء میں دہلی واپس آگئے اور تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گئے؛ وہیں ۳ مئی ۱۹۱۲ء کو اُن کا انتقال ہوا۔

مولوی نذیر احمد کا شمار اُنیسویں صدی کے مشہور مصلحین قوم میں ہوتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ مسلمانوں کے سچے بہی خواہ تھے خاص کر مسلمان عورتوں کی ذہنی پستی، زبوں حالی اور بے بسی پر اُن کا دل بہت کڑھتا تھا؛ چنانچہ تمام عمر وہ تحریر اور تقریر کے ذریعے مسلمانوں کی اخلاقی اور معاشرتی اصلاح کی کوشش کرتے رہے مگر اُن کا اصلاح کا تصور اور اصلاحی تدابیر کا انداز سر سید احمد خاں سے بالکل مختلف تھا۔ یوں تو انگریزوں کی خیر خواہی اور وفا داری دونوں کا مسلک تھا مگر سر سید مرحوم مغربی انداز فکر، مغربی اقدار اور مغربی تعلیم و تہذیب کے شدت سے حامی تھے اور اسی کی عملی

شکل اُن کی تحریک علی گڑھ تھی؛ اس کے برعکس مولوی نذیر احمد اپنی تمام دردمندیوں اور اصلاح پسندیوں کے باوجود سرسید اور اُن کی تحریک کو اسلام کی ضد سمجھتے تھے؛ ان دونوں بزرگوں کی سوچ کا فرق «ابن الوقت» کے ہر صفحے پر جھلکتا ہے۔

یہ کتاب ایسے زمانے میں لکھی گئی تھی جب سرسید کی تحریک عروج پر تھی۔ مسلمانوں کا ایک گروہ سرسید کی تعلیمات کا حامی تھا اور اُن کی سرگرمیوں کا ساتھ دیتا تھا، ان میں مولانا حالی، مولانا شبلی، نواب محسن الملک وغیرہ پیش پیش تھے۔ دوسرا گروہ سرسید کی تعلیمات کا شدت سے مخالف تھا اور اُن پر کفر و الحاد کے فتوے صادر کرتا رہتا تھا، اس گروہ میں بعض علماء دین کے علاوہ مولوی نذیر احمد اور اکبر الہ آبادی بھی شامل تھے جو سرسید کو کافر نہ سہی گمراہ ضرور سمجھتے تھے۔ «ابن الوقت» میں مولوی نذیر احمد نے سرسید اور اُن کے عقاید کا خاکہ اُڑایا ہے البتہ ہوشیاری یہ کی ہے کہ اپنے ذاتی تجربوں کو ابن الوقت سے منسوب کر دیا ہے: دھلی کالج کے تجربے، ہنگامۂ غدر کے تجربے، انگریز کی جان بچانے کے تجربے، سرکاری ملازمت کے تجربے، انگریزوں کی بدسلوکیوں کے تجربے، سب اُن کی آپ بیتی ہے مگر ان تجربوں کی مٹی سے اُنھوں نے جو پتلا بنایا، اس میں روح پھونکی ہے سرسید کی۔ اس لیے وہ یہ کہنے میں کسی حد تک حق بجانب ہیں کہ ”ابن الوقت میں خود ہوں“ اور جسٹس محمود بھی یہ شکایت کرنے میں حق بجانب ہیں کہ مولوی نذیر احمد نے ”یہ کتاب لکھ کر میرے والد کو بدنام کیا ہے“۔ مگر سرسید کا چربہ کھینچتے وقت مولوی نذیر احمد یہ نکتہ نظر انداز کر گئے ہیں کہ

سر سید ایک مصلح قوم کے فرائض اور ذمہ داریوں سے واقف تھے، وہ کوئی تنہا فرد نہ تھے بلکہ انھوں نے اپنے جوش یقین اور قوت عمل سے اپنے ارد گرد ہم خیالوں کی ایک فعال جماعت پیدا کر لی تھی اور اپنے بے پناہ خلوص اور تنظیمی صلاحیتوں کے سبب سے وہ اپنی ذات سے ایک انجمن، ایک ادارہ، ایک تحریک بن گئے تھے۔ اس کے برعکس بے چارہ ابن الوقت ایک تنہا فرد تھا؛ جس قوم کی اصلاح کا وہ مدعی تھا، اس سے اسے دور کا بھی تعلق نہ تھا، نہ کوئی اس کا ہم نوا تھا نہ ہوا خواہ؛ چنانچہ ایک سرکاری ملازم کا چھاؤنی کی کوٹھی میں انگریزوں کے ساتھ رہ کر جو انجام ہونا تھا، وہ ابن الوقت کا ہوا؛ سر سید کی کامیابی اور ابن الوقت کی ناکامی کا راز بھی یہی ہے۔

ابن الوقت کا قصہ بہت مختصر، بہت سیدھا سادا ہے۔ ابن الوقت دہلی کا ایک کھاتا پیتا نوجوان ہے، تعلیم اس نے دہلی کالج میں پائی ہے۔ اس کا تھوڑا بہت تعلق شاہی قلعے سے بھی ہے۔ غدر کے ہنگامے میں ایک دن وہ ایک زخمی انگریز افسر نوبل صاحب کی جان بچاتا ہے اور اسے اپنے گھر میں پناہ دیتا ہے، اس کے صلے میں ابن الوقت کو ایک معقول جاگیر اور اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کا عہدہ ملتا ہے۔ نوبل صاحب کی باتوں کا اس پر اتنا اثر ہوتا ہے کہ وہ قوم کی اصلاح کی خاطر انگریزوں کی طرز معاشرت اختیار کرنے پر آمادہ ہوجاتا ہے، اپنا آبائی مکان چھوڑ کر چھاؤنی میں جہاں انگریز آباد ہیں ایک کوٹھی کرایے پر لیتا ہے، اسے انگریزی انداز سے آراستہ کرتا ہے اور اکیلا وہاں رہنے لگتا ہے؛ اپنے عزیزوں، رشتہ داروں سے ناتا توڑ کر انگریزوں سے رشتہ جوڑتا ہے اور ان سے برابری سے ملتا ہے۔ نوبل صاحب کے رہنے تک دوسرے انگریز بھی

اُس کی آؤ بھگت کرتے ھیں مگر نوبل صاحب کے ولایت واپس، جانے کے بعد اُن کے دل کی کدورت ظاھر ھو جاتی ھے اور وہ ابن الوقت کے درپے ھو جاتے ھیں؛ ابن الوقت کو چھاؤنی کی، کوٹھی خالی کرنی پڑتی ھے کیوں کہ انگریز یہ نہیں برداشت کر سکتے کہ کوئی دیسی آدمی اُن کے علاقے میں اُن کا ھم سر بن کر رھے؛ قریب ھے کہ ابن الوقت معتوب ھو کر نوکری سے بھی نکالا جائے کہ اُس کے دور کے ایک رشتہ دار، خواجہ خضر بن کر آتے ھیں اور مباحثوں اور مناظروں کے ذریعے ابن الوقت کو مغربی طرز زندگی ترک کرنے پر تیار کرتے ھیں، تب اُس کی نوکری بحال ھو جاتی ھے اور ابن الوقت اپنے رشتہ داروں سے جا ملتا ھے۔

اُردو زبان میں ناول کی ابتدا مولوی نذیر احمد ھی سے ھوتی، ھے، شاید اسی لیے نقادوں نے «ابن الوقت» کو بھی ناول کا لقب دیا ھے ۔ «ابن الوقت» صحیح معنی میں ناول ھے یا نہیں، ھمیں، اس سے بحث نہیں، البتہ مولوی نذیر احمد کے مخالفین کو بھی یہ ماننا پڑے گا کہ وہ قصہ نویسی سے ناواقف نہیں ھیں؛ وہ دراصل کہانی لکھتے نہیں بلکہ کہانی کہتے ھیں؛ دھلی کے پرانے داستان گویوں کی مانند اُن کا بیان تکلف، تصنع اور آورد سے پاک ھوتا ھے، یوں محسوس ھوتا ھے کہ مصنف نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ھے، بے کم و کاست بیان کرتا چلا جا رھا ھے۔ لطف یہ ھے ابن الوقت کی داستان میں نہ حسن و عشق کے قلبی واردات کی چاشنی ھے، نہ جنون شوق کی وارفتگیاں ھیں، نہ فراق و وصال کی لطف اندوزیاں اور الم ناکیاں ھیں، نہ رقیب کی سازشیں، ھیں، نہ خاندانی روایتوں کی دل شکن سخت گیریاں ھیں؛ غرضیکہ ایک انسان کا دوسرے انسانوں سے جو جذباتی لگاؤ ھوتا ھے اور

اس لگاؤ سے انسان کے مزاج اور حسی کیفیتوں میں جو ہیجان آتا ہے، ابن الوقت ان سے یکسر خالی ہے مگر فن کار کی قصہ گوئی کہانی کو پھسپھسی اور بےمزہ نہیں ہونے دیتی، پڑھنے والا لطف بیان کی سحر آفرینیوں میں کھو جاتا ہے، داستان آہستہ آہستہ آگے چلتی رہتی ہے، واقعات کی کڑیاں خود بخود ملتی رہتی ہیں، نہ کہانی کے بہاؤ میں فرق آتا اور نہ حادثے کی موجوں کا سلسلہ ٹوٹتا؛ پورا قصہ منطقی رشتوں کی ایک آہنی زنجیر میں کسا ہوا ہے، نہ جھول آتا ہے نہ ڈھیلا پن پیدا ہوتا ہے۔

«ابن الوقت» میں یوں تو ہیرو کے علاوہ متعدد کردار موجود ہیں مگر مرکزی شخصیت ابن الوقت ہی کی ہے؛ دوسرے کردار فقط ابن الوقت کے کردار کی تعمیل و تشکیل میں اُس کے معاون بن کر سامنے آتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ . . . اللہ کا کردار بہت اہم ہے کیوں کہ وہ ابن الوقت کو راہ راست پر لاتا اور اُس کی دنیا و عقبیٰ سنوارتا ہے مگر . . . . اللہ کوئی زندہ کردار نہیں ہے بلکہ ایک مثالی کردار ہے، ایک علامت ہے اسلامی قدروں کی۔ اس کے برعکس ابن الوقت کا کردار زندہ اور متحرک ہے، وہ اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے، اُس میں تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں، وہ بڑھتا اور اُبھرتا ہے۔ مولوی نذیر احمد نے ابن الوقت کے کردار کے ان تغیرات کو واقعات کے ذریعے خوبصورتی سے اجاگر کیا ہے؛ عجیب بات ہے کہ مولوی نذیر احمد کا آئیڈیل تو . . . اللہ ہے جو اسلامی عقاید، اسلامی طرز حیات اور اسلامی اخلاق کا پیکر ہے اور وہ اُس کی بڑی عزت کرتے ہیں مگر محبت دراصل اُنھیں اپنے گمراہ فرزند ہی سے ہے، چھپ چھپ کر سہی مگر پیار وہ ابن الوقت ہی سے کرتے ہیں، وہ اس کی تکلیفوں پر دل ہی دل میں کڑھتے ہیں،

اس سے ہمدردی کرتے ہیں اور اس کی ضدوں پر خفا نہیں ہوتے۔ بلکہ رنجیدہ ہوتے ہیں۔

(انھوں نے اپنے ہیرو کا نام تو یقیناً ایسا رکھا ہے کہ آدمی چونک جائے کہ یہ ذات شریف پورے درجے کے موقع پرست اور دنیا ساز ہوں گے)، چڑھتے سورج کی پوجا ان کا مذہب ہوگا اور ضمیر فروشی ان کا شعار، ان کی زندگی معصیتوں، عیاریوں اور مکاریوں کا مجسمہ ہوگی، ان کا نہ کوئی عقیدہ ہوگا نہ کوئی اصول حیات اور کسی اعلیٰ مقصد کے لیے قربانی کرنا انھوں نے سیکھا ہی نہ ہوگا(مگر حقیقت یہ ہے کہ مولوی نذیر احمد کا ابن الوقت روایتی ابن الوقتوں سے بالکل مختلف ہے؛ وہ اپنے آپ کو قوم کا مصلح اور بہی خواہ سمجھتا ہے اور جو کچھ کرتا ہے اس یقین سے کرتا ہے کہ اس سے مسلمانوں کا بھلا ہوگا، وہ نیک دلیر اور درد مند انسان ہے، ذہین اور لائق ہے، حق گو اور حق پسند ہے، اصول پرست اور فرض شناس ہے، نہ کسی سے ڈرتا ہے نہ دبتا ہے، وہ اپنے عہدے سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھاتا اور نہ کسی کو نقصان پہنچاتا ہے، اس کی خانگی زندگی بھی بالکل بے داغ ہے، وہ اپنے نصب العین کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی نہیں ہچکچاتا اور اس میں بلا کی خود اعتمادی پائی جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ ابن الوقت میں تمام خوبیاں موجود ہیں مگر سو برائیوں کی ایک برائی یہ ہے کہ وہ مغربی طرز زندگی کا حامی اور پیرو ہے اور اپنے مذہبی عقیدوں کی بنیاد روایت اور تقلید کے بجائے عقل اور سائنس پر رکھتا ہے)(ابن الوقت کی اسی خرابی کو دور کرنے کا بیڑا مصنف نے اٹھایا ہے مگر جوں ہی مولوی نذیر احمد افسانہ نگار کا لباس اتار کر ناصح مشفق کا روپ اختیار کرتے ہیں، قصے میں

فنی نقائص اُبھرنے لگتے ہیں) کیوں کہ وہ اپنے ہیرو کے کردار کی تعمیر تو واقعات کی مدد سے کرتے ہیں مگر اُس کی اصلاح کے لیے مباحثوں کا سہارا لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں، یہ فن کا عجز ہے۔ مانا کہ کوئی فن کار اپنی ذات کو اپنے فن سے الگ نہیں کر سکتا اور ہر فنی تخلیق میں اس کے خالق کے عقیدوں اور خواہشوں کی جھلک ضرور ملتی ہے لیکن بڑا فن کار اپنے افسانے میں مناظرے کی بزم نہیں سجاتا بلکہ اپنے کرداروں کے عمل اور رد عمل سے واقعات کو اس انداز سے ترتیب دیتا ہے کہ افسانہ افسانہ ہی رہتا ہے پندنامہ نہیں بن جاتا۔ مولوی نذیر احمد کو اس کی پروا نہیں؛ اگر اُن کے افسانے کی افسانویت مجروح ہوتی ہے، تو ہوا کرے، اگر کتاب پند و موعظت کا دفتر بن جاتی ہے تو بن جاوے، اُن کی بلا سے) انھیں تو ابن الوقت کو صراط مستقیم کی طرف لانا ہے، اُسے سائنس کی کوتاہیوں اور عقل کی نارسائیوں سے آگاہ کرنا ہے اور مغربی طرز زندگی سے ارکان دین کی ادائیگی میں جو خلل پڑتا ہے اور انگریزوں سے دعوئ ہم سری کرنے میں منصب و توقیر کو جو خطرات پیش آتے ہیں، اُن سے متنبہ کرنا ہے؛ ان مقاصد کے سامنے احترام فن کے فرائض کیا حقیقت رکھتے ہیں؟

مولوی نذیر احمد دھلی کے رہنے والے نہ تھے مگر دھلی کی زبان پر اُنھیں بڑا عبور تھا البتہ بول چال کی زبان کے شوق میں بسا اوقات وہ حد سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ (اُن کی تحریروں میں خواہ وہ علمی ہوں، افسانوی ہوں یا مذہبی، محاوروں، مثلوں اور کہاوتوں کی ایسی بھر مار ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ، زبان دانی کی دھن میں وہ نہ حفظ مراتب کا خیال کرتے نہ

موقع محل کی سبقت پر نظر رکھتے؛ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کی تحریک کبھی کبھی متبذل ، رکیک اور بازاری ہو جاتی ہے۔ وہ نامانوس عربی اور انگریزی اصطلاحوں کے استعمال میں بھی اپنے تمام ہم عصروں پر سبقت لے جاتے ہیں لیکن ان خامیوں سے قطع نظر اُن کی زبان بڑی سلیس اور دلکش ہے ، اُن کی تحریر میں بڑا زور ، بڑی روانی اور بے تکلفی ہے ، اُن میں شوخی اور ظرافت بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہے؛ چنانچہ سنجیدہ سے سنجیدہ بحث کے درمیان بھی وہ لطیفوں اور چٹکلوں کی پھلجھڑیاں چھوڑتے ، پڑھنے والوں کو ہنساتے اور اُن کے دلوں کو موہ لیتے ہیں۔ اُن کو اظہار مطلب پر بھی بڑی قدرت ہے ، وہ جو کہنا چاہتے ہیں تشبیہ واستعارہ کا سہارا لیے بغیر کہ دیتے ہیں ، وہ بات کو گھما پھرا کر کہنے کے قائل نہیں ، نہ اُن کے خیالات میں اُلجھاؤ ، پیچیدگی اور ابہام ہے اور نہ اُن کی تحریروں میں ؛ یہی وہ خوبیاں ہیں جن کے باعث مولوی نذیر احمد اردو کے صاحب طرز ادیب مانے جاتے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کی تصنیفات

مولوی نذیر احمد کی تصنیفات حسب ذیل ہیں :۔

۱۔ مراۃ العروس........................۱۸۶۹ء

۲۔ مبادی الحکمت....................۱۸۷۱ء

۳۔ بنات النعش ۱۸۷۳ء

۴۔ سماوات ۱۸۷۶ء

۵۔ توبۃ النصوح......................۱۸۷۷ء

۶۔ محصنات..(فسانۂ مبتلا)..........۱۸۸۵ء

۷۔ ابن الوقت..........................۱۸۸۸ء

۸۔ رویائے صادقہ ....۱۸۹۳ء - ۱۳۱۲ھ

۹۔ ایامیٰ ۱۸۹۱ء

۱۰۔ منتخب الحکایات ۱۸۹۲ء

۱۱۔ چند پند

۱۲۔ موعظہ حسنہ

۱۳۔ ترجمہ قرآن مجید

۱۴۔ الحقوق و الفرائض.................۱۹۰۶ء

۱۵۔ الاجتہاد..............................۱۹۰۸ء

۱۶۔ اُمہات الامہ

۱۷۔ ادعیۃ القرآن

۱۸۔ صرف صغیر

۱۹۔ رسم الخط

۲۰۔ نصاب خسرو

۲۱۔ افسانۂ غدر

۲۲۔ مجموعہ لکچر (تقریروں کا مجموعہ)

۲۳۔ نظم بے نظیر نذیر (نظموں کا مجموعہ)

۲۴۔ ترجمہ قانون تعزیرات ہند ۱۸۶۳ء

ڈپٹی نذیر احمد کے حالات زندگی کے لیے دیکھیے :—

۱۔ حیات نذیر از سید افتخار عالم شاہ

۲۔ داستان تاریخ اردو از مولوی حامد حسن قادری

فہرست

فصل ہفتم

فصل ہشتم

فصل نہم

فصل دہم

فصل یازدہم

فصل دوازدہم

فصل سیزدہم

فصل چہاردہم

فصل بست و سوم

فصل بست وچہارم

فصل بست و پنجم

فصل بست وششم

فصل بست وهفتم

فصل بست و هشتم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فصل اول

ابن الوقت کی تقریب

آج کل* کا سا زمانہ ہوتا تو کانوں کان کسی کو خبر بھی نہ ہوتی ، ابن الوقت کی تشہیر کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ اُس نے ایسے وقت میں انگریزی وضع اختیار کی جب کہ انگریزی پڑھنا کُفر اور انگریزی چیزوں کا استعمال ارتداد سمجھا جاتا تھا ۔ یہ تو ہماری آنکھوں دیکھی باتیں ہیں کہ ریل میں بہ ضرورت کوئی بَھلا مانس چُرٹ پیتا تو جان پہچان والوں سے چُراتا چُھپاتا ۔ ایک دوست کہیں باہر بندوبست میں نوکر تھے اور جانچ پڑتال کے لئے اُن کو کھیت کھیت پھرنا پڑتا تھا ، ہندوستانی جوتی اس رَیڑ میں کیا ٹھہرتی ، ناچار انگریزی بوٹ پہننے لگے تھے مگر دو چار دن کے لئے دھلی آتے تو گھر میں سے کبھی کے پڑے ہوئے پھٹے پُرانے لیترے ڈھونڈ کر پاؤں میں ہلگا لیتے ، تب کہیں گھر سے باہر نکلتے ۔

دھلی کالج اُن دنوں بڑے زوروں پر تھا ۔ ملکی لاٹ آئے اور تمام درس گاھوں کو دیکھتے بھالتے پھرے ۔ قدردانی ہو تو ایسی ہو کہ جس جماعت میں جاتے ، مدرس سے ہاتھ ملاتے ۔ بڑے مولوی صاحب نے طوعاً کرھاً بادل ناخواستہ آدھا مصافحہ کیا تو سہی مگر اُس ہاتھ کو عضو نجس کی طرح الگ تھلگ لئے رہے ۔ لاٹ صاحب کا منہ موڑنا تھا کہ بہت مبالغے کے ساتھ (انگریزی صابون سے نہیں بلکہ مٹی سے) رگڑ

---

* یہ کتاب ۱۸۸۸ء میں تصنیف ہوئی ۔

رگڑ کر اُس ہاتھ کو دھو ڈالا ۔ ابن الوقت جیسے ملامتی نہیں تو اُس کے ہم خیال خال خال اَور بھی چند مسلمان تھے جن کے لڑکے اِکّا دُکّا دھلی کالج میں انگریزی پڑھتے تھے ۔ ان لڑکوں میں سے اگر کوئی عربی فارسی جماعتوں میں آ نکلتا اور آنکھ بچا کر پانی پی لیتا تو مولوی لوگ مٹکے تڑوا ڈالتے ۔

ہر چند تعصبات لغو کی کوئی حد نہ تھی ۔ با ایں ہمہ انگریزی حکومت جیسے اُن دنوں کی مطمئن تھی ، آئندہ تا بقائے سلطنت انگریزوں کو خواب میں بھی نصیب ہونے والی نہیں ۔ لوگوں کو مُفید و مُضر کے تفرقے کا ، بُرے بَھلے کے امتیاز کا سلیقہ نہ تھا ۔ سرکار بہ منزلہ مہربان باپ کے تھی اور بھولی بھالی رعیت بجائے معصوم بچّوں کے ۔ انگریزی کا پڑھنا ہمارے بھائی بندوں کے لئے کچھ ایسا ناسزاوار ہوا جیسا آدم اور اُس کی نسل کے حق میں گیہوں کا کھا لینا ۔ گئے تھے نماز معاف کرانے ، اُلٹے روزے اَور گلے پڑے ۔ انگریزی زبان ، انگریزی وضع کو اوڑھنا بچھونا بنایا تھا اس غرض سے کہ انگریزوں کے ساتھ لگاوٹ ہو ، اختلاط ہو ، مگر دیکھتے ہیں تو لگاوٹ کے عوض رکاوٹ ہے اور اختلاط کی جگہ نفرت ۔ حاکم و محکوم میں کشیدگی ہے کہ بڑھتی چلی جاتی ہے ۔ «دریا میں رہنا مگرمچھ سے بیر» دیکھیں آخرکار یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے ۔

ذرا مشکل سے اس بات کا پتہ لگے گا کہ کون سی چیز ابن الوقت کو انگریزی وضع کے اختیار کرنے کی محرّک ہوئی ۔ وہ ایک ایسے خوش حال اور شریف خاندان کا آدمی تھا جس کے لوگ پاسِ وضع کو شرطِ شرافت سمجھتے تھے ۔ شرفِ علم اُن میں متوارث تھا ۔ اس خاندان کے لوگ بعض طبیب تھے ، بعض مدرس

(سرکاری نہیں) بعض مفتی ، بعض واعظ ، بعض حافظ ، بعض صاحب سجادۂ طریقہ ۔ الغرض « این خانہ تمام آفتاب است » لوگ سب نہیں تو اکثر و «للاکثر حکم الکل» ہر طرح کے ہنروں سے متّصف اور ہر طرح کے کمالات سے متجلّی تھے ۔ شاہی قلعہ ان سب کے معاش کا متکفّل تھا ۔ انگریزوں کے ساتھ ان لوگوں کو اگر تعلق تھا تو اسی قدر کہ انگریزی عملداری میں رہتے تھے ، وہ بھی اپنے زعم میں نہیں ۔

ابن الوقت کے کالج میں داخل ہونے کا بھی یہ سبب ہوا کہ شہر کے مشاہیر جو عربی فارسی میں مستند تھے سرکار نے چُن چُن کر سب کو پابند مدرسہ کر لیا تھا ۔ پس ابن الوقت مدرسے میں داخل کیا گیا نہ اس غرض سے کہ مدرسے کی طالب العلمی کو ذریعۂ معاش قرار دے بلکہ صرف اس لئے کہ اُس کی عربی فارسی ٹکسالی ہو ۔ ابن الوقت اپنے وقت کے منتخب نہیں تو بھی اچھے طلبہ میں شمار کیا جاتا تھا ۔ مناسب طبیعت کی وجہ سے اُس کے بعض ہم جماعت اُس سے خاص خاص چیزوں میں اچھے بھی تھے مگر اُس کے مجموعی نمبر کبھی کسی سے ہیٹے نہیں رہے ۔ وجہ کیا تھی کہ جسقدر وہ ریاضی میں کچّا تھا ، تاریخ ، جغرافیہ ، سیاست مدن ، اخلاق وغیرہ سے جن کا اُس کو شوق تھا ، اُس خامی کی تلافی بخوبی ہوتی رہتی تھی ۔ مدرسے کی ساری پڑھائی میں اُس کی پسند کی چیز تاریخ تھی ، کسی ملک اور کسی وقت کی کیوں نہ ہو ۔ اُس کی طبیعت عام باتوں میں خوب لگتی تھی ۔ جواب مضمون پر ہر سال ایک نقرئی تمغہ ملا کرتا تھا ۔ چھ برس ابن الوقت مدرسے میں رہا ، کسی برس اُس نے وہ تمغہ انگریزی ، عربی ، فارسی ، سنسکرت میں کسی کو لینے ہی نہ دیا ۔ جب

موقع ملتا ابن الوقت پرانی دلّی کے کھنڈروں میں تعطیل کے دنوں کو ضرور صَرف کرتا۔ غیر ملک کے لوگ تجارت، سیاحت یا کسی دوسری ضرورت سے شہر میں آ نکلتے تو ابن الوقت اَدْبَدَا کر اُن سے ملتا اور اُن کے ملک کے حالات و عادات کی تفتیش کرتا۔ اُس کا حافظہ معلومات تاریخی کے ذخیرے سے اس قدر معمور تھا کہ وہ معمولی بات چیت میں واقعات زمانۂ گزشتہ سے اکثر استشہاد کیا کرتا۔ ایک بار اُس نے باتوں ہی باتوں میں سلیٹ پر اپنی یادداشت سے ایشیا کا نقشہ کھینچا اور مشہور شہروں اور پہاڑوں اور دریاؤں کے مواقع اُس میں ثبت کئے۔ پھر جو ملا کر دیکھا تو بہ تفاوت یسیر اکثر صحیح۔ وہ دنیا کی قوموں اور ذاتوں اور رسموں کی ٹوہ میں لگا رہتا۔ مذہب کے بارے میں اُس کی معلومات کتابُ المِلل والنِّحل سے کہیں زیادہ تھی۔ جب کوئی نئی کتاب جماعت میں شروع ہوتی، اُس کا پہلا سوال یہ ہوتا کہ اس کا مصنف کون تھا، کہاں کا رہنے والا تھا، کس زمانے میں تھا، کس سے اُس نے پڑھا، اُس کے معاصر کون کون تھے، اُس کے وقائع عمری میں کون کون سی بات قابل یادگار ہے۔

تعزز اور ترفع ابن الوقت کے مزاج میں اس درجے کا تھا کہ لوگ اُس کی خودداری کو مُنجر بہ کبر خیال کرتے۔ دوسرے کا احسان اُٹھانے کی اُس کو سخت عار تھی یہاں تک کہ اُستاد کے سوائے وہ کسی ہم جماعت سے پوچھنے تک میں مضائقہ کرتا۔ وہ ہمیشہ ایسے مدرس کی جماعت میں رہنا چاہتا جس کی پرنسپل زیادہ عزت کرتا ہو اور اسی سبب سے وہ کئی بار عربی سے فارسی اور فارسی سے عربی میں بدلتا پھرا۔

ابن الوقت اپنی رائے بہ دیر قائم کرتا تھا مگر جب ایک بار

قائم کرلیتا آسے بدلنے کی گویا اُس کو قسم تھی ۔ اُس کی یہ رائے کسی سے مخفی نہ تھی کہ کسی قوم میں سلطنت کا ھونا اس بات کی کافی دلیل ھے کہ اُس قوم کے مراسم ، عادات ، خیالات ، افعال ، اقوال، حرکات، سکنات یعنی کل حالات فرداً فرداً نہیں تو مجتمعاً ضرور بہتر ھیں ۔ وہ نہایت وثوق کے ساتھ کُھلّم کُھلّا کہا کرتا کہ سلطنت ایک ضروری اور لازمی نتیجہ ھے قوم کی برتری کا ۔ انگریزی نوکری کی نہ اُس کو ضرورت تھی اور نہ طلب ۔ پس وہ اپنی اسی رائے کی بنیاد پر بے غرضانہ ھر انگریز کو ، اگرچہ گھٹکا ، بے حیثیت یوریشین ھی کیوں نہ ھو ، بڑی وقعت کی نظر سے دیکھتا ۔

اس خیال کے آدمی کو خصوصاً جب کہ وہ کالج میں داخل بھی تھا ، انگریزی خوان ھونا چاھئے تھا اور اُس کے دل میں انگریزی پڑھنے کا تقاضا بھی ضرور پیدا ھوتا ھوگا مگر باپ کے وفات پا جانے سے نواب معشوق محل بیگم کی سرکار کی موروثی مختاری اُس کے سر پڑی ۔ ھرچند اس کے بڑے بھائی ایک اور بھی تھے اور چاھتے تو مختاری کو وہ سنبھال لیتے مگر اُن کو اپنے اوراد و وظائف سے مطلق فرصت نہ تھی اور وہ آدمی تھے بھی وحشت زدہ سے ، ناچار ابن الوقت کو اس سرکار کا بڑا بھاری کارخانہ سنبھالنا پڑا ۔ چند روز تک ابن الوقت نے یوں بھی کر کے دیکھا کہ خارج از اوقات مدرسہ قلعے کا کام دیکھتا بھالتا ۔ بیگم کی طرف سے تو خدا نخواستہ کسی طرح کی سختی نہ تھی مگر خود ابن الوقت دیکھتا تھا کہ اُس کا وقت دونوں کاموں کے لئے مساعدت نہیں کرتا ۔ پس اُس نے مجبور ھو کر مدرسے سے اپنا نام کٹوا لیا ۔ پھر بھی وہ تاریخ وغیرہ اپنے ڈھب کی کتابوں کے لئے شاھی کتب خانے اور اخباروں کے واسطے

مطبع سلطانی کے بلا ناغہ حاضر باشوں میں تھا۔ تاریخ اور اخبار کی اُس کو ایسی دُھت تھی کہ وہ کبھی ان چیزوں سے ملول ہوتا ہی نہ تھا۔

ابن الوقت نے مدرسہ چھوڑا تو گو وہ عربی فارسی جماعتوں کا طالب علم تھا تاہم اُس کو مشق کے لئے ریاضی کی انگریزی کتابوں سے مدد لینے کی ہمیشہ ضرورت واقع ہوا کرتی تھی۔ ناچار اُس کو انگریزی کے حروف پہچاننے پڑے۔ طبیعت تھی آخّاذ، حرفوں کا پہچاننا تھا کہ چند روز میں اٹکل سے سوالات کا طریقۂ حل سمجھنے لگا اور یوں ریاضی کے رکن میں اُس کی انگریزی کی استعداد ترقی کرتی گئی۔ جب وہ انگریزی وضع اختیار کر کے اپنے پندار میں پورا صاحب لوگ بن گیا، اُس زمانے میں بھی وہ انگریزی سمجھ توخاصی طرح لیتا تھا مگر زبان انگریزی میں بے تکلف بات چیت کرنے کی اُس کو ساری عمر قدرت حاصل نہ ہوئی۔ ہم نے اُس کو زمانۂ طالب العلمی میں یا اُس کے بعد سبقاً سبقاً انگریزی پڑھتے تو نہیں دیکھا اور اُس کی خودداری مدرسے کے بعد اُس کو سینگ کٹوا کر بچھڑوں میں کیوں ملنے دینے لگی تھی مگر اتنا تحقیق معلوم ہے کہ وہ اپنی حالت کے مناسب انگریزی جاننے کے لئے بہتیری ہی کوشش کرتا تھا۔ سنے سنائے سے جو اُس نے اس قدر ترقی کی، سچ پوچھو تو یہ بھی اُسی کا کام تھا ورنہ اپنا تو یہ مقولہ ہے کہ آدمی مادری زبان کے علاوہ دوسری زبان کا زبان داں، جیسا کہ زبان دانی کا حق ہے، ہو ہی نہیں سکتا۔ کیا صاحب قاموس کی حکایت نہیں سنی؟ بھلا خیر، اتنا تو سنا ہوگا کہ زبان عربی کی لغت کی بہت سی کتابیں ہیں، سب میں زیادہ مبسوط اور مستند قاموس ہے۔ صاحب قاموس ذات کا تھا

عجمی ، اُس کو بچپن سے زبان عربی کی تکمیل کا شوق ہوا۔ جہاں تک عجم میں ممکن تھا سیکھ پڑھ لیا ، نجد اور تہامہ اور یمن اور شام اور حضارہ اور بداوہ میں برسوں زبان کے پیچھے خاک چھانتا پھرا۔ آخرکار ساری عمر کی تفتیش اور تلاش کے بعد قاموس بنائی تو پھر کیسی بنائی کہ ساری دنیا اُس کی سند پکڑتی ہے۔ زبان دانی کا پردہ خدا کو فاش کرنا تھا۔ عرب کی ایک بی بی سے نکاح کیا۔ رات کے وقت گھر کی لونڈی سے کہتے تھے کہ چراغ گل کر دے۔ طوطے کی ٹیں ٹیں کہاں جائے۔ «اَطْفَئِی السراج» کی جگہ فارسی محاورے کے مطابق بے ساختہ «اُقتلی السراج» بول اُٹھے۔ بی بی تاڑ گئی۔ صبح اُٹھ کر دارالقضا میں جا نالش کی۔ خدا جانے بی بی رہی یا گئی مگر میاں کی عربیت کی تو خوب کِرکِری ہوئی۔

انگریزی اخباروں میں جن کے اڈیٹر انگریز ہیں بابوانہ انگریزی کی ہمیشہ خاک اُڑائی جاتی ہے۔ اگرچہ نام تو بنگالیوں کا ہوتا ہے مگر حقیقت میں وہ مّلاحی گالیاں سبھی انگریزی دانوں پر پڑتی ہیں بلکہ دوسروں پر بدرجۂ اُولیٰ کیوں کہ بنگالیوں نے تو یہاں تک انگریزی میں ترقی کی ہے کہ انگریزی گویا اُن کی مادری زبان ہوتی جاتی ہے اور بعض بنگالی تو انگریزی میں اس درجے کے گویا اور فصیح اور بلیغ ہو گزرے ہیں اور ہیں کہ انگریز بھی اُن کا لوہا مانتے ہیں مگر ایسی مثالیں شاذ ہیں۔ ایک دوست ناقل تھے کہ ایک بار اُن کو ایک انگریز سے ملنے کی ضرورت تھی۔ کوٹھی پر معلوم ہوا کہ یہ وقت اُن کے کلب میں رہنے کا ہے۔ ناچار اُن کو کلب جانا پڑا۔ چپڑاسی اطلاع کا موقع دیکھ رہا تھا کہ اُنھوں نے اپنے کانوں

سنا کہ اندر بہت سے انگریز جمع ہیں اور ہندوستانیوں کی
انگریزی کی نقلیں کر کر کے قہقہے لگا رہے ہیں۔ وہ دوست یہ بھی
کہنے لگے کہ جس انگریزی کی ہنسی ہو رہی تھی بے شک وہ
ہنسی کے قابل بھی تھی اور اہل زبان کو ہمیشہ دوسرے
ملک والوں پر ہنسنے کا حق ہے مگر ہندوستانیوں کی انگریزی
اگر ہنسنے کے قابل ہے تو اُس کے مقابل میں انگریزوں کی اُردو
رونے کے لائق ہے۔ ہندوستانی صرف کتاب کی مدد سے انگریزی
سیکھتے ہیں، برخلاف انگریزوں کے کہ کتاب کے علاوہ ساری
ساری عمر ہندوستانی سوسائٹی میں رہتے ہیں اور پھر وہی
« ول ٹُم کیا مانگٹا »۔

یہ مصیبت کس کے آگے روئیں کہ انگریزی عملداری نے
ہماری دولت، ثروت، رسم و رواج، لباس، وضع، طور طریقہ،
تجارت، مذہب، علم، ہنر، عزت، شرافت سب چیزوں پر تو
پانی پھیرا ہی تھا، ایک زبان تھی اب اُس کا بھی یہ حال
ہے کہ اُدھر انگریزوں نے عجز و ناواقفیت کی وجہ سے/ کھڑی،
اکھڑی، غلط، نامربوط اُردو بولنی شروع کی اِدھر 'ہر عیب کہ
سلطاں بہ پسندد ہنر است' ہمارے ہی بھائی بند لگے اُس کی تقلید
کرنے۔ ایک صاحب کا ذکر ہے کہ اچھی خاصی ریش و برودت،
آغاز جوانی میں ولایت گئے۔ چار پانچ برس ولایت رہ کر
آئے تو ایسی سٹّی بھولے کہ انگریزی اُردو میں بہ ضرورت کبھی
بات کرتے تو رُک رُک کر اور ٹھہر ٹھہر کر اور آنکھیں
میچ میچ کر جیسے کوئی سوچ سوچ کر مغز سے بات اُتارتا ہے۔

فصل دوم

ابن الوقت نے ۱۸۵۷ء کے غدر میں مسٹر نوبل ایک انگریز کو پناہ دی اور اس کے ساتھ ارتباط کا ہونا اس امر کے طرف مُنجر ہوا کہ ابن الوقت نے آخر کار انگریزی وضع اختیار کرلی

ابن الوقت کے وقائع عمری میں ایک واقعہ ایسا ہے جس کو اس کی تبدیل وضع میں بہت کچھ دخل ہوسکتا ہے اور وہ ذرا قصہ طلب سی بات ہے ۔ (بہادر شاہ کے آخری عہد میں منصب ولی عہدی متنازع فیہ تھا) مرزا فخرالملک اورمرزا جواں بخت میں ۔ مرزا فخر الملک کے اکبر اولاد اور لائق اور رودار ہونے کی وجہ سے اُن کے طرف دار بہت تھے حتیٰ کہ انگریز اور اُسی گروہ میں نواب معشوق محل بیگم صاحب بھی تھی جو مرزا فخر الملک کی خالہ بھی ہوتی تھیں ۔ مرزا جواں بخت اپنی والدہ نواب زینت محل بیگم کے کھونٹے پر کودتے تھے جن کو بادشاہ کے مزاج میں بڑا دَرخُور تھا ۔ بادشاہ کا زور چلتا تو جواں بخت کو اپنے حین حیات تخت نشین کر دیتے مگر انگریزوں کی پَچّر بڑی زبردست تھی ۔ مرزا جواں بخت کے ساتھ سارے برتاؤ ولی عہدی کے برتے جاتے تھے ۔ صرف دو باتوں کی کسر تھی ۔ ایک تو ولی عہدی کی تنخواہ خزانہ شاہی کی تحویل میں رہتی تھی ، دوسرے انگریزوں نے ولی عہدی کا ادب قاعدہ اُن کے ساتھ نہیں رکھا ۔

اس کشمکش میں طرف داران مرزا فخر الملک کو بڑے بڑے نقصان پہنچے ۔ نواب معشوق محل نے جو بادشاہ کی نظر کسی قدر پھری ہوئی دیکھی ، قلعے کے باہر شہر میں کشمیری دروازے کے قریب راحت گاہ جو اُن کا بڑا نامی محل تھا ، درست کرا کے تبدیل آب و ہوا کے حیلے سے شہر میں رہنے لگیں ۔ قلعے کی آمد و رفت بھی بند نہیں کی مگر مال و متاع اور ساز و سامان سب کچھ راحت گاہ میں اٹھوا منگوایا تھا ۔ ہر چند دو ایک برس بعد وہ جواں بختی شورش فرو بھی ہو گئی تھی مگر راحت گاہ میں نواب معشوق محل کا کچھ ایسا جی لگ گیا تھا کہ اُنھوں نے اپنا وہی قاعدہ رکھا ۔ صبح کا ناشتہ کر کے قلعے چلی جاتیں اور عصر کی نماز راحت گاہ میں پڑھتیں اور یہیں شب کے وقت آرام بھی فرماتیں ، یہاں تک کہ دھلی کے حصے کی قیامت آئی یعنی ۵۷ء کا غدر ۔ غدر کے بعد سے نواب معشوق محل بیگم صاحب نے قلعے کے باہر پاؤں نہیں رکھا ۔ غدر سے کوئی ڈھائی پونے تین مہینے بعد وہ چار گھڑی رات گئے جو پہلا گولا دیوان عام میں گر کر پھٹا جس کے دھماکے سے سارا قلعہ ہل گیا ، بس گولے کا پھٹنا تھا کہ نواب معشوق محل بیگم صاحب کے دل میں کچھ ایسا ہول سمایا کہ اختلاج قلب کے صدمے سے تیسرے دن انتقال فرمایا ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ بڑی نیک نیت اور خدا پرست اور سیر چشم بی بی تھیں ۔ خدا نے اُن کو اُن رسوائیوں اور فضیحتوں سے جو خاندان تیمور کی تقدیر میں لکھی تھیں بچا لیا ۔

ہاں تو غدر کے اگلے ہی دن نواب معشوق محل نے بن الوقت کو حکم دیا کہ راحت گاہ کا تمام اسباب رتّی رتّی قلعے

میں آٹھوا لاؤ اور راحت گاہ کے مکانوں میں تالے چڑھوا دو ۔ اسباب سا اسباب تھا ۔ بیس چھکڑے دن میں چار چار پھیرے کرتے تھے تب وہ آلغاروں اسباب کہیں مہینے سوا مہینے میں جا کر ٹھکانے لگا ۔

غدر کے چوتھے دن کا ذکر ہے کہ ابن الوقت کوئی دو گھڑی دن رہے آخری کھیپ روانہ کرنے کے بعد قلعے کے طرف کو چلا آ رہا تھا ۔ ایک آپ تھا اور دو نوکر ، تینوں مسلّح اور اُن دنوں جب دو آدمی آپس میں بات کرتے تھے تو بس غدر کا مذکور ہوتا تھا ، یہ لوگ بھی اسی طرح کا تذکرہ کرتے چلے جاتے تھے ۔ جوں محسن خاں کے کٹڑے سے آگے بڑھ کر اس کُھلے میدان میں پہنچے جو میگزین اور کالج کے درمیان میں واقع تھا ، دیکھتے کیا ہیں سڑک کے بائیں طرف انگریزوں کی کچھ لاشیں پڑی ہیں ۔ یہ دیکھ کر ابن الوقت کا کلیجہ دھک سے ہو گیا ۔ اس وقت وہ موقع ایسا خوفناک تھا کہ اکیلا کیسا ہی کوئی سورما کیوں نہ ہوتا ، ڈر کے مارے گھگّی بندھ جاتی مگر یہ تین آدمی تھے ۔ ابن الوقت لاشوں کے مقابل ذرا ٹھٹکا اور نہایت غصے اور افسوس کے ساتھ اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا ۔ ”دیکھو تو ظالموں نے کیا بے جا حرکت کی ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ شہر پر بڑا سخت عذاب آنے والا ہے ۔ خونِ ناحق کبھی خالی جاتے نہیں سنا ۔ خدا جانے شاہ جہاں نے کیسی منحوس تاریخ میں اس کم بخت شہر کی بنیاد ڈالی تھی کہ امن کی کوئی پوری صدی اس بستی پر نہ گزری مگر اس بار تو کچھ ایسا سامان نظر آتا ہے کہ لوگ نادر شاہ کے واقعے کو بھی بھول جائیں گے “۔

ابن الوقت کے ساتھی بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے ۔ ابھی نماز مغرب میں کوئی آدھ گھنٹے کی دیر تھی (اُدھر آفتاب

کا جنازہ کفن خون آلود شفق پہنا کر تیار کر چکے تھے کہ
قبر مغرب میں اتار دیں ادھر بے کفن کی لاشیں دیواروں کے
سائے کا ماتمی کفن پہن چکی تھیں) دھلی جیسا شہر اور شام کا
وقت اور روزوں کے دن اور ایسا موقع ۔ اور دن ہوتے تو اس
مقام پر کھوے سے کھوا چھلتا ہوتا مگر ابن الوقت چوراھے پر
کھڑا ہوا دیکھ رہا تھا کہ جہاں تک نظر کام کرتی ھے آدم زاد
کا پتہ نہیں ۔ شہر کے بدمعاشوں کے ڈر سے لوگ کچھ دن رھے
سے کواڑوں میں پتھّر آڑا آڑا کر گھروں میں بند ہو بیٹھے
تھے ۔ ابن الوقت ھکّا بکّا سنّاٹے میں کھڑا تھا کہ ایک ساتھی
بولا ''حضرت! افطار کا وقت قریب ھے اور قلعہ دور، جو ہونا
تھا سو ہوا اور جو تقدیر کا لکھا ھے سو ہو کر رھے گا، بس معلوم
ہوا کہ نابکار تلنگوں کے گیہوں کے ساتھ بہتیروں کا گُھن
پسنا ھے، چلئے تشریف لے چلئے'' ۔

پن چکّیوں سے ذرا اِدھر تھے کہ پیچھے سے پیروں کی آھٹ
آئی کہ کوئی شخص لپکا ہوا چلا آ رہا ھے ۔ لاشوں کے
دیکھنے سے یہ لوگ کچھ ایسے ہول زدہ سے ہو گئے تھے کہ
آواز کے ساتھ سب کے دل دھڑکنے شروع ہوئے اور بے اختیار لگے
پیچھے مُڑ مُڑ کر دیکھنے ۔ بارے شکر ھے کہ وہ شخص نہتّا تھا ، وہ
تو جھپٹا ہوا چلا آ ہی رہا تھا ۔ ان کے قدم جو پڑے ڈھیلے ،
پن چکّیوں سے اترتے اترتے اس نے آ ہی لیا ۔ اس شخص نے دور سے
ان شخصوں کی پیٹھیں ہی دیکھ کر پہچان لیا تھا کہ ان میں آقا
کون ھے ۔ برابر آ کر اس نے ابن الوقت کو مودّب اور با سلیقہ
نوکروں کی طرح سلام کیا ۔ ابن الوقت نے آنکھ بھر کر دیکھا
تو کوئی اٹھائیس تیس برس کی عمر کا جوان آدمی ھے اور
انگریزی خدمت گاروں یا اردلیوں کی سی وضع رکھتا ھے ۔ دوپٹہ

سر سے بندھا ہے اور پٹکا کمر سے، گویا نوکری پر سے چلا آ رہا ہے - خوف اور رنج اور اضطراب ہے کہ چہرے سے ٹپکا پڑتا ہے ، ہونٹوں پر پپڑیاں بندھ گئی ہیں ، سانس پیٹ میں نہیں سماتا - ابن الوقت سے بات کرنی چاہتا ہے مگر بار بار پھر پھر کر لاشوں کی طرف کو تاکتا جاتا ہے- ہر چند چھوٹا میگزین بیچ میں حائل ہے مگر پھر بھی جی نہیں مانتا اور بے دیکھے رہا نہیں جاتا -

وہ ابن الوقت کے پوچھنے کا بھی منتظر نہ رہا اور چھوٹتے ہی بولا کہ میرا نام جاں نثار ہے اور میں بہادر پور کے پٹھانوں میں سے ہوں - چار برس سے رہتک کے جنٹ مجسٹریٹ نوبل صاحب کی اردلی میں ہوں - ہمارے صاحب کئی مہینے سے بیمار ہیں- رخصت لے کر ولایت جا رہے تھے اور بمبئی تک مجھے ساتھ لئے جاتے تھے - آج چوتھا دن ہے ، ہم لوگ ڈاک بنگلے میں آ کر ٹھہرے - دوپہر کو غدر ہو گیا - صاحب کا مزاج نادرست تھا ، بھاگ کر کہیں جا نہ سکے- تلنگوں نے اُن کو لے جا کر کشمیری دروازے کے گارد میں قید کیا ، وہاں اور بھی چند انگریز پکڑے ہوئے تھے - آج سب قیدیوں کو کھڑا کر کے ناحق ناروا باڑ مار دی - ہمارے صاحب بھی زخمی ہو کر گرے مگر اس وقت تک اُن میں جان ہے- میں ڈر کے مارے اُن کو اچھی طرح دیکھ تو نہیں سکا مگر آنکھ بچا کر مسجد سے پانی کی بدھنی اُن کے پاس رکھ آیا ہوں - یہ خدا واسطے کا کام ہے - اگر آپ سے ہو سکے تو ہمارے صاحب کی جان بچائیے - آپ کو بڑا درجہ ہوگا - صاحب ہیں تو انگریز مگر شریف اور شریف پرور ، نیک مزاج ، پرلے درجے کے رحم دل - رہتک والوں سے آپ پوچھئے ، بیسوں یتیموں اور بیواؤں کی تنخواہیں مقرّر کر رکھی

ہیں۔ فوجداری کے مقدموں میں مجبور ہو کر جرمانہ کرتے ہیں تو اپنے پاس سے سرکار میں بھر دیتے ہیں۔ یہ کہہ کر جاں نثار ابن الوقت کے پیروں پر گر پڑا اور کہنے لگا کہ آپ لاشوں کے پاس کھڑے ہوئے جو باتیں کر رہے تھے، میں دروازے کی آڑ میں چھپا ہوا سن رہا تھا۔ اس سے مجھ کو آپ سے کہنے کی ہمت بھی پڑی اور میرا دل اندر سے گواہی دیتا ہے کہ خدا نے آپ کو ایسے وقت صرف ہمارے صاحب کی جان بچانے کو بھیجا ہے۔

ابن الوقت نے جاں نثار کو زمین پر سے اٹھایا اور کہا کہ جو کچھ یہ بد ذات، پاجی، نمک حرام، باغی تلنگے کر رہے ہیں کچھ شک نہیں کہ ظلم صریح ہے اور کسی مذہب و ملّت میں روا نہیں اور اگر میں تمھارے صاحب کی حفاظت کر سکوں تو میں اس کو فرض انسانیت سمجھتا ہوں مگر اُن لوگوں کو کس وقت باڑ ماری؟

جاں نثار۔ دو بجے۔

ابن الوقت۔ اوہو دو بجے (ایک نوکر کی طرف مخاطب ہو کر) وہ جو اُس وقت فَیر سُن پڑی تھی وہ یہی باڑ ہوگی۔ (جاں نثار سے) اچھا پھر تم نے کیوں کر جانا کہ تمھارے صاحب ہنوز زندہ ہیں؟

جاں نثار۔ حضور کے تشریف لانے سے تھوڑی دیر پہلے تک لاشوں پر دھوپ تھی تو اَور لاشیں تو بالکل سفید پڑ گئی تھی مگر ہمارے صاحب کے چہرے پر سرخی جھلکتی تھی اور میں نے اپنی آنکھ سے صاحب کے جسم میں حرکت بھی دیکھی ہے۔ پانی رکھنے گیا تھا تو سانس چلتا ہوا سا دکھائی دیا۔ خدا جانے کہاں چوٹ لگی ہے کہ بے ہوش ہیں۔ جس وقت سے صاحب

ڈاک بنگلے میں پکڑے گئے اس وقت سے میں دائیں بائیں برابر صاحب کے پاس لگا رہا ہوں ، ایک دم کو جدا نہیں ہوا ۔ زخموں کی نسبت تو میں کچھ عرض نہیں کر سکتا مگر اس وقت تک اُن میں جان تو ضرور ہے ۔ آپ للہ ذرا چل کر دیکھ لیجئیے ، اگر کچھ جان باقی ہے تو انکو اپنی حفاظت میں لیجئیے ، شاید خدا کرے بچ جائیں اور اگر ہو چکے ہیں تو وہ کیا مرے ہم جیسے پچاسوں غریب اُن کے ساتھ مر لئے ۔ ہُوں تو چار کوڑی کا پیادہ اور آپ کے روبرو عرض کرنا بھی گستاخی ہے مگر جناب یہ عمل داری تو اٹھنے والی نہیں ، یہ بھی کوئی دن کا غُل غَپاڑا ہے ۔ اگر صاحب آپ کے طفیل سے بچ گئے تو پھر دیکھئیے گا کیسے کیسے سلوک آپ کے ساتھ کرتے ہیں ۔

ابن الوقت نے جس وقت سے سنا تھا کہ ایک صاحب مجروح ہوئے پڑے ہیں اور زندہ ہیں ، اُسی وقت سے وہ اپنے ذہن میں صاحب کی حفاظت کی تدبیریں سوچنے لگا تھا ۔ جاں نثار کی طرف ظاہر میں متوجہ رہا مگر اُس کی بہت سی باتیں اُس نے مطلق دھیان سے نہیں سنیں ۔ آخر ابن الوقت نے اپنے دونوں نوکروں سے کہا ”کیوں بھئی تمہاری کیا صلاح ہے ؟“ ایک نے کہا ”ہم خانہ زاد جان و مال سے حاضر ہیں ۔ جیسا حکم ہو تعمیل کریں“ ۔ ابن الوقت نے کہا ”بس تم سے اتنی مدد درکار ہے کہ اول تو ہم سب روزے سے ہیں ، رازداری کا حلف کریں دوسرے صاحب اگر زندہ ہوں تو جس طرح بَن پڑے ، اٹھا کر گھر تک لے چلیں“ ۔ ابن الوقت کے دونوں نوکروں نے قبلے کی طرف کو ہاتھ اٹھا کر قسم کھائی اور چاروں شخص لَوٹ کر پھر لاشوں کے پاس گئے ۔ جاں نثار نے سب کو نوبل صاحب کے سرہانے جا کر کھڑا کر دیا ۔ جُھٹپُٹا ہو چلا تھا ۔ جاں نثار نے

ھاتھ لگا کر دیکھا تو بدن گرم تھا ۔ خون میں لتھڑے ہونے کی وجہ سے اُس وقت معلوم نہ ہو سکا کہ کہاں کہاں زخم لگے ہیں اور کس قسم کے ہیں ۔ ہر چند کوئی آدمی کہیں چلتا پھرتا دکھائی نہیں دیتا تھا مگر خوف کے مارے ذرا کہیں پتّا کھڑکتا تو یہ لوگ سہم جاتے ۔ (بارے جان نثار نے ابن الوقت اور اُس کے نوکروں کی مدد سے صاحب کو چڈھی چڑھایا ۔ صاحب اُس قدر نے ہوش تھے کہ اُن کو سنبھلنا دشوار تھا ۔ سارے رستے ابن الوقت اور اُس کے نوکر سہارا لگائے آئے ۔ ان لوگوں کو اِس سے بڑی تسلّی اور تقویت تھی کہ جدھر نظر اُٹھا کر دیکھتے تھے کسی طرف کوئی آتا جاتا دکھائی نہیں دیتا تھا ۔

ابن الوقت مجروح کو اُٹھانے کو تو اُٹھوا لایا مگر اس وقت تک اُس نے ذرا بھی نہیں سوچا تھا کہ گھر پہنچ کر کیا کرنا ہوگا ۔ حقیقت میں اُس کو اس بات کے سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملی ۔ جان نثار کی دردناک حکایت سنتے ہی وہ مجروح کو اُٹھانے دوڑا گیا اور مجروح کے اُٹھائے پیچھے سارے رستے اُس کی روک تھام میں لگا رہا ۔ گھر کے نُکّڑ پر پہنچ گیا تھا کہ اُس کو تنبُّہ ہوا کہ میں نے یہ کیا کیا اور اس کے نباہ کی کیا صورت ہوگی ۔ ابن الوقت کی بیوہ پھوپھی شروع بیوگی سے بال بچوں سمیت اُسی کے گھر میں رہتی تھیں اور شوھری ترکے کی وجہ سے اُن کو بڑی مقدرت تھی ۔ اب اُن کے بچے سیانے ہوئے تو اُنھوں نے اپنا مکان علٰحدہ بنوانا چاہا ۔ پدری ترکے سے اُن کو ابن الوقت کے مکان کے پہلو میں زمین ملی تھی اور وہ زمین مدّتوں سے یوں ہی پڑی تھی ۔ اب کوئی چار مہینے سے کُھلے موسم کے آتے ہی اس میں مدد لگی تو اس وقت تک مکان ہر طرح سے بن بنا کر

تیار ہو چکا تھا۔ صرف آستر کاری باقی تھی کہ غدر ہوا۔ مدد بند کر دی گئی، سامان تعمیر کی حفاظت کے لئے اور اس غرض سے بھی کہ مکان میں رات کو چراغ جلنا ضرور ہے ابن الوقت کے انھیں دو نوکروں میں سے جو نوبل صاحب کے لانے میں شریک تھے، باری باری سے ایک شخص رات کو آ پڑتا۔ ابن الوقت نے نوبل صاحب کو اسی خالی مکان میں اتروایا اور اپنے آدمیوں میں سے جس کی باری مکان میں سونے کی تھی، جاں نثار کے ساتھ متعیّن کر دیا کہ اندر سے کواڑ بند رکھو اور میرے آنے تک صاحب کے زخموں کی شُست و شُو کرو مگر خبردار جو کسی نے آہٹ پائی۔

ابن الوقت نے گھبراہٹ اور جلدی میں اتنا خیال البتہ کر لیا تھا کہ باغیوں اور شہر کے بدمعاشوں نے تو اس قدر سر اٹھا رکھا ہے کہ ناحق انگریزوں کے لگاؤ کا چُھدّا رکھ رکھ کر لوگوں کی جان اور آبرو کے خواہاں ہیں، بے کسی زبردست کے آسرے کے اتنی بڑی جوکھم کا اپنے سر لینا ٹھیک نہیں۔ کل کلاں کو (’دیوار ہم گوش دارم‘ خدا بری گھڑی نہ لائے، بات کھل پڑی تو میں (اکیلا چنا بھاڑ کا کیا کر لوں گا) پاس تھی شاہ حقانی صاحب کی خانقاہ اور ایک اعتبار سے سارا شہر اُن کا معتقد تھا اور ہزارہا ولایتیوں کو اس خانقاہ سے بیعت تھی اور چالیس پچاس بلکہ بعض اوقات سَو سَو ولایتی فیضان تلقین حاصل کرنے کے لئے خانقاہ میں ٹھہرے رہتے تھے۔ ابن الوقت کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اگر شاہ حقانی صاحب اس ارادے میں میرے سر پر ہاتھ رکھیں تو بس پھر کسی طرح کا خدشہ نہیں۔ ابن الوقت کو اس بات کا بھی پورا بھروسا تھا کہ اگر شاہ صاحب راضی نہ بھی ہوئے تاہم اُن کی شان اس سے ارفع ہے کہ کسی پر اس راز کو ظاہر کریں۔

پس ابن الوقت نے مکان کے اندر پاؤں بھی نہ رکھا اور سیدھا خانقاہ کو ہو لیا ۔ وہاں پہنچ کر کیا دیکھتا ہے کہ ساری خانقاہ میں کھچا کھچ آدمی بھرے پڑے ہیں کہ تل دھرنے کی جگہ نہیں ۔ معلوم ہوا کہ سرغنۂ باغیان علمائے خانقاہ سے جہاد کے فتوے پر مہریں کرانے لایا ہے ۔ ظہر کے وقت سے حجّت ہو رہی ہے (شاہ حقانی صاحب ہیں کہ کسی طرح نہیں مانتے اور انگریزوں سے لڑنے کو غدر اور "فُسادُ فی الارض" کہے چلے جاتے ہیں) اس وقت ایسے ہجوم میں شاہ صاحب تک پہنچنا اور تخلیہ کرانا کسی طرح ممکن نہ تھا ۔ ناچار ابن الوقت کسی قدر نا امید ہو کر لوٹا مگر دل میں علمائے خانقاہ کے فتوے کی تصویب کرتا تھا اور اس خیال سے خوش تھا کہ ایک سرغنہ نہیں اگر ساری دنیا ایک طرف ہو تو خانقاہ والے مذہبی معاملے میں ڈرنے دھمکنے والے نہیں اور باغی خانقاہ والوں کا کر بھی کیا سکتے ہیں ۔ اگر خانقاہ میں سے کسی کا بال بھی بینکا ہوا تو کشتوں سے پُشتے لگ جائیں گے ۔

بارے ابن الوقت پھر گھر کو لوٹ آیا ۔ جوں دروازے میں قدم رکھتا تھا کہ جاں نثار نے یہ خوش خبری سنائی کہ دھونے صاف کرنے سے معلوم ہوا کہ کہیں کاری زخم نہیں لگا اور صاحب نے آنکھ بھی کھولی ہے مگر ضعف کے سبب بول نہیں سکتے ۔ مرہم پٹی تو کیا ہو سکتی تھی ، خدا کی قدرت ، صرف ٹھنڈا پانی ٹپکانے سے کوئی سوا ڈیڑھ مہینے میں سب زخم بھر آئے اور باوجودیکہ صبح و شام کی مشی بند ہو گئی تھی اور گو ابن الوقت جان نثار کی مدد سے ہر طرح کا اہتمام کرتا تھا مگر غذا میں بھی بہت بڑا فرق واقع ہو گیا تھا ؛ بااین ہمہ صاحب کا اصل مرض بھی جس

کے علاج کے لئے ولایت جانے والے تھے ، قدرے قلیل ھی باقی رہ گیا تھا ۔ ان کو غالباً کثرت کتاب بینی کی وجہ سے ھلکاھلکا درد سر ھروقت رھتا تھا ؛ اب کتاب بینی ھوئی یک قلم موقوف اور دماغ کو زحمت مطالعہ سے ملی راحت اور سو دوا کی ایک دوا تو یہ تھی کہ طبیعت ھوئی دوسری طرف مشغول ، وہ درد سر بھی تھوڑی دیر کے لئے کبھی کبھار ھوتا تھا اور صاحب خود اس کو اختلاف غذا کی طرف منسوب کرتے تھے ۔

تین مہینے نو دن نوبل صاحب ابن الوقت کے گھر رھے۔ اس عرصے میں دونوں میں اس درجے کا ارتباط بڑھا کہ آج تک کسی ھندوستانی کو کسی انگریز کے ساتھ ایسا اتفاق نہیں ھوا ۔ ابن الوقت ناہجانست اور صاحب کی علومنزلت کے خیال سے ابتداءً کسی قدر رکا رھا مگر صاحب کی کتاب اور اخبار اور کچہری اور ھواخوری اور ملاقات سب کچھ جا کر ایک ابن الوقت کی صحبت رہ گئی تھی ، وہ کسی طرح ایک لمحے کو ابن الوقت کا اپنے پاس سے ھٹنا پسند نہیں کرتے تھے ۔(انسان کے اصلی خیالات کے لئے نعمت اور مصیبت کی حالتیں دو کسوٹیاں ھیں) نوبل صاحب کا یہ تو حال تھا کہ زخمی ، معذور ، محتاج ، بے کس ، غریب الوطن اور زندگی ھے کہ ھر وقت عرضۂ خطر بلکہ نجات موھوم ھے ، ھلاکت متیقّن ۔ مگر اللہ اللہ کس بلا کا استقلال مزاج تھا کہ ضعف و اضطراب کی کوئی حرکت تمام مدت قیام میں ان سے سرزد نہ ھوئی ، وہ گویا دعوے دار مہمان تھے اور ھیکڑ مُستامَن ۔ جاں نثار بیچارہ تو بھلا کس گنتی میں تھا ، ابن الوقت کو اتنی خصوصیتیں اور اس قدر حقوق ھوتے ماتے ان کے پاس بے محابا چلے جانے میں تامل ھوتا تھا ۔

ابن الوقت کو تاریخ اور جغرافیہ اور اخبار کی معلومات نے

پہلے سے انگریز پسند بنا رکھا تھا ۔ پس نوبل صاحب اور ابن الوقت دونوں کی باتوں کا سلسلہ سلسلۂ ناستنا ھی تھا ۔ دونوں کو کبھی آدھی رات باتوں میں گزر جاتی اور ایک بھی اٹھنے کا نام نہ لیتا مگر ان کی گفتگو غالباً تین طرح کی ہوتی تھی ۔ اکثر تو غدر کا تذکرہ کہ واقعات ہر روزہ سے جہاں تک ابن الوقت کو قلعے کے ذریعے سے دریافت ہوتے تھے، شروع ہو کر آخر کو اُمور عامہ میں بات جا پڑتی مثلاً یہ کہ یہ غدر ہوا تو کیوں ہوا ؟ کہاں تک اس آفت کے پھیلنے کا احتمال ہے ؟ آیا یہ ایسا موقع ہے کہ ہندوستان کی مختلف قومیں ہندو، مسلمان، سکھ، مرہٹے، بنگالی، مدراسی، راجپوت، جاٹ، گوجر، اس میں مل کر کوشش کریں گے ؟ ہندوستان کے باشندوں میں فوجی قوت کس درجے کی ہے ؟ رجواڑوں میں کس کس کے بگڑ بیٹھنے کا خوف ہے ؟ شاہ وظیفہ خوار کی دھلی کے لوگوں کی نظر میں کیا وقعت ہے ؟ سرحدی قومیں جیسے گورکھے اور افغانستان کے لوگ شریک بغاوت ہوں گے یا نہیں؟ کوئی ہم عصر سلطنت ایسی بھی ہے جو ایسے وقت میں سلطنت ہندوستان کی طمع کرے ؟ یہ غدر فوج کی شورش فوری ہے یا اس کی ہنڈیا مدت سے پک رہی تھی اور رعایا بھی فوج کی شریک حال ہے؟ حکومت انگریزی سے لوگ رضامند ہیں یا ناراض اور ناراض ہیں تو کیوں ؟ کہاں تک مذہبی خیال غدر کا محرک ہوا ؟ مسلمانوں کے معتقدات میں یہ غدر داخل جہاد ہے یا نہیں ؟ اسی طرح بات میں سے بات نکلتی چلی آتی تھی ۔ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ نوبل صاحب ابن الوقت سے ہندوستانیوں کے رسم و رواج اور طرز تمدن اور معاشرت کے حالات دریافت کرتے اور ابن الوقت ہندی کی چندی کرکے اُن کو بتاتا اور سمجھاتا رہا ۔

ابن الوقت ، اُس کی تو سدا کی عادت تھی کہ غیر ملک کے حالات کو ہر ایک سے کرید کرید کر اور کھود کھود کر پوچھا کرتا تھا ، نوبل صاحب سے اُس نے خوب ہی دل کھول کر جو جو کچھ جی میں آیا پوچھا اور نوبل صاحب نے بھی جہاں تک زبان نے یاری دی بھلی یا بری کوئی بات اپنے وطن اور اپنی قوم کی اُٹھا نہ رکھی ۔ ابن الوقت نے نوبل صاحب کی ہم نشینی میں انگریزوں کے تفصیلی حالات سے اس قدر واقفیت حاصل کی کہ بس آنکھوں سے دیکھنے کی کسر رہ گئی تھی ۔ ہم ایسا سمجھتے ہیں کہ ابن الوقت کو انگریزوں کے ساتھ ایک طرح کی عقیدت تو پہلے سے تھی ہی ، تین سوا تین مہینے نوبل صاحب کے ساتھ رہ کر اس کے خیالات اور بھی راسخ ہو گئے اور عجب نہیں اسی اثنا میں اُس نے تبدیل وضع کا ارادہ کیا ہو ۔

ہم کو نوبل صاحب یا ابن الوقت کے حالات غدر لکھنے منظور نہیں ؛ تسلسل سخن کے لئے اتنا لکھنا ضرور ہے کہ نوبل صاحب کو جس وقت سے ابن الوقت کے گھر ہوش ہوا ، آخر تک اُنھوں نے اپنی ذاتی تکلیف اور مصیبت کی کبھی شکایت کی ہی نہیں ۔ ہاں یہ اُن کا تکیۂ کلام تھا کہ افسوس میں ایسی حالت میں ہوں کہ کسی طرح اپنی قوم کی مدد اور اپنے ملک کی خدمت نہیں کر سکتا ۔ وہ کاہل اور بے کار زندگی سے مرنے کو بہ مدارج بہتر سمجھتے تھے اور خبروں کے نہ ملنے سے اُن کا وقت سخت پریشانی میں گزرتا تھا ۔ جتنی دیر ابن الوقت اُن کے پاس رہتا ، باتیں کرتے ورنہ دالان میں ٹہلتے رہتے ۔ ابھی اُن کے زخم اچھی طرح بھرے بھی نہ تھے کہ اُنھوں نے ابن الوقت پر تقاضا شروع کیا کہ کسی

ڈھب سے مجھے انگریزی کیمپ میں پہنچاؤ۔(ابن الوقت اُن کے بے موقع اور بے جا اصرار سے دل میں سخت آزردہ ہوتا مگر جانتا تھا کہ « اَھلُ الغَرَض مجنُون » : باھر چلتے پھرتے ہوتے تو دیکھتے کہ چاروں طرف کیسی آگ لگی ہوئی ہے ، ہمارے ملک کی عورتوں کی طرح گھر کی چاردیواری میں مقید ہیں ، دنیا و مافیہا سے خاک خبر نہیں ، شاید دل میں خیال کرتے ہیں کہ میں عمداً پہلو تہی کرتا ہوں ۔ زخموں کے اچھا ہوتے ہی نوبل صاحب اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ کئی بار بگڑ بگڑ کر ابن الوقت کو دھمکایا کہ اگر مجھ کو زیادہ روکوگے تو میں نکل بھاگوں گا ۔ ابن الوقت ان کی ایسی ایسی باتیں سن کر ہنستا اور کبھی جھنجلاتا کہ ایسی ہی جان دوبھر ہے اور خود کشی کرنی ہے تو مجھی کو ثواب غزا حاصل کرنے کی اجازت دیجئے ۔

فصل سوم

ابھی غدر فرو نہیں ہوا تھا کہ نوبل صاحب انگریزی کیمپ میں جا داخل ہوئے

ہر چند، ہر بار ابن الوقت بات کو کسی نہ کسی تدبیر سے ہنسی میں اُڑا دیا کرتا تھا مگر دل میں یہ بھی سوچتا تھا کہ ایسا نہ ہو گھٹ گھٹ کر بیمار پڑ جائیں تو وہی مثل ہو کہ کھلائے پلائے کا نام نہیں رلائے کا الثا الزام۔ آخر یہ صلاح ٹھہری کہ نوبل صاحب حاکم فوج انگریزی کو چٹھی لکھیں اور جان نثار اُس کو چھپا کر گوڑگانوہ، رہتک، کرنال، تین ضلعوں کے دیہات میں چکر کاٹتا ہوا کسی جگہ پنجاب کے راستے میں جا ملے اور وہاں سے انگریزی کیمپ میں داخل ہو۔ جان نثار نے اس کا بیڑا اُٹھایا اور چٹھی لے کر روانہ ہوا۔ اُس کا پیٹھ موڑنا تھا کہ یہاں نوبل صاحب اور ابن الوقت لگے اُس کی واپسی کا حساب کرنے۔ ہر چند دونوں چپے چپے زمین کے جغرافیے سے آگاہ تھے مگر باوجودے کہ کئی دن تک برابر رد و کد ہوتی رہی، جان نثار کی واپسی کی تاریخ پر متفق نہ ہو سکے۔ وجہ کیا تھی کہ جان نثار کو آمد و شد میں جن اتفاقات کے پیش آنے کا احتمال تھا اگرچہ کوئی شخص حتیٰ جان نثار بھی اُن کو نہیں جان سکتا تھا مگر ابن الوقت پھر بھی اُن کا کسی قدر ناقص، ناتمام، ادھورا اندازہ کرتا تھا اور نوبل صاحب چونکہ خود مستعجل تھے، کسی احتمال مخالف کو اپنے ذہن میں آنے ہی

نہیں دیتے تھے - تاہم اُنھوں نے آپ ہی اپنے نزدیک یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ جاں نثار کو آج کے پندرھویں دن ضرور ضرور واپس آنا چاہئیے -

ہر چند نوبل صاحب بڑے ہی مستقل مزاج آدمی تھے مگر سچ کہتے ہیں «اَلْاِنْتِظار اشدُّ من الموت» جاں نثار کی واپسی کے انتظار میں تو اُن سے بھی ضبط نہ ہو سکا - جاں نثار کو گئے ہوئے ایک ہی ہفتہ گزرا تھا کہ اُنھوں نے بار بار مڑ مڑ کر دروازے کی طرف دیکھنا شروع کیا اور دسویں دن سے تو یہ حال ہوا کہ سارے سارے دن دروازے میں کھڑے رہنے لگے - ہر چند ابن الوقت گھسیٹ گھسیٹ کر اندر لے لے جاتا تھا مگر قابو ملا اور دروازے میں - جب پندرہ دن بھی گذر گئے اور جاں نثار کا کہیں پتہ نہیں تو نوبل صاحب کی اُس دن کی یاس دیکھ کر ابن الوقت بھی بدحواس ہو گیا - زخمی ہونے کی حالت میں پھر بھی اُن کے چہرے پر ایک طرح کی رونق تھی یا دفعۃً اُن کی حالت اس قدر جلد جلد متغیر ہونے لگی کہ جاں نثار کے سامنے سے آدھے بھی نہیں رہے تھے ؛ بھوک بالکل بند ہو گئی ، نیند ایسی اُچاٹ ہوئی کہ ساری ساری رات کروٹیں بدل بدل کر صبح کر دیتے تھے - آخر جاں نثار کی روانگی سے اُنیسویں دن ابن الوقت نے کہا کہ جاں نثار کو جو اس قدر دیر لگی آپ اس کی نسبت کیا خیال کرتے ہیں ؟

نوبل صاحب - کیا بتاؤں ، جاں نثار کی وفاداری پر شبہ کرنے کی تو میں کوئی وجہ نہیں پاتا ؛ اُس نے اس مصیبت میں جس قدر میری رفاقت کی آپ کو معلوم ہے ، شاید ایسا ہو کہ وہ لوگ جواب کے عوض میرے نکال لے جانے کی فکر میں ہوں اور جاں نثار کو میری نشان دہی کے لئے ٹھہرا لیا ہو -

ابن الوقت ۔ میں آپ کی دل شکنی کے ڈر سے عرض نہیں کر سکتا مگر میرا خیال تو یہ ھے کہ جاں نثار کو ابھی تک انگریزی کیمپ میں پہنچنا بھی نصیب نہ ھوا ھو تو عجب نہیں ۔

نوبل صاحب۔ کیا آپ سمجھتے ھیں کہ میری چٹھی پکڑی گئی ۔ نہیں نہیں ۔ ایسا ھو نہیں سکتا ۔ جاں نثار نہایت ھوشیار آدمی ھے اور اس نے چٹھی کو ضرور ایسی طرح چھپایا ھوگا کہ کوئی گمان نہ کر سکے اور خود جاں نثار کی صورت اور وضع ایسی ھے کہ اس پر جاسوسی یا مخبری کا گمان ھو نہیں سکتا ۔ نہیں نہیں مجھ کو پورا اطمینان ھے کہ وہ چٹھی سمیت صحیح سلامت کیمپ میں پہنچا ۔

ابن الوقت۔ آپ کو کچھ مفصلات کی بھی خبر ھے ؟ تمام دیہات میں لوٹ کھسوٹ مچی ھوئی ھے، راستے بند پڑے ھیں، اکّے دکّے کی مجال نہیں کہ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کا قصد کرے اور ایسی بے تمیزی میں ناحق ناروا کوئی کسی کو مار دے تو کیا لگتا ھے ۔

نوبل صاحب۔ اگر آپ نے یہ حال مجھ سے پہلے کہا ھوتا تو میں ھرگز جاں نثار کے بھیجنے کا ارادہ نہ کرتا ؛ افسوس ھے کہ میں نے اپنے فائدے کے لئے اس کی جان کو خطرے میں ڈالا ۔

ابن الوقت۔ میں نے احتمال عقلی کے طور پر عرض کیا ورنہ جاں نثار ان گنواروں کے بس میں آنے والی اسامی نہیں ۔ اس کی جان کی تو انشاء اللہ سب طرح خیر ھے' ھاں رستے میں کہیں اٹک گیا ھو تو خبر نہیں مگر خدا نے چاھا تو صبح شام پہنچنے ھی والا ھے ۔

نوبل صاحب۔ آپ صرف دیر کی وجہ سے ایسا قیاس کرتے ہیں یا . . . .

ابن الوقت۔ (ہنس کر) نہیں ایک کوّا چھجّے پر بیٹھا ہوا کاؤں کاؤں کر رہا تھا، میں نے اپنے ملک کی رسم کے مطابق شگون لیا اور کوّے سے کہا کہ جاں نثار آتا ہو تو اُڑ جا؛ یہ کہنا تھا کہ کوّا اُڑ گیا۔

ابن الوقت اور نوبل صاحب یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ باہر کے کواڑوں میں سے کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ سنتے ہی ابن الوقت بول اُٹھا "لیجئے الحمد للہ وہ جاں نثار آ پہنچا"۔ ابن الوقت نے دوڑ کر کواڑ کھولے تو سچ سچ جان نثار تھا۔ دور سے نوبل صاحب نے پوچھا "کہو خیر ہے؟"

جان نثار۔ (قاعدے کے مطابق سلام کر کے) خداوند! حضور کے اقبال سے جواب لایا۔

نوبل صاحب نے ایسی جلدی کی کہ جوتی کے تلے سے چٹھی کا نکالنا دشوار کر دیا۔ بارے خدا خدا کر کے چٹھی نکلی تو نوبل صاحب اس کو بغور پڑھ رہے تھے اور ان کے منہ کی طرف ابن الوقت کی ٹکٹکی بندھی ہوئی تھی۔ نوبل صاحب کے چہرے سے فکر کے سوائے اور کوئی بات ظاہر نہیں ہوتی تھی؛ چاہتے تھے کہ چٹھی کو دوبارہ پڑھیں۔ ابن الوقت نے چٹھی پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا "آپ کو ہمارے انتظار کی بھی قدر کرنی ضرور ہے چٹھی کہیں بھاگی نہیں جاتی۔ پہلے خلاصہ فرما دیجئے، تب دوبارہ، سہ بارہ جب تک جی چاہے پڑھا کیجئے گا"۔

نوبل صاحب۔ کوئی خاطر خواہ جواب نہیں آیا۔ لکھتے ہیں کہ ابھی تک ہم لوگ دشمن کے حملوں کو ہٹا رہے

ھیں۔ قلعہ شکن توپیں منگوائی گئی ھیں، وہ پہنچ جائیں تب ہمارے دھاوے شروع ھوں۔ اُس وقت تک جہاں ھو چپ چاپ بیٹھے رھو۔ جس وقت ہماری طرف کے گولے جامع مسجد کے پار جانے لگیں یا قلعے میں گرنے شروع ھوں تو جاننا کہ توپیں پہنچ گئیں اور پھر وہ اُمید کرتے ھیں کہ باغیوں کے پاؤں جلد اُکھڑ جائیں گے اور یہ بھی لکھا ھے کہ تمھارا آدمی سولھویں دن کیمپ میں پہنچا اور اُس کے بیان سے معلوم ھوا کہ اس کو راہ میں بڑی بڑی مشکلیں پیش آئیں پس تم دوبارہ اس کے بھیجنے کا قصد مت کرنا۔ شہر میں صدھا آدمی ھندو مسلمان سرکار کے خیرخواہ موجود ھیں اور شہر کی خبریں برابر چلی آتی ھیں۔ جب موقع ھوگا کسی خیرخواہ کے ذریعے سے تم کو ایما کر دیا جائے گا اور تم نکل آنے کے لئے ھر وقت تیار رھنا اور جن صاحب کے گھر میں تم نے پناہ لی ھے اُن کے تفصیلی حالات اور اُن کے مکان کا پتہ سب تمھارے آدمی سے دریافت کر لیا گیا ھے۔ اُن پر سرکار اور تمام سرکاری عہدہ داران ملکی و فوجی کی احسان مندی کماحقہ طور پر ظاھر کر دینا اور یقین ھے کہ وہ اُن تمام وعدوں سے جن کا اس وقت کر لینا بہت آسان ھے اس کی بہت زیادہ قدر کریں گے۔

ابن الوقت۔ اس سے بہتر اَور کیا جواب ھو سکتا تھا۔ اس جواب کی نسبت کافی اور شافی اور معقول اور مناسب جو جو کچھ کہا جائے سب بجا ھے۔

نوبل صاحب۔ مگر میں یوں بے کار پڑے پڑے ضرور مر جاؤں گا۔

ابن الوقت۔ آپ مرنے والے ھوتے تو مرنے کے بہت سے مواقع تھے، اب آپ کی زندگی کا میں بیمہ لیتا ھوں۔ میں جانتا ھوں کہ آپ کی طبیعت بے کاری سے اُکتاتی ھے مگر جہاں اتنی

مصیبتیں جھیلی ھیں چندے اور صبر کیجئے ۔ میں سمجھتا ھوں مہینے سوا مہینے کے آپ ھمارے مہمان اور ھیں ۔

نوبل صاحب۔ اُفّوہ مہینے سوا مہینے ۔

ابن الوقت۔ اس مدت کے لئے کیا اچھا مشغلہ اس وقت خیال میں آیا ھے ۔

نوبل صاحب۔ وہ کیا؟

ابن الوقت۔ حالات غدر کی یادداشت ۔

نوبل صاحب۔ واہ واہ بہت ھی اچھی صلاح ھے مگر بہت سی باتیں اب مجھ کو اچھی طرح سے یاد بھی نہیں رھیں ۔

ابن الوقت۔ جہاں تک آپ کو یاد ھے اپنی یادداشت سے لکھئے اور زیادہ درکار ھو تو میرے پاس ھر روز کے واقعات کی تفصیلی کیفیت لکھی ھوئی تیار ھے ، آپ چاھیں تو اس سے لے سکتے ھیں۔ میرے اور آپ کے درمیان یہ قول رھا کہ اس یادداشت سے کسی کو ضرر نہ پہنچے۔

نوبل صاحب۔ میں نہیں جانتا کہ غدر کے بارے میں گورنمنٹ کی کیا رائے ھوگی مگر باوجودے کہ غدر سے مجھ کو بڑی بڑی تکلیفیں پہنچیں؛ میں ولایت جانے سے رھا، میرے اعزّہ واحباب نے مجھے مرا ھوا فرض کر کے خدا جانے اپنا کیا حال کیا ھوگا، میں زخمی ھوا، میری زندگی معرض تلف میں رھی، میری گیارہ برس کی کمائی سب برباد ھوئی : تین مہینے ھونے آئے کہ میں بے کار محض پڑا سڑتا ھوں اور ابھی نہیں معلوم کہ کب تک یوں ھی پڑا سڑوں گا ، مجھ کو اپنے یگانوں اور دوستوں کے مرنے جینے کی مطلق خبر نہیں اور یہ بھی خبر نہیں کہ اس ھنگامے کے فرو ھونے تک کیا کیا ایذائیں اور مصیبتیں پیش آنے

والی ھیں۔ باوجود ان تمام صدمات کے میں اس ملک کے لوگوں کو سب کو نہیں تو اکثر کو کسی قدر معذور بھی سمجھتا ھوں۔ میرے نزدیک غدر ایک شورش جاھلانہ ھے، ھندوستانی فوج نے سرکاری قوت کے اندازہ کرنے میں غلطی کی ؛ اُنھوں نے سمجھا کہ یہ ملک کمپنی بہادر نے ھماری مدد سے سر کیا ھے اور ھماری ھی مدد سے اس ملک پر قابض ھے۔ لوگوں کو، کیا رعایا کیا فوج، سرکاری ضوابط اور قواعد سے بھی کسی قدر ناراضامندی ضرور تھی اور سرکاری عہدہ داروں نے اس نا رضا مندی کی مطلق پروا نہیں کی اور ھزار باتوں کی ایک بات تو یہ ھے کہ سرکار نے صرف بہ زور شمشیر اپنی حکومت قاھرہ کو بٹھانا چاھا اور سلطنت مطمئنہ کی شرط ضروری خوشنودئی رعایا ؛ افسوس ھے کہ تمام تر نہیں تو اس کا بڑا حصہ فوت ھوا اور گورنمنٹ کا منشا پا کر عہدہ داران سرکار نے بھی استمالۃ قلوب خلائق کی طرف ذرا توجہ نہ کی۔ اس صورت میں کمپنی بے شک ھندوستان کی بادشاہ ھے مگر اسی طرح کی بادشاہ جیسے جنگل میں شیر۔ میری ھر گز یہ رائے نہیں ھے کہ غدر کی کھچڑی مدت سے پک رھی تھی یا سوچ بچار کر صلاح و مشورے سے یہ فساد ھوا۔ پس اگر میری رائے پر عمل ھوا اور وہ رائے اس حیثیت سے کہ میری رائے ھے، ھر گز قابل وقعت نہیں مگر میں سمجھتا ھوں کہ گورنر جنرل جیسا مدبر اور منتظم اور صاحب الرائے ضرور تمام اطراف و جوانب پر نظر کر کے حلم اور در گذر کے اصول پر عمل کرے گا اور تب ھی یہ آگ بجھے گی بھی۔ انتقام کا لینا تو ابقائے رعب اور سیاست کے لئے ضرور ھوگا مگر تعمم کے ساتھ نہیں۔ ھن

لوگوں نے کھلم کھلا بغاوت کی اور بغاوت کو پھیلایا اور مسلح ہو کر سرکار کے مقابلے میں معرکہ آرا ہوئے اور جنھوں نے حکومت انگریزی کے استیصال کی تدبیریں کیں اور جنھوں نے انگریزوں یا اُن کے بی بی بچوں کو صرف اس وجہ سے کہ انگریز ہیں ناحق، ناروا قتل کیا، ایسے اور صرف ایسے ہی لوگوں کو سخت سزا دینی چاہئے۔

ابن الوقت۔ اب مجھ کو پورا اطمینان ہے کہ میرا روز نامچہ مجھ سے بہتر محفوظ ہاتھ میں رہے گا۔ لیجئے کتاب حاضر ہے۔

نوبل صاحب کے کئی ہفتے اس روزنامچے کی بدولت آسانی سے کٹ گئے اور یوں اُن کی حالت منتظرہ جو تھی سو تھی ہی مگر روزنامچے کا مشغلہ نہ مل گیا ہوتا تو نوبل صاحب شاید اُکتا کر اور بُولا کر باہر نکل کھڑے ہوتے۔ نوبل صاحب کا روزنامچہ ابھی پورا نہیں ہوا تھا کہ غدر کے کوئی دو مہینے اور بیس یا بائیس دن بعد عشا کی اذانیں ہو رہی تھیں کہ پہلا گولہ قلعے کے دیوان عام میں گر کر پھٹا۔ سارے شہر میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ اس وقت نوبل صاحب اور ابن الوقت دونوں ایک ہی جگہ تھے۔ جوں گولے کا دھماکا ہوا ابن الوقت چونک پڑا اور یہ کہ کر اُٹھا کہ لیجئے جناب دھلی کی فتح اور آپ کا ان شاءاللہ مع الخیر والعافیۃ کیمپ انگریزی میں داخل ہونا مبارک، مبارک، مبارک۔ یہ ضرور قلعے کی آواز ہے، جاؤں ذرا اپنی سرکار کی خبر لوں۔ بیگم صاحب تو شہر کی توپوں کی آواز سن سن کر کانپ کانپ اُٹھتی تھیں؛ خدا جانے یہ گولہ کس مقام پر گرا، الٰہی خیر ہو۔

نوبل صاحب۔ شاید قلعے سے توپ چلی ہو۔

ابن الوقت - نہیں جناب جب قلعے پر توپیں چڑھائی گئیں تو بہت سی بیگمات بلکہ مرشدزادے حضور والا میں فریاد لے کر آئے تھے کہ ہم کو ڈر لگتا ہے ایسا نہ ہو کہیں ان توپوں کے چھوڑنے کا حکم ہو تو خانہ‌زاد آواز کے سنتے ہی دہل کر مر جائیں گے - جہاں پناہ نے اُسی وقت حکم دے دیا کہ قلعے کی توپوں کے گولہ انداز شہر کی فصیل کے مورچوں پر رہیں -

اُس وقت کا گیا گیا ابن الوقت پانچویں دن نواب معشوق محل بیگم صاحب کے پھول کرکے آیا تو نوبل صاحب کو دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لایا - نوبل صاحب کو معلوم تو ہو ہی گیا تھا ، فرمانے لگے کہ بیگم صاحب کے انتقال کا مجھ کو سخت ملال ہے اور آپ سے جس قدر میں نے اُن کی مدح سنی ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑی نیک دل ملکہ تھیں مگر ایسے وقت کا مرنا میں اُن کی خوش نصیبی کی دلیل سمجھتا ہوں کیوں کہ آپ کے جہاں‌پناہ نے اپنے ساتھ نسل تیمور اور تمام خاندان شاہی بلکہ شہر کے برباد اور تباہ کردینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا - اُنھوں نے ملک گیری کی ہوس کی جب کہ اُن کو اور اُن کے اعوان و انصار کو ملک داری تو کجا خانہ داری کی بھی لیاقت نہ تھی - اُنھوں نے گورنمنٹ انگریزی کے نزدیک اپنے تئیں محسن کش ، نا شکر گزار ، غدّار ثابت کر دیا - اُنھوں نے ہزارہا خون جو غدر کی وجہ سے ہوئے اور ہو رہے ہیں اور ابھی خدا جانے کتنے اَور ہوں گے اپنی گردن پر لئے -

ابن الوقت - ہر چند میں سمجھتا ہوں کہ بیگم صاحب کا

ایسے وقت میں انتقال فرمانا اُن کے حق میں بہت ہی بہتر ہوا مگر وہ ہماری آج کی نہیں قدیم کی سرکار تھیں، ہمارے سارے خاندان پر اُن کے اور اُن کے بزرگوں کے احسانات کے انبار ہیں۔

نوبل صاحب - بے شک اپنے محسن اور مربّی اور سر پرست اور آقا کی یاد کا تازہ رکھنا شرط مروّت اور شیوۂ وفاداری ہے مگر میں اُمید کرتا ہوں کہ ہماری سرکار بھی آپ پر اتنا تو ضرور ثابت کر دے گی کہ وہ بھی قدر دانی اور حق شناسی میں قلعے کی کسی سرکار سے کم نہیں۔

جس دن قلعۂ شاہی پر گولے برسنے شروع ہوئے، فوج باغی کا ضعف اور اہل شہر کا ہراس کُھل پڑا۔ لوگ لگے مال ومتاع گھر بار چھوڑ کر بھاگنے اور گولوں نے بھی یہ غضب ڈھانا شروع کیا کہ کلکتے دروازے سے لیکر لاہوری دروازے تک شہر کے شمالی حصے میں شاذ و نادر کوئی مکان اُن کے صدمے سے بچا ہو تو بچا ہو ورنہ سارے دن اور ساری رات ہر طرف سے یہی آواز چلی آتی تھی، «پھُٹ اڑا ڑا ڑا دَھوں»۔

رفتہ رفتہ ابن الوقت کے محلے میں سے بھی لوگ کھسکنے شروع ہوئے، تب تو ابن الوقت کو سخت تردّد پیدا ہوا کہ ایسا نہ ہو ہماری عورتوں کے کان میں بھی بھنک پڑ جائے اور شہر سے چلے جانے کا ارادہ کریں۔ چنانچہ ابن الوقت نے ایک دن اس خدشے کو نوبل صاحب سے بھی بیان کیا تو اُنھوں نے فرمایا جو لوگ شہر کے جنوبی حصے میں رہتے ہیں اُن کو گولوں کے ڈر سے بھاگنے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ گولہ باری صرف فوج باغی کے ڈرانے کی غرض سے ہو رہی ہے اور وہ حاصل ہو چکی کیونکہ سب کے پاؤں اکھڑ گئے ہیں۔ اب سرکار کو جانوں اور عمارتوں

کا نقصان کرنے سے کیا فائدہ ہوگا۔ نہیں نہیں آپ بہ خوبی اطمینان رکھئے، ہم لوگ گولوں کے گزند سے محفوظ ہیں لیکن ہاں اگر ایسا ہوا کہ شہر کے فتح ہونے سے پہلے میرا جانا ٹھہر گیا تو اتنی احتیاط ضرور کرنا کہ مکان میں ہفتے عشرے کا سامان رکھ کر مضبوطی کے ساتھ اندر ہو بیٹھنا۔ فتح مند فوج کا دشمن کے شہر میں داخل ہونا گویا ایک عذاب کا نازل ہونا ہے، سامنے پڑا ہوا آدمی بچ نہیں سکتا اور میں امید کرتا ہوں کہ شہر کے فتح ہونے سے پہلے میں آپ کی حفاظت کا انتظام کر سکوں گا۔

اگلے دن جو ابن الوقت قلعے گیا تو دیکھا کہ خود جہاں پناہ بھی بھاگنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ سمجھا کہ بس اب صبح شام انگریز داخل ہونے والے ہیں۔ وہاں کے کام کاج سے فراغت پا کر گھر کو واپس آ رہا تھا کہ بادشاہ کے خاص الخاص خدمتگار یاقوت نے پیچھے سے آواز دی اور برابر آ کر کہنے لگا "بھلا ہوا کہ میں نے آپ کو جاتے دیکھ لیا ورنہ آپ کے گھر جانا پڑتا۔ جو انگریز آپ کے گھر میں چھپا ہوا ہے یہ چٹھی اُس کے نام کی ہے، اُس کو دے دیجئے گا"۔ یہ کہ کر یاقوت اُلٹے پاؤں لوٹ گیا۔ ابن الوقت اپنے دل میں کہتا چلا آتا تھا کہ کس برتے پر تتّا پانی؛ مردانگی کا وہ حال کہ ایک دن بھول کر قلعے سے باہر قدم نہ رکھا، بیدار مغزی اس درجے کی کہ اپنے خاص الخاص خدمتگار انگریزوں سے ملے ہوئے، تو بغاوت کرنی کیا ضرور تھی۔ گھر آ کر نوبل صاحب کو چٹھی دی۔ لکھا تھا کہ کل کا دن بیچ پرسوں دو بجے رات سے شہر پر دھاوا ہے۔ آج رات کے آٹھ بجے سے آدھی رات تک ایک لفٹنٹ کچھ گورے لے کر کابلی دروازے کے باہر بو علی شاہ کے تکیے میں تمھارا منتظر

رہے گا۔ دیکھو موقع ہاتھ سے جانے نہ پائے۔

غدر سے بہت دنوں بعد تک شہر کے دروازوں پر پہرے چوکی کا ایسا سخت انتظام رہا کہ بے تلاشی کوئی گذرنے نہیں پاتا تھا۔ لوگوں میں تو یہ مشہور تھا کہ اس سے مخبری کا انسداد منظور ہے مگر فی الواقع مردم آزاری کے سوائے کوئی بات نہ تھی یا اب یہ حال ہو گیا تھا کہ کلکتے دروازے سے لے کر کابلی دروازے تک شہر کے پانچ دروازے تو بالکل بند تھے؛ لاہوری کھلا ہوا تھا مگر برائے نام، کیونکہ گولے کے ڈر کے مارے کسی کو اس دروازے کے باہر بھی قدم رکھنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ آمد و شد کی بڑی بھرمار پہلے سے بھی دلّی دروازے اور ترکمان دروازے پر تھی، جب سے بھاگڑ شروع ہوئی یہ حال ہو گیا تھا کہ سارا شہر اِنھیں دو دروازوں کی راہ اُمڈا ہوا نکلا چلا جاتا تھا۔ صلاح یہ ٹھہری کہ اچھی طرح جُھٹپٹا ہولے تو ترکمان دروازے سے نکل لیں اور باہر باہر گھوم کر تکیے میں جا داخل ہوں۔

نوبل صاحب جب تک ابن الوقت کے گھر رہے ہندوستانی لباس پہنا کئے اور وہ ایسے جامہ زیب آدمی تھے کہ ہندوستانی کپڑوں میں بہت ہی بھلے معلوم ہوتے تھے۔ جو کپڑے پہنے بیٹھے تھے اُسی طرح ابن الوقت اور اُس کے دو رازدار ملازموں اور جان نثار کو ساتھ لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ نوبل صاحب نے صرف اتنی ہی احتیاط کی کہ چادر سے اپنا منہ چھپا لیا جیسے کسی کی آنکھیں دُکھتی ہوں۔ ابن الوقت اُن کا ہاتھ پکڑے ہوئے آگے آگے تھا۔ وہ ایسا نفسی نفسی کا وقت تھا کہ کوئی کسی کے حال سے مُتعرّض نہ ہوتا تھا۔ نہ کسی نے روکا نہ ٹوکا، اچھی خاصی طرح دندناتے ہوئے دروازے کے باہر جا

موجود ہوئے۔ پھر آگے اجمیری دروازے کے برابر بھی گنتی کے چند آدمی نظر آئے جن کو اپنی دھن میں کسی کی کچھ سُدھ نہ تھی۔ وہاں سے آگے بڑھے تو مطلع صاف تھا۔

جنگل سے زیادہ ویران، بیابان سے بڑھ کر وحشت ناک تکیہ ابھی صاف طور پر نظر بھی نہیں آیا کہ دور سے "ہو کمز دیر"* کی آواز آئی۔ معلوم ہوا کہ نوبل صاحب کے لینے کو لوگ پہنچ گئے ہیں۔ نوبل صاحب نے پکار کر "فرنڈز"† کہا تو لفٹننٹ بریوؔ آگے بڑھے۔ ادھر سے نوبل صاحب چھٹک کر الگ ہوئے۔ دونوں نے ہاتھ ملائے۔ ساتھ کے گوروں نے "ہُرّا"‡ کے ساتھ نوبل صاحب کو نجات کی مبارکباد دی۔ پھر نوبل صاحب نے وہیں کھڑے کھڑے بریو صاحب سے ابن الوقت کی تقریب کی۔ وہ بیچارے مطلق اردو نہیں بول سکتے تھے مگر نوبل صاحب اُن کی طرف سے ترجمان ہوئے کہ لفٹننٹ صاحب آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ بھی کیمپ کو چلیں۔ ابن الوقت نے اہل وعیال کی تنہائی کا عذر کیا تو لفٹننٹ بریو نے کہا خدا نے چاہا کل نہیں تو پرسوں اس سے بہت پہلے ہم آپ سے مل چکیں گے اور سب سے پہلا سپاہی جو آپ کی حفاظت کے لئے آپ کے گھر پر حاضر ہوگا شاید وہ میں ہوں گا۔ یہ کہہ کر لفٹننٹ بریو نے جیب سے دو چُرٹ نکالے۔ ایک تو نوبل صاحب کو دیا اور دوسرا ابن الوقت کو اور دیا سلائی بھی سلگا کر ابن الوقت کے آگے کر دی۔ ابن الوقت نے لفٹننٹ صاحب کا بہت شکریہ ادا کیا اور یہ کہہ کر اپنا چرٹ نوبل صاحب کو دے دیا کہ آپ جانتے ہیں مجھ کو اس کی عادت نہیں۔ ابن الوقت نے یہ کہا تو سہی مگر اُس کو معلوم نہ تھا کہ انگریزوں کی صحبت میں

---

* کون آ رہا ہے۔ † دوست ہیں۔ ‡ نعرہ خوشی۔

خدا جانے کیا کیا پینا کھانا اس کی قسمت میں لکھا ہے۔
نوبل صاحب نے بھی ابن الوقت کو نہایت درجے کی احسان مندی
کے ساتھ رخصت کیا۔ جان نثار تو نوبل صاحب کے ساتھ ہو لیا
اور ابن الوقت اپنے دونوں نوکروں کے ساتھ پاس کے پاس
فراش خانے کی کھڑکی سے داخل ہو کر شہر کے اندر اندر
خوش و خرم گھر پہنچا۔

فصل چہارم

غدر کے بعد ابن الوقت کو کیا کیا مصیبتیں پیش آئیں

اُن دنوں دلّی کے رہنے والوں میں سے بہت ھی تھوڑے دل سطمئن تھے اور جو قدرے قلیل معدودے چند مطمئن تھے اُن میں ایک ابن الوقت بھی تھا ۔ نوبل صاحب اور لفٹننٹ بریو نے تھوڑی دیر پہلے اُس کے ساتھ اس قسم کی مدارات کی کہ سینکڑوں ھزاروں اُمیدیں اُس کے دل میں اُمنڈنے لگیں ۔ پس اگلا دن غدر کے دوسرے دنوں کی طرح خیریت سے گذرا ۔ آدھی رات کا ڈھلنا تھا کہ دلّی کے حصے کی قیامت آ گئی یعنی انگریزوں نے دو طرف سے شہر پر حملہ کیا ۔ تھوڑی دیر تو توپیں چلیں ، اس تسلسل کے ساتھ کہ جیسے کبھی زور کی مہاوٹ میں بجلی ھے کہ برابر کوند رھی ھے اور گرج ھے کہ ایک لمحے کو نہیں تھمتی اور پھر بندوقیں چلنی شروع ھوئیں ۔ ابن الوقت کو دور سے بس ایسا سن پڑتا تھا کہ بھاڑ میں گویا چنوں کے گھان بھُن رھے ھیں ۔ پھر سوا پہر دن چڑھتے چڑھتے بارے وہ شدت تو کم ھوئی مگر بندوقوں کی آواز پھر بھی پھٹ پھاٹ ادھر سے ، اُدھر سے چلی ھی آتی تھی ۔ پھر ایسا سن پڑا کہ انگریز جا بجا سکانوں میں گھس بیٹھے ھیں اور باغی ھیں کہ بَولائے بَولائے پڑے پھرتے ھیں ۔ اصل حال نہیں کھلتا کہ جیت کس کی رھی ۔ غرض جوں توں شام ھوئی اور سچ پوچھو تو شہر کے تمام جنوبی حصے میں دن بھی رات ھی کی طرح اُداس تھا ۔ بوڑھے سے بوڑھے آدمیوں کی ساری عمر اسن میں گزری ، ایسی لڑائیاں کسی کے

خواب و خیال میں بھی نہ تھیں ۔ مار کٹائی میں اگر کسی کے خون نکل آیا تو سارے شہر میں کئی دن اس کا چرچا رہتا تھا ۔ اب ہر شخص اپنی جگہ ایک رائے لگاتا تھا ، جتنے منہ اتنی باتیں ۔ کوئی کہتا تھا بس جو کچھ ہونا تھا ہو چکا ، رات کو رہے سہے باغی بھی اپنا منہ کالا کر جائیں گے ؛ شکر ہے مدتوں میں نیند بھر کر سونا تو نصیب ہوگا ۔ دوسرا پیشین گوئی کرتا کہ لڑائی کا پیچھا ھی بھاری ہوتا ہے ، انگریز اس قدر غضبناک ہو رہے ہیں کہ شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں تو سہی ۔ تیسرا بول پڑتا کہ نہیں جی ، ایسا نہیں ہو سکتا ؛ شہر کو مسمار کر دیں گے تو حکومت کاہے پر کریں گے ، ڈلوں پر ، پتھروں پر ؟ چوتھا یہ صلاح دیتا کہ دو چار دن گھر سے باہر نکلنا ٹھیک نہیں ، آدمی سامنے پڑا اور ٹھائیں سے اڑا دیا ۔

یہ اور ان سے بہت زیادہ باتیں خود ابن الوقت کے گھر میں ہو رہی تھیں کہ کوئی پہر ڈیڑھ پہر رات گئے سڑک کی طرف بڑے زور سے گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی اور پھر معلوم ہوا کہ سوار مکان کے برابر ٹھہرا ۔ چند لمحے کے بعد کسی نے ابن الوقت کا نام لے کر پکارا ۔ سب کو حیرت ہوئی کہ ایسے اندھیرے میں کہ ھاتھ کو ھاتھ نہیں سجھائی دیتا کون آیا ہوگا ۔ ابن الوقت نے دروازے کے پاس جا کر آہٹ لی تو معلوم ہوا کہ جان نثار ہے ۔ گھبرا کر پوچھا کیا صاحب بھی ہیں ؟

جان نثار ۔ ہوں تو میں اکیلا مگر صاحب کا بھیجا ہوا آیا ہوں ۔ ان کی نوکری کوڑیا پل کے مورچے پر ہے ، مورچہ چھوڑ کر آ نہیں سکتے ۔ مجھ کو دوڑایا ہے کہ ہم سب لوگ سمجھتے تھے کہ شہر ایک دن میں فتح ہو جائے گا مگر ابھی تک باغی موجود ہیں ۔ نہیں معلوم کتنی لڑائیاں شہر پناہ کے

اندر ہوں گی۔ عین لڑائی میں دوست دشمن کا امتیاز ہو نہیں سکتا ۔ آپ مال و متاع کا ہرگز لالچ نہ کیجئیے ، فقط جانیں لے کر راتوں رات شہر کے باہر نکل جائیے ۔ جب اچھی طرح تسلط بیٹھ جائے گا تو آپ ہم مل لیں گے ۔ صبح ہوتے ہوتے خود تمھارے ہی محلے پر دھاوا ہے ۔

جلدی جلدی اتنا کہہ کر جاں نثار تو چلتا ہوا ، ابن الوقت یہ پیام سن کر کھڑے کا کھڑا رہ گیا ۔ پھر تھوڑی سی دیر بعد ہوش میں آیا تو سارے گھر کو سر پر اٹھا لیا کہ چلو چلو نکلو ۔ اس وقت تک نوبل صاحب کا حال ابن الوقت نے کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا ۔ اب اس کے غل مچانے پر جو لوگوں نے حجت شروع کی اور الکسائے تو اس کو بہ مجبوری ساری حقیقت بیان کرنی پڑی ۔ رات کا وقت ، بال بچوں کا ساتھ اور دفعتاً گھر سے نکلنا اور وہ بھی محض بے سروسامانی سے ؛ خیر وہ تو جان ہی کچھ ایسی پیاری تھی کہ ھچکچا کر ، مچل کر نکلے پر نکلے ۔

ابھی کوئی سو قدم بھی گھر سے دور نہیں جانے پائے تھے کہ جیسا جاں نثار نے کہا تھا محلے پر اولوں کی طرح گولوں کی بارش ہونے لگی ۔ دو ہفتے کامل شہر کے باہر باہر خدائی خوار خاک چھانتے پڑے پھرے ؛ دن کو کوٹلے میں ہیں تو رات کو عرب سرائے میں ؛ آج پہاڑ گنج ہیں ، تو کل قدم شریف ؛ جہاں جاتے کوئی کھڑے ہونے تک کا روادار نہیں ہوتا ۔ بارے سنا کہ پٹیالے والے کے حکیم خواجہ باقی باللہ میں ہیں اور اُن کی وجہ سے وہاں سرکاری پہرہ بیٹھا ہے اور امن ہے۔ رشتہ نہیں ، قرابت نہیں مگر «الغریق یتشبث بالحشیش*» آنکھوں پر ٹھیکری رکھ کر چلے کہ شاید ہم وطنی کا پاس

---

*ڈوبتا تنکے کا سہارا پکڑتا ہے۔

کریں ۔ گرتے پڑتے سڑک کو بچائے ہوئے چلے جاتے تھے اور کچھ راہ گیر شہر کے جلا وطنوں میں سے سڑک پر بھی تھے ، یکایک کیا دیکھتے ہیں کہ کچھ سوار ہیں اور سڑک پر پکڑ دھکڑ ہو رہی ہے ۔ ان لوگوں نے چاہا کہ دبے پاوں آڑ میں ہولیں ۔ سوار گھوڑا دوڑا کر سر پر آموجود ہوا اور مضبوط مضبوط آدمیوں کو چن کر کشاں کشاں سڑک پر لے گیا ۔ معلوم ہوا کہ لوٹ کے مال کے کچھ گٹھڑ ہیں ، اُن کو اُٹھوا کر رسالے میں لے جانا چاہتے ہیں اور رسالہ وزیر آباد میں ہے ؛ یہاں سے کچھ نہیں تو چار کوس اور دلّی کے مرزامنشوں کے حق میں ہزار کوس ۔ «زبردست کا ٹھینگا سر پر» قریب تھا کہ ایک گٹھڑ ابن الوقت کو بھی سر پرلادنا پڑے ، اتنے میں رجال الغیب کی طرح چند انگریز گھوڑوں پر سوار آپہنچے ۔ اُن کو دیکھ کر لگے لوگ فریاد کرنے کہ دیکھئے خداوند ہم کو بیگار پکڑتے ہیں ۔ اتفاق سے انگریزوں میں نوبل صاحب تھے اور بیگاروں میں ابن الوقت ۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں ، آنکھوں کا چار ہونا تھا کہ نوبل صاحب گھوڑے سے کود ، دوڑ کر ابن الوقت کو لپٹ گئے اور اپنے ساتھیوں سے کہا ” یہ وہی صاحب ہیں جنھوں نے مجھ کو اپنے گھر میں پناہ دی تھی “ ۔ اُن انگریزوں نے بھی اُتر کر ابن الوقت سے بڑے تپاک کے ساتھ ہاتھ ملائے ۔

اور انگریز تو چلے گئے نوبل صاحب وہیں ٹھہرے رہے اور سوار جو بیگار پکڑ رہے تھے اُنہیں میں سے ایک کو کوتوال کے پاس دوڑایا کہ جلد گاڑی ، بہلی ، رتھ جو کچھ ملے لے کر آؤ ۔ سواریوں کے آنے اور لوگوں کے سوار

کرنے اور گھر تک پہنچانے میں کامل تین ساڑھے تین گھنٹے لگے مگر واہ رے نوبل صاحب ٹلنے ھی کا نام نہ لیا۔ ابن الوقت نے مکان پر پہنچ کر دیکھا کہ جنگی سپاھی باھر دروازے پر کھڑا پہرہ دے رہا ھے اور بڑے بڑے موٹے حرفوں کا اشتہار لگا ھوا ھے کہ یہ مکان خیر خواہ سرکار کا ھے کوئی اس کی طرف نظر بھر کر نہ دیکھے۔

ھوا یوں کہ جس وقت نوبل صاحب نے جان نثار کی زبانی ابن الوقت کو شہر سے نکل جانے کے لئے کہلا بھیجا تھا اسی وقت سے تاک میں تھے، قابو پاتے ھی پہرہ بٹھا دیا۔ باغیوں اور شہر والوں میں سے تو بھاگنے میں کسی کو لوٹ کھسوٹ کی سوجھتی نہ تھی؛ لوگوں کو اپنی ھی جان دوبھر تھی۔ رہ گئے سرکاری سپاھی اور فوج کے سقّے، دھوبی گراس کٹ وغیرہ انھوں نے سارے شہر کو دھڑی دھڑی کر کے لوٹا۔ اوپر کا رکھا دھرا اسباب تو کسی کا ایک تنکا نہیں بچا؛ گڑا دبا مال بھی کھود کھود نکال کر لے گئے۔ ابن الوقت کے مکان پر بھی سارے دن اور پہر رات گئے تک یہی تانتا لگا رہتا تھا کہ ایک گیا ایک آیا مگر پہرہ اور اشتہار دیکھا اور کان دبا کر چلتے بنے۔ غرض خدا کے فضل سے ابن الوقت کے گھر میں تو ایک سوئی تک نہیں گئی؛ جیسا چھوڑ کر گئے تھے ویسا ھی آ دیکھا۔

فصل پنجم

"کوئین وکٹوریا نے زمام سلطنت ہند اپنے ہاتھ میں لی -
دربار — ابن الوقت کو صلۂ خیرخواہی ملا

اب نوبل صاحب ابن الوقت کو گھر میں بسا کر چلنے لگے تو اس کو سمجھا گئے کہ ہر چند شہر کامل طور پر فتح ہو گیا ہے مگر مفصلات میں بدستور بد انتظامی ہے، اکثر جگہ سرکاری تھانے تک نہیں بیٹھے - صاحب لوگوں میں سے کسی کو دم مارنے کی فرصت نہیں اور شاید آج رات کو جھجر پر دوڑ جانے والی ہے، عجب نہیں مجھ کو بھی جانا پڑے ؛ آپ اطمینان سے گھر میں بیٹھے رہئے، جب موقع ہو گا میں خود آپ کو بلوا بھیجوں گا - شاموں شام جان نثار ہزار روپے کا توڑا لا کر دے گیا کہ صاحب نے مدد خرچ کے لئے دیا ہے اور پھر نوبل صاحب ایسے غائب ہوئے کہ ابن الوقت کو مدت تک ان کا کچھ حال ہی معلوم نہ ہوا کہ کہاں ہیں اور کیا کرتے ہیں -

اس اثناء میں شہر میں بسنے کی بندی بھی کسی قدر کھل گئی تھی - لوگ یوں ڈر کے مارے اپنی اپنی جگہ ٹھٹکے ہوئے تھے تا ہم شہر میں اکثر محلے اور محلوں میں اکثر گھر اور گھروں میں اکثر آدمی آباد ہو گئے تھے ؛ یہاں تک کہ امن عام کی منادی گلی گلی اور کوچے کوچے پھرنے لگی اور معلوم ہوا کہ ملکۂ معظمہ نے کمپنی

سے ملک نکال کر اپنے اہتمام میں لیا اور بڑی دھوم کا جشن ہونے والا ہے ۔ کل جشن ہوگا اور نوبل صاحب کی کچھ خبر نہیں ۔ کوئی چار گھڑی دن رہتے رہتے کمشنری کا چپڑاسی ابن الوقت کے نام کا ایک لفافہ لایا ، شرکت جشن کے بلاوے کا خط تھا ۔ ابن الوقت جی ہی جی میں بہت زچ ہوا کہ مجھ کو انگریزی دربار میں کبھی جانے کا اتفاق ہوا نہیں ، حکّام میں کسی سے معرفت نہیں ، کیا نوبل صاحب کو ایسے ہی وقت میں مجھے چھوڑ کر چلا جانا تھا ۔ بارے کشاں کشاں گیا تو نوبل صاحب کو موجود پایا ۔ آج پہلا دن تھا کہ ابن الوقت نے نو بل صاحب کو اُن کی اصلی شان میں دیکھا ۔ بیسیوں انگریز اور ہندوستانی رئیس (اگرچہ اب رئیس کہاں تھے) اُن کو گھیرے ہوئے تھے اور نوبل صاحب دربار کے اہتمام میں ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر دوڑے دوڑے پھر رہے تھے ۔ تھوڑی دیر تک تو ابن الوقت کو اُنھوں نے دیکھا تک نہیں مگر جب اُن کی نظر پڑی ، فوراً اُس کے پاس آ کر ہاتھ ملانے کے بعد کہنے لگے ”میں رات کے دس بجے آیا ۔ اس وقت مجھ کو آپ سے بات کرنے کی مطلق فرصت نہیں ۔ وہ فلاں نمبر کی کرسی آپ کی ہے ۔ وہاں بیٹھئے ۔ آج (ذرا سوچ کر) بلکہ کل بھی میں آپ سے نہیں مل سکوں گا ، پرسوں نو بجے سے گیارہ بجے تک جس وقت آپ کا جی چاہے آپ مجھ سے ٹامس صاحب کی کوٹھی پر مل سکتے ہیں “ ۔

ابن الوقت نے شاہی دربار بہتیرے دیکھے تھے ۔ اُن میں ان گئے گزرے وقتوں میں رونق کہو ، شان کہو ، صرف درباریوں کے زرق برق کی تھی ، وہ بھی پرانی جامہ واریں ، دقیانوسی پشمینے ۔ اس دربار میں سارے دربار شاہی کے مول

کا تو ایک قالین ہوگا اور شامیانے اور خیمے اور میز کرسی اور جھاڑ فانوس اور تصاویر اور اسباب آرائش کا تو کون اندازہ کرسکتا تھا - ابن الوقت نے آج جانا کہ ساری رونق سادگی اور صفائی میں ہے - غرض شاہی اشتہار پہلے انگریزی میں اور پھر اُردو میں پڑھا گیا ، میدان دربار اور چھاؤنی اور قلعے سے تیہری شاہی سلامی سر ہوئی ، انگریزی باجے بجنے لگے ، نذرین گذرنی شروع ہوئیں - اب خیر خواہان سرکار کا نمبر آیا - ابن الوقت دل میں اپنی ہی خیر خواہی پر بڑا نازاں تھا - اب معلوم ہوا کہ خاص شہر کے خیر خواہوں کی فہرست میں اس کا نمبر ۱۲۵ ہے - بہر کیف جب ابن الوقت کی نوبت آئی اور اُس کا نام پکارا گیا تو صاحب کمشنر نے اُس کو سامنے کھڑا کرکے اپنے ہاتھ سے نادان سنگھ جاٹ ، باغی زمیندار ضلع گڑگانوہ ، کے علاقۂ منضبطہ میں سے موضع کھیڑ کا پور (خیرخواہ پور) جمعی تین ہزار روپیہ سالانہ کی سند زمینداری نسلاً بعد نسل ، دستخطی سُنہری لاٹ صاحب ، حوالے کی اور نوبل صاحب نے کمشنر صاحب کے پیچھے سے گردن نکال کر اشارے سے وہیں مبارک باد دی -

ابن الوقت کی خیر خواہی کا چرچا تو اُسی دن سے لوگوں میں ہونے لگا تھا جس دن کہ دلّی فتح ہوئی - آج کے دربار نے اُس کو اور بھی مشتہر کر دیا اور معرفت قرابت کے لوگ جو ہنوز شہر کے باہر خانہ بدوش پڑے پھرتے تھے ، آسرا پا کر کچھ تو سنتے کے ساتھ لوٹ آئے اور کچھ لوٹنے کے سامان کرنے لگے مگر ابن الوقت عجب کُھرے ، رُوکھے ، کُھردرے ، اکھڑّ انگریزی مزاج کا آدمی تھا کہ

یوں ہے غرض .اس سے ملو جلو، ملاقات کرو، خوش گپ، خوش مزاج، خوش صحبت؛ اور حرف مطلب زبان پر آیا نہیں اور اس نے دو ٹوک، ٹکا سا جواب پتھر کی طرح منہ پر کھینچ کر مارا نہیں۔ اگر سیدھی طرح لوگوں سے کہ دیا کرتا کہ انگریزوں کو معاملے، مقدمے میں سفارش کی چڑ ہوتی ہے یا میں صاف طور پر سفارش کرتے ہوئے ڈرتا ہوں یا موقع پاؤں گا تو کلمۃ الخیر سے دریغ نہیں کروں گا تو شاید لوگ اس سے اس قدر بے دل نہ ہوتے مگر اس کا تو حال یہ تھا کہ کسی نے پٹھے پر ہاتھ رکھا اور اس نے دولتیاں جھاڑنی شروع کیں۔

اگرچہ ابن الوقت کی کج ...اراتی سے لوگوں کے دلوں میں اس کی طرف سے نفرت پیدا ہو گئی تھی مگر اپنی غرض کو ع مرا بہ خیر تو امید نیست بد مرساں، اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے اور کچھ نہیں تو اتنی ہی بات کے بہانے سے گھڑی دو گھڑی کو آ بیٹھتے کہ آپ نے تو غضب ہی کی جرآت کی، ایسی شورش میں انگریز کو میگزین سے اٹھا کر لائے اور گھر میں پناہ دی؛ منہ پر کہنا تو خوشامد ہے مگر سچ تو یہ ہے کہ رستم کو بھی مات کیا۔

دوسرا۔ خیر بہادری تو بہادری، کمال تو یہ تھا کہ ناف شہر میں مجمع مجاہدین یعنی خانقاہ کے زیر سایہ انگریز چھپا رہا اور کسی کے فرشتوں کو خبر نہ ہوئی۔

تیسرا۔ بھلا انگریزوں کی قدر دانی کو تو ذرا ملاحظہ کیجئے کہ اس جان جوکھم کے صلے میں دیا تو کیا دیا، تین ہزار کی زمینداری۔ اے جناب، یہ ملک بخش دینے کے کام ہیں؛ ہائے آج کو شاہ جہاں ہونا تھا۔

چوتھا۔ اجی ابھی کیا خبر ہے انگریزوں کے یہاں زمین کے دینے کا دستور نہیں، مگر ڈپٹی کر دیں، صدر اعلیٰ کر دیں، کابل میں سفیر یا کسی ریاست میں وزیر بنا کر بھیج دیں، جو چاہیں سو کر سکتے ہیں اور میرا دل گواہی دیتا ہے کہ کریں گے، پر کریں گے، میں آپ کو دکھا دوں گا۔

کھلی خوشامد ہوتی تو ابن الوقت بھی ایسا نرا احمق نہ تھا کہ سن کر اظہار بشاشت کرتا مگر عیّار لوگ دوشالوں میں لپیٹ لپیٹ کر جوتیاں مارتے تھے اور یہ جھانسے میں آ کر فخر کے طور پر ایک ایک کے آگے غدر کی حکایتیں بیان کرکے داد چاہتا تھا۔ جب لوگ اس کو بھرّے پر چڑھا لیتے تو باتوں ہی باتوں میں یہ بھی پوچھتے ''کیوں صاحب، پھر وہ انگریز کپڑے کیسے پہنتا تھا؟''

ابن الوقت :—جب صاحب کو ہم لاشوں میں سے اٹھا کر لائے تو ان کے کپڑے تمام خون میں لت پت تھے۔ صاحب کو اپنے تن بدن کی مطلق خبر نہیں اور اس وقت تک ہم میں سے بھی کسی کو معلوم نہیں کہ کہاں کہاں زخم لگے ہیں۔ جو کپڑے پہنے ہوئے تھے، بہتیرا چاہا کہ چیر کر الگ کر دیں مگر کپڑے اس بلا کے ڈھیٹ تھے کہ پھاڑے نہیں پھٹتے تھے۔ ہار کر قینچی سے کترے۔ جب تک صاحب ہمارے گھر رہے، یہی ہم لوگوں کی طرح کے ہندوستانی کپڑے پہنتے رہے مگر طنزاً نہیں بلکہ نصیحتاً اکثر کہا کرتے کہ افسوس ہندوستان کے لوگ عقل سے مطلق کام نہیں لیتے۔ ایک کپڑے ہم لوگ پہنتے ہیں کہ برسوں پھٹنے کا نام نہیں جانتے اور ایک کپڑے یہ ہیں کہ پہنے اور کھسکے۔ ایسے

نازک اور مہین کپڑے عورتوں کی زیب و زینت کے لئے زیادہ مناسب ھیں - مردوں کو خدا نے اسی غرض سے زیادہ توانائی دی ھے کہ ان کو محنت اور مشقت کرنی ھے - ھندوستانیوں کا لباس اُن کی کاھلی اور آسائش طلبی کی دلیل ھے - میں دیکھتا ھوں تو اس لباس میں چستی اور چالاکی باقی رہ نہیں سکتی -

ھم نشین - بھلا صاحب اُن کے کھانے کا آپ نے کیا انتظام کیا تھا ؟

ابن الوقت - انتظام کیا کرنا تھا ، جو کچھ گھر میں پکتا تھا ، صاحب بھی کھا لیا کرتے تھے ، البتہ اتنا اہتمام کرنا پڑتا تھا کہ اُن کے کھانے میں مرچ نہیں ڈالی جاتی تھی - ایک نمک دان میں پسا ھوا نمک ، دوسرے میں کالی مرچیں ان کے لئے الگ لگا رکھتے تھے - ھندوستانی کھانوں میں پلاؤ ، کباب ، سموسے ، فیرینی ، ھلکی ھلکی مٹھائیاں ، زیادہ رغبت سے کھاتے تھے -

ھم نشین - آپ نے اُن کے برتن الگ کر دیے ھوں گے -

ابن الوقت - بھائی سچی بات تو یہ ھے کہ ھم نے تو برتن بھانڈا کچھ الگ ولگ کیا نہیں - کھانا ھمارا ، برتن ھمارے ، پکانے والے ھم ، پھر الگ کرنے کی وجہ -

ھم نشین - آخر وہ تھا تو انگریز -

ابن الوقت - انگریز تھا تو ھونے دو - کھانے میں تو کوئی حرام چیز نہیں ھوتی تھی -

ابن الوقت نے اس بات کو ذرا زور سے کہا تو ھم نشین سمجھ گیا کہ میرا کہنا ناگوار طبع ھوا ؛ بے چارہ تھا ابن الغرض ، دم بخود ھو کر رہ گیا مگر اُس کے بعد سے لوگ ابن الوقت کے حقے پان سے ذرا احتراز سا کرنے لگے تھے -

فصل ششم

غدر کے بعد ابن الوقت اور نوبل صاحب کی پہلی تفصیلی ملاقات - ابن الوقت نے نوبل صاحب کے ساتھ میز پر چھری کانٹے سے کھانا کھایا

دربار کے مجمع میں نوبل صاحب نے اپنا وقت ملاقات بتا ھی دیا تھا ، دربار کے تیسرے دن ابن الوقت ٹامس صاحب کی کوٹھی پر جا موجود ھوا - کوٹھی بجائے خود ایک چھاؤنی تھی - دریافت کرنے سے معلوم ھوا کہ زرد بنگلے میں ھیں - بنگلے کا احاطہ الگ تھا - دیکھتا کیا ھے کہ احاطے کے بیرونی دروازے پر ملاقاتیوں کی سواریاں کھڑی ھیں - دروازے کے اندر چھوٹا سا مگر وسعت پیش صحن کے مناسب چمن ھے ؛ خوب صورت ، آراستہ و پیراستہ اور اتنے ھی سے چمن میں چار مالی کام کر رھے ھیں - درختوں کی شادابی ، سڑکوں کی صفائی ، روشوں کی درستی کہے دیتی ھے کہ مالی صرف نوکری کے ڈر سے نہیں بلکہ اپنے شوق سے بھی کام میں لگے لپٹے رھتے ھیں - پر ھاں کیاریوں کی قطع اور درختوں کے انتخاب سے ایک خاص سلیقہ اور مذاق ظاھر ھوتا ھے جو کسی مالی کے بس کا نہیں -

ابن الوقت اس چمن میں جا بجا رکتا ، ٹھٹکتا برآمدے تک پہنچا تو ملاقاتیوں کا ھجوم تھا ؛ بعض کرسیوں پر تھے ، بعض فرش پر اور بعض (شاید امیدوار ھوں) برآمدے کے دونوں طرف نیچے ھاتھ باندھے کھڑے تھے - نوبل صاحب کے آدمی

ابن الوقت کو جان پہچان تو چکے ہی تھے ، آتا ہوا دیکھ کر سب نے اسے کھڑے ہو کر سلام کیا اور اتنی اس کے ساتھ خصوصیت برتی کہ الگ کمرے میں لے جا کر بٹھا دیا ۔ تھوڑی دیر بعد ایک چپڑاسی نے آ کر خبر دی کہ صاحب کو آپ کی اطلاع ہو گئی ہے ۔

ابن الوقت۔ پھر صاحب نے کیا فرمایا ۔

چپڑاسی ۔ آپ نے دیکھا کتنے آدمی آپ سے پہلے کے آئے ہوئے بیٹھے ہیں ؟

ابن الوقت۔ کیا یہ سب ہو لیں گے تب میرا نمبر آئے گا ؟

چپڑاسی ۔ ان لوگوں کی ملاقات چار چار پانچ پانچ منٹ بلکہ صاحب نے آپ کا آنا تو سن ہی لیا ہے ، لوگوں کو جلد جلد رخصت کریں گے ۔ کیا کہیں صاحب ، ہمارے صاحب کا مزاج اسی طرح کا ہے کہ کوئی آ کھڑا ہو تو اس کو جواب نہیں دیتے ۔ ملنے کے تو بڑے دھنی ہیں اور اسی وجہ سے ہم لوگوں کو چھٹی نہیں ملتی ، نہیں تو اب تک کبھی کے آپ کے سلام کو حاضر ہوئے ہوتے ۔ اتوار کو ضرور سارے شاگرد پیشہ حاضر ہوں گے ، سب لوگ بڑی آس لگا رہے ہیں ۔

ادھر نوبل صاحب اپنی جگہ ابن الوقت کے خیال سے واقع میں دو ہی دو باتیں کر کے لوگوں کو اوپر تلے ٹال رہے تھے ، پھر بھی ابن الوقت کو آدھ گھنٹے کے قریب انتظار کرنا ہی پڑا ۔ اس کی ملاقات نوبل صاحب کے ساتھ ایسی حالت میں شروع ہوئی کہ نوبل صاحب کی اس وقت کچھ ہستی ہی نہ تھی ۔ اس کے بعد سے جب نوبل صاحب ملے ، منصبی اور قومی تعزز ہر حال میں ان کے ساتھ تھا ۔ خواجہ باقی باللہ کی سڑک پر جب کہ ابن الوقت بیگار میں پکڑا ہوا ایک گٹھڑ

اٹھانے کو تھا نوبل صاحب کو اُس نے دیکھا کئی انگریزوں کے ساتھ عربی گھوڑے پر سوار؛ پھر دربار میں دیکھا تو دربار کا اہتمام کرتے ہوئے انگریزوں میں پیش پیش، پھر آج اپنے بنگلے پر کہ ملاقاتیوں کی سواریاں دروازے پر کھڑی ہیں اور شہر کے بیسیوں رئیس سلام کے منتظر حاضر؛ شاگرد پیشہ لوگوں کی یہ کثرت کہ احاطہ بجائے خود ایک چھوٹا سا محلہ معلوم ہوتا ہے۔ ہر قسم کی متعدد سواریاں احاطے کے اس سرے سے اُس سرے تک بھری پڑی ہیں۔ بنگلے کے تمام کمرے فرش، پردہ چلمن، میز کرسی، شیشہ، آلات اور آرائش اور آسائش کے سامان سے سجے ہوئے ہیں۔ ابھی چند دن ہوئے کہ غدر کے دنوں میں اس کوٹھی کے کسی کمرے کی چھت تک باقی نہ تھی یا اب دو ہی مہینے میں «الحکومت نصف الکرامت» نئے سرے سے مکان بھی بن گیا، رنگ بھی پھر گیا، ہر طرح کا سامان بھی مہیا ہو گیا، باغ بھی لگ گیا یعنی جہاں کچھ نہ تھا وہاں سب کچھ ہو گیا۔ چار چپڑاسی اور پانچواں جمعدار، اتنے آدمی صاحب کے کمرے سے ایک کمرہ چھوڑ کر دروازے سے لگے بیٹھے ہیں؛ اندر سے ذرا سی آواز آئی اور دوڑے یا

نوبل صاحب کی یہ شان اگرچہ ابن الوقت کو پہلے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا مگر اس بات کا اُس کو حق الیقین تھا کہ ایک غدر نہیں ایسے ایسے ہزار غدر کیوں نہ ہوں انگریزی عملداری جانے والی نہیں بلکہ غدر کے بعد جو تسلط بیٹھے گا پہلے سے زیادہ مستحکم اور پائدار ہوگا۔ وہ خوب سمجھے ہوئے تھا کہ اگر اس وقت اتفاق سے کوئی انگریز بلکہ کوئی کرانی بھی نوبل صاحب کی طرح کہیں بھیگی بلی بنا ہوا بیٹھا ہے، وہ حقیقت میں شیر ببر ہے؛ فی الحال گردوغبار ہے اور

۱

به اعتبار مال سوار۔ مگر ابن‌الوقت کی خودداری ایسی بڑھی ہوئی تھی کہ نہ تو اُس نے اس بات کا خیال کیا کہ جو لوگ عزت میں، مقدرت میں اور شاید سرکاری خیر خواہی میں بھی اُس پر ہر طرح کی ترجیح رکھتے ہیں، برآمدے میں بٹھائے گئے ہیں اور یہ کمرے میں اور نہ اس پر نظر کی کہ جو لوگ آنے میں اس سے اقدم ہیں از روئے انصاف ان کو ملاقات میں بھی اقدم ہونا چاہئے۔ آدھ ہی گھنٹے کے انتظار میں یہ ایسا اُکتایا کہ بار بار چپڑاسیوں سے ترش روی کے ساتھ پوچھتا تھا کہ اب کتنے آدمی اور ہیں؟ کہیں تم نے میری اطلاع میں یا صاحب نے سمجھنے میں تو غلطی نہیں کی؟ اُس کو اپنے زعم میں منتظر بٹھائے جانے سے خجالت تھی اور وہ اُس خجالت کے ٹالنے کو کمرے میں ٹہلتا اور کتابوں اور تصویروں اور دوسری چیزوں کو اُٹھا کر جگہ سے ہٹا کر دیکھتا۔ اگرچہ اس نے کسی چیز کو بے ٹھکانے نہیں کیا مگر چپڑاسی اُس کی یہ آزادی دیکھ کر دل میں بہت ناخوش تھے اور دور ہٹ کر چپکے چپکے آپس میں کہتے تھے یہ بھی عجب آدمی ہے کہ ایک دم اس سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا؛ اس کو کمرے میں بٹھانا ہی نہیں تھا۔

جمعدار۔ میاں ہوش کی بنواؤ، تمھیں خبر بھی ہے کہ یہ کون ہیں۔ غدر میں صاحب انھیں کے گھر میں تھے۔ ان کو برآمدے میں بٹھا دیتا اور صاحب کی نظر پڑ جاتی تو سب کی شامت آ جاتی۔

چپڑاسی۔ اجی جمعدار خیرخواہی کی تو ہماری سرآنکھوں پر، پر سرکار دربار کا کچھ ادب بھی ہے یا نہیں۔ حاکم کی ڈیوڑھی پر امیر، رئیس، راجہ، بابو، نواب، زمیندار سبھی

آتے ہیں؛ اندر جا کر چاہئے صاحب کی گود میں بیٹھتے ہوں،
پر باہر تو ہم نے سب کا ایک ہی قاعدہ دیکھا، ہاتھ باندھے،
سر جھکائے چپ چاپ۔ کل تم نے لوہارو والے نواب کی طرف
خیال نہ کیا ہوگا۔ صاحب کو غسل خانے میں دیر لگی تو اسی
کمرے میں تھے۔ کھانسی اٹھی تو آواز کی گونج کے ڈر کے
مارے کھڑکی کے باہر منہ نکال کر اور رومال رکھ کر
کھانسے اور میں نے اگال دان لانے کو پوچھا تو اشارے سے
منع کر دیا۔

جمعدار۔ کیا مضائقہ ہے ان کو صاحب لوگوں سے ملنے
جلنے کا اتفاق نہ پڑا ہوگا۔

چپڑاسی۔ میں تو انعام لینے جاؤں گا تو ضرور اتنی بات ان
کے کان میں ڈال دوں گا۔

جمعدار۔ نہیں جی تمھیں کیا پڑی۔

چپڑاسی۔ مجھے پڑی یہ کہ اب ان سے صاحب سے ٹھہری
خصوصیت۔ ان کا روز کا نہیں تو تیسرے چوتھے دن کا بھیرا
ضرور ہوا کرے گا اور ہمارے صاحب کے پاس باہر کے ایک دو
صاحب لوگ ہمیشہ ٹھہرے ہی رہتے ہیں۔ بعضا انگریز ایسا
بد مزاج ہوتا ہے کہ کالے آدمی کی صورت سے جلتا ہے؛ وہ
اگر ایسی بے تمیزی دیکھ پائے تو ڈُک سے یا بوٹ کی ٹھوکر
سے خبر لے، انھیں کی نہیں بلکہ ہم لوگوں کی بھی۔

اتنے میں نوبل صاحب کے باہر نکلنے کی آہٹ سی معلوم
ہوئی، سارے چپڑاسی اور جس قدر لوگ ملاقات سے رہ گئے
تھے؛ سب کے سب ایک دم سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جو
شخص صاحب کے ساتھ ساتھ باتیں کرتے ہوئے اندر سے آئے
تھے وہ دروازے سے سلام کر کے رخصت ہوئے۔ باقیوں کو

صاحب سلامت کے بعد صاحب نے رخصت کر دیا کہ آج دیر بہت ہو گئی اور خود ابن الوقت کے کمرے میں چلے گئے۔

پہلی بات جو صاحب نے ابن الوقت سے کہی یہ تھی کہ میں افسوس کرتا ہوں کہ آپ کو اتنی دیر انتظار کرنا پڑا؛ آپ کے شہر میں مخبری کا بازار اس قدر گرم ہو رہا ہے کہ جس نے کچھ نہیں کیا وہ بھی خوف کے مارے پریشان ہے کہ دیکھئے کوئی کیا جا کر لگا دے اور حکام کی نظر ہے سخت، اس سے لوگ اور بھی ہراساں ہیں۔ ابن الوقت کچھ کہنا چاہتا تھا کہ صاحب بول اٹھے "مجھ کو آپ سے بہت دیر تک باتیں کرنی ہیں اور کھانا بھی میز پر رکھا جا چکا ہے، چلئے کھاتے بھی جائیں اور باتیں بھی کرتے جائیں۔"

ابن الوقت ۔ میں کچھ وقت کا ایسا پابند نہیں ہوں۔ آپ کھائیے، میں گھر جا کر کھا لوں گا اور ابھی کچھ ایسا نا وقت بھی نہیں ہوا۔

نوبل صاحب ۔ (مسکرا کر ابن الوقت کے ساتھ کھانے کے کمرے کی طرف کو چلتے ہوئے) کیوں، کیا آپ کو میرے ساتھ کھانے میں کچھ احتراز ہے ؟ میں وہی نوبل ہوں کہ میں نے اور آپ نے مہینوں ایک جگہ کھانا کھایا ہے اور آپ کو بخوبی معلوم ہے کہ میں اس وقت بھی ایسا ہی عیسائی تھا جیسا غدر سے پہلے اور جیسا اب ہوں اور جیسا خدا نے چاہا اس کی مدد سے مرتے دم تک رہوں گا۔

ابن الوقت ۔ نہیں مجھ کو اپنی ذات سے تو اعتراض یا احتراز کچھ بھی نہیں مگر لوگ اس کو برا سمجھتے

ہیں۔

نوبل صاحب۔ مگر آپ بھی اس میں کچھ برائی پاتے ہیں یا نہیں؟

ابن الوقت۔ نہیں میں تو ہرگز کسی طرح کی کوئی برائی نہیں پاتا۔

نوبل صاحب۔ ہندوستان کو جس کمزوری نے تباہ کیا اصل میں وہ یہی کمزوری ہے۔ خدا نے جیسی اُن کی طبیعتیں بودی اور محکوم بنائی تھیں، ویسے ہی یہ لوگ سدا سے بودے اور محکوم رہتے چلے آئے اور جب تک یہ کمزوری ان کی طبیعتوں میں ہے آگے کو بھی ضرور بودے اور محکوم رہیں گے۔

ابن الوقت کو پہلے ہی سے انگریزوں کی طرف رجحان تھا۔ اُونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ، نوبل صاحب کا اشارہ پاتے ہی مقابل کی ایک کرسی پر ڈٹ ہی تو گیا اور یہ عیسائیت کا نہیں بلکہ اس کی انگریزیت کا گویا اصطباغ تھا۔ حسن اتفاق سے اُس وقت میز پر کوئی انگریز نہ تھا۔ یوں تو کئی صاحب اُن کی کوٹھی میں ٹھہر رہے تھے مگر سب کے سب مل کر شکار کھیلنے چلے گئے تھے اور بہت بہتر ہوا کہ نوبل صاحب اکیلے تھے ورنہ آج ابن الوقت کی خوب ہی ہنسی اُڑی ہوتی۔ اُس نے ناواقفیت کی وجہ سے کھانے میں ایسی بے تمیزیاں کیں کہ وہ تو نوبل صاحب ہی جیسا متین آدمی تھا کہ نہ تو اُس کو ہنسی آئی اور نہ اُس نے کچھ برا مانا۔ ہنسنے کو کھانا کھلانے والے خدمتگار کیا کم تھے مگر نوبل صاحب کے ڈر کے مارے کسی کی مجال نہ تھی کہ مسکرا بھی لیتا، ہنسنا تو بڑی بات ہے۔ ابن الوقت کی بے جا حرکتیں دیکھتے اور دوسرے کی طرف کن انکھیوں سے نظر کر کے رہ جاتے؛ پر اپنی جگہ

جا کر تو مارے ھنسی کے ضرور لَوٹ لَوٹ گئے ھوں گے ۔ اُس نے بے تمیزی سی بے تمیزی کی ۔ داھنے ھاتھ میں کانٹا لیا تو بائیں میں چھری ۔ پھرنوبل صاحب کے بتانے سے کانٹا بائیں میں لیا تو چھری کو اس زور سے کانٹے پر ریت دیا کہ چھری کی ساری باڑ جھڑ پڑی ۔ خدمتگار نے میز پر سے دوسری چھری اُٹھا کر دی ۔ شاید آلو ھی تھا کہ اُس کو کاٹنے لگا تو اُچھل کر بڑی خیر ھوگئی کہ ٹیبل کلاتھ (دستر خوان) پر گرا ۔ پھر جب کسی چیز کو کانٹے میں پرو کر منه میں لے جانا چاھتا ھمیشه نشانه خطا کرتا اور جب تک باری باری سے ناک اور ٹھوڑی اور کلّے یعنی تمام چہرے کو داغ دار نہیں کرلیتا کوئی لقمه منه میں نہیں لے جا سکتا ۔ اس دن کھانے کے بعد کوئی اس کا منه دیکھتا تو ضرور یہی پھبتی کہتا کہ چہرہ ھے یا دیوالی کی کلھیا ھے ۔ اُس نے کہا تو نہیں مگر اُس کی سسکی سے کئی دفعه ایسا بھی شبه ھوا کہ ھونٹوں میں یا مسوڑھوں میں یا زبان میں کہیں نه کہیں کانٹا چبھا ضرور ۔ پھر اول مرتبه خدمت گار جھوٹی رکابی سامنے سے اُٹھانے لگا تو اُس نے سمجھا کہ بس دسترخوان بڑھانا چاھتا ھے ؛ کچھ کہنے ھی کو تھا ، خدمتگار تھا سلیقه مند ، سمجھ گیا اور یه کہ کر رکابی آگے سے کھینچ چلتا ھوا کہ دوسری صاف پلیٹ لاتا ھوں ۔ تمام کھانے میں کوئی چھ یا سات رکابیاں بدلی گئیں مگر اس بندۂ خدا نے چھری کانٹا ھاتھ سے نه چھوڑا ، جب تک خدمت گار نے منه پھوڑ پھوڑ کر نہیں مانگا ۔ جب خدمت گار پہلی قعب اُس کے برابر لایا تو اُس نے دونوں کنارے پکڑ ساری قعب اُس کے ھاتھ سے لے چمچے سمیت اپنے آگے رکھ لی ۔ خدمت گار نے کان میں جھک کر کہا کہ اس میں سے جتنا آپ کو درکار ھو چمچے سے اپنے

سامنے کی رکابی میں لے لیجئے - پڈنگ* کانٹے سے کھانے کی تھی اس کو جو لگی مزے کی ، چمچے سے ھڑپ اور اس پر مزہ یہ کہ ذرا سی اور دینا - اخیر میں سب سے زیادہ بیہودہ بے تمیزی جو کی یہ تھی کہ فنگر گلاس† کا پانی اٹھا پی لیا -

ابن الوقت کی بعض حرکتیں حقیقت میں سخت بے جا تھیں مگر واہ رے شرافت ، نوبل صاحب شروع سے آخر تک گردن جھکائے بیٹھے رہے ، گویا کچھ خبر ھی نہیں - مگر نیچی نگاھوں سے سب کچھ دیکھ رہے تھے اور دل میں ضرور پشیمان ھوئے ھوں گے کہ میں نے ناحق اس کو کھانے میں شریک کیا - ان کی پشیمانی اس خیال سے ان کو ضرور ایذا دہ ھوئی ھوگی کہ ایسی خصوصیت پر کیوں کر ھوسکتا تھا کہ عین وقت پر کھانے کی تواضع نہ کرتا - تواضع کا کرنا تو مناسب بلکہ واجب تھا اور اب تواضع کی تو آگے کو ایک راستہ کھلا اور بھلے کو آج کوئی انگریز کھانے میں شریک نہ تھا اور ھوتا تو ساری عمر ان کی بے تمیزیوں کی نقلیں کر کر کے مجھ کو چھیڑا کرتا - ضرور نوبل صاحب جب تک میز پر رہے اسی فکر میں تھے کہ انھوں نے ابن الوقت کے ساتھ مطلق کسی قسم کی بات نہیں کی ورنہ نوبل صاحب کی میز کے چہچہے تمام چھاؤنی میں مشہور تھے -

خیر کھانے کے بعد نوبل صاحب نے ایک خدمت گار کو اشارہ کیا کہ آپ کو غسل خانے میں لے جا کر ھاتھ دھلواؤ - وھاں سامنے سنگھار میز پر قد آدم آئینہ لگا تھا ، ابن الوقت نے جاتے ھی اپنا عکس دیکھا تو بے ساختہ انشاء اللہ خاں کا وہ

---

* انگریزی فیرینی -

† ھاتھ دھونے کا پیالہ -

مقولہ یاد آ گیا ۔ ع

ڈاڑھی کو لگا شیخ کی اب بزرقطونا اور بجنے لگی گت

بارے ہاتھ منہ دھو آدمیوں کی جون میں آ کر پھر نوبل صاحب پاس آئے ۔ نہ جاننا بھی عجب مزے کی بات ہے ۔ ابن الوقت کو اتنا بھی تو تنبُّہ نہ ہوا کہ معذرت کرتا ۔ نوبل صاحب نے تو اپنے لئے پائپ روشن کرلیا تھا ۔ ابن الوقت کی طرف کو سگرٹ کا بکس سرکا دیا کہ اس میں جو تماکو ہے روم کے علاقے میں پیدا ہوتا ہے اور چرٹ کے مقابلے میں بہت ہلکا ہے؛ آپ بے تامل پیجئے اور جب آپ چند روز اس کی عادت کیجئے گا تو میں یقین کرتا ہوں کہ اس کے سامنے آپ حقے کو منہ بھی نہ لگائیں گے ۔ میں صبح و شام اور کھانے کے بعد تو پائپ پیتا ہوں اور باقی اوقات یہی سگرٹ ۔ ابن الوقت گڑ کھا چکا تھا تو گلگلوں سے کاہے کا پرہیز ۔ دیا سلائی سلگا ، لگا انجن کی طرح بَھق بَھق منہ سے دھواں نکالنے ۔ اب نوبل صاحب نے اپنی باتوں کا سلسلہ شروع کیا کہ "جس روز آپ سے خواجہ باقی باﷲ میں ملاقات ہوئی ، اُس کے بعد سے میں برابر دلّی کے باہر باہر رہا ۔ اسی اثنا میں ایک بار صاحب چیف کمشنر بہادر نے کرنال میں مجھے بلوا بھیجا ۔ تا بہ دیر غدر کے حالات استفسار فرماتے رہے اور اسی کے ضمن میں آپ کا بھی ذکر آیا ۔ مجھ کو اس بات کے جاننے سے سخت حیرت ہوئی کہ چیف صاحب کو آپ کے ذاتی اور خانگی حالات مجھ سے بھی زیادہ معلوم ہیں ۔ وہ آپ کے دور و نزدیک ایک ایک رشتہ دار سے واقف ہیں اور جو جو حرکتیں ان لوگوں سے غدر میں سرزد ہوئی ہیں اُن کے پاس تاریخ وار ، نام وار سب کی تحریری یادداشت موجود ہے ۔

مجاهدین کا گھروں میں ٹھہرانا ، اُن کے لئے چندے جمع کرنا ، روپے سے ، هتھیاروں سے ، کھانے کپڑے سے ، اُن کی مدد کرنا ، مجاهدین کے ساتھ جا جا کر دمدمے بنوانا اور دھاووں میں اُن کا ساتھ دینا ، سرکاری میگزین کے هتھیاروں اور سرکاری کالج کی کتابوں کا لُوٹنا ، انگریزی عمارتوں کا ڈھانا ، انگریزوں کے مارے جانے کا تماشا دیکھنا ، لوگوں کو بغاوت کی ترغیب دینا ، نمازیں پڑھ پڑھ کر علی الاعلان انگریزی عملداری کے غارت ہونے کی دعائیں مانگنا اور اس کے لئے وظیفے اور ختم پڑھنا اور کیا کرنا اور کیا کرنا ، سارے پتے کی باتیں (خدا جانے کس بھیدی نے اُن کو بتائی هیں) اُن پر منکشف هیں۔ جہاد کے اصل مہری فتوے ، لوگوں کے خانگی خطوط اور تمام شاهی دفتر اُن کے پاس هے۔ غرض سب کے هاتھ کٹے هوئے هیں۔ مجھ کو تو ایسا نظر آتا هے کہ دلّی کے مسلمانوں میں سے شاذ نادر کوئی متنفس الزام بغاوت سے بچ جائے تو بچ جائے ورنہ روداد بہت ٹیڑھی هے"۔

ابن الوقت ۔ آپ نے کہیں میرے روزنامچے کا تو کچھ تذکرہ نہیں کردیا ۔

نوبل صاحب ۔ آپ نے اُن سب تحریرات کو دیکھا هوتا جو میں نے دیکھی هیں تو آپ خود سمجھ لیتے کہ آپ کے روزنامچے کا نام لینا نہ صرف فضول و لاحاصل تھا بلکہ دلیل حماقت۔ اجی حضرت ، نہیں معلوم ایسے ایسے کتنے روزنامچے سرکار میں پیش هیں اور نہیں معلوم کتنے آدمی روزنامچہ نویسی کے کام پر مامور تھے ۔

ابن الوقت ۔ تو یہ دربار اور اشتہار اور قول وقرار سب لغو۔

نوبل صاحب - نہیں نہیں - غدر و بغاوت کچھ لڑکوں کا کھیل تو تھا نہیں ، اس کا ضروری اور لازمی نتیجہ هندوستان کے کے حق میں نہایت هی زبون تھا - ملکۂ معظمه اور گورنر جنرل نے حقیقت میں بڑا هی تحمل کیا ورنه عام انگریز تو ابھی تک اس قدر غیظ و غضب میں بھرے هوئے هیں که اگر انگریز کے ایک قطرۂ خون کے عوض هندوستانیوں کے خون کی ندیاں بہا دی جائیں تو بھی اُن کی پیاس نه بجھے ، مگر کیا کریں کچھ بس نہیں چلتا - شاهی حکم سے لاچار هیں ، نہیں تو سارے شہر کو ڈھا کر مسمار کردیتے که چند روز بعد کوئی اتنا بھی نه پہچان سکتا که دلّی کہاں بستی تھی - یه اُسی اشتہار کا اثر ھے که جب تک شہر پناہ کے اندر لڑائی هوتی رهی یا لڑائی کے دو تین دن بعد تک جو هونا تھا سو هو لیا ، اب جان اور مال دونوں محفوظ هیں - ھے کیا که دلّی کے مسلمان سرکار کی نظر میں عموماً مشتبه ٹھہر چکے - اب براءت کا بار ثبوت اُنھیں پر ھے - براءت ثابت کریں اور مزے سے اپنے گھروں میں آباد هوں -

ابن الوقت - مجھ کو دوسروں کا حال تو معلوم نہیں مگر همارے خاندان پر بیٹھے بٹھائے تباهی آئی - کم بخت اچھی خاصی طرح شہر سے اپنا منه کالا کر گئے تھے - میری خیر خواهی کی خبر سن کر بے بُلائے پھر آ موجود هوئے - دلّی اور اس کے اطراف میں بڑی سختی ھے اور جو لوگ دور نکل گئے هیں پھر بھی امن میں هیں - بلا سے میں تو اُن لوگوں سے که دوں گا که پھر کہیں کو نکل جائیں - سرکار کو اتنا خیال نہیں که متوسّلان شاهی اور عام رعایائے انگریزی کی حالت میں بڑا فرق ھے - متوسّلان شاهی پر سرکار انگریزی کے ایسے کیا حقوق تھے که

ان سے وفاداری اور خیر خواہی کی توقع کی جائے؛ پھر قلعہ کیا برباد ہوا قلعے کے ساتھ سارے شاہی نمک خوار بے موت مر گئے۔ یہ سزا کیا کم ہے کہ اُن سے دوسرے مواخذے کئے جائیں۔

نوبل صاحب۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میں نے آپ کے عزیزوں کی طرف سے یہی حجت پیش کی تھی اور بڑے شکر کی جگہ ہے کہ بڑے بڑے عہدہ دار سب ٹھنڈے ہیں۔ چیف صاحب نے میری باتیں سن کر بالکل میری رائے سے اتفاق کیا اور فرمانے لگے کہ گورنمنٹ ہند کے حکم سے تحقیقات بغاوت کا ایک جداگانہ محکمہ قائم کرنا منظور ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ قسمت دہلی کے لئے تم کو اس محکمے کا کمشنر مقرر کروں، کیونکہ تمہاری رائے بالکل گورنمنٹ کے منشا کے مطابق ہے۔ میں کیا عذر کر سکتا تھا۔ چیف صاحب کا حکم میں نے سر آنکھوں پر رکھا اور اگلے مہینے کی پہلی تاریخ سے میں اپنا کام شروع کر دوں گا۔

ابن الوقت۔ بس آپ نے یہ خوشی کی خبر سنائی اور دلّی کے مسلمان اگر میری طرح آپ سے واقف ہوں تو اُن کو گھروں میں گھی کے چراغ جلانے چاہئیں ورنہ گورنمنٹ کے حکم احکام دھرے ہی رہتے اور حکّام اضلاع اپنے ذاتی غیظ و غضب سے آفت توڑ مارتے۔

نوبل صاحب۔ عام انگریزوں کے غصے کا یہ حال ہے کہ ایک مجمع میں آپ کی خیرخواہی کا ذکر تھا تو جتنے تھے سب کے سب مخاصانہ اشتباہات کرنے لگے کہ ایک شخص جس کو تم سے بلکہ سرکار انگریزی سے کسی طرح کا تعلق نہیں اور جس کے خاندان میں مذہبی تعصب اس شدومد کے ساتھ ظاہر ہو، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نے تم کو کیوں پناہ دی؛

ایسے خاندان کا آدمی سچا خیر خواہ ہو نہیں سکتا ۔ پھر ہم دیکھتے ہیں تو اُس نے تمھاری پناہ دہی پر بھی سرکار انگریزی سے کسی طرح کا تعلق پیدا کرنا نہیں چاہا ۔ آپ تو کیمپ میں کیا جاتا اُس نے نہ تو کوئی عرضی بھیجی ، نہ کوئی اپنا آدمی روانہ کیا اور تمھاری پناہ دہی کے سوائے اُس نے اور کوئی کام خیر خواہی کا کیا نہیں ، پس ضرور دال میں کچھ کالا ہے ۔ ہم تو ایسا سمجھتے ہیں کہ اُس نے تم کو شاید اس غرض سے زندہ رکھا کہ اُس کو سرکار انگریزی پر زیادہ دباؤ ڈالنے کا موقع ملے اور اگر دلّی فتح نہ ہوتی تو وہ ضرور تم کو بے رحمی کے ساتھ مار ڈالتا ۔ پس جن لوگوں کی نظر میں خیر خواہی کی یہ وقعت ہو اُن کی سختی کا کیا ٹھکانا ہے اور رعایا کو ایسے حکّام سے کیا فلاح کی اُمید ہو سکتی ہے ۔

ابن الوقت ۔ یہ سچ ہے کہ میں نے سرکار انگریزی کی خیر خواہی کی نظر سے آپ کو ہرگز پناہ نہیں دی ۔ سوائے اس کے کہ میں نے چند سال تک سرکاری کالج میں پڑھا تھا اور کسی طرح کا تعلق مجھ کو بلکہ ہمارے خاندان میں سے کسی کو کبھی سرکار انگریزی سے نہیں رہا ۔ ہم لوگ پشت ہا پشت سے شاہ دہلی کے نمک خوار رہے ہیں ۔ میں نے اپنے پندار میں آپ کی پناہ دہی سے فرض انسانیت ادا کیا ہے اور بس ۔ میں نے اُس خدمت کی عوض میں سرکار سے کسی صلے یا انعام کی درخواست نہیں کی اور نہ مجھ کو اس کا استحقاق یا دعویٰ ہے ۔ میں نے اگر کچھ سلوک کیا (اگرچہ سلوک کا نام لیتے ہوئے مجھ کو شرم آتی ہے) تو آپ کی ذات سے کیا اور آپ نے اضعافاً مضاعفۃً مجھ کو اس کا عوض دیا ۔ میرا پچاس روپیہ بھی آپ پر خرچ نہ ہوا ہوگا ، آپ نے مجھ کو ہزار کا بندھا ہوا توڑا پکڑا

دیا ۔ میں نے آپ کے میگزین سے لانے اور رکھنے اور بو علی شاہ کے تکیے تک پہنچا دینے میں ہرگز وہ بلکہ اُس کی آدھی تہائی زحمت بھی نہیں اُٹھائی جو آپ نے مجھ کو اور میرے خاندان کے لوگوں کو خواجہ باقی باللہ سے لانے میں ۔ آپ نے ہم لوگوں کو بیگار کی بے حرمتی سے بچا لینے میں جو احسان کیا میں اپنے تمام خدمات کی اُس ایک احسان کے مقابلے میں کچھ بھی حقیقت نہیں سمجھتا ۔ غرض آپ نے اپنے ذاتی احسانات اس قدر مجھ پر لاد دئے ہیں کہ اگر شریف ہوں تو ساری عمر کو میری گردن آپ کے سامنے خَم رہے گی اور یہ زمینداری جو بے استحقاق محض مجھ کو سرکار نے دی ہے، یہ بھی آپ ہی کا طفیل ہے ۔

نوبل صاحب ۔ آپ میں اور مجھ میں بہت بڑا فرق ہے ۔ آپ نے بے غرضانہ ، جوکھوں اُٹھا کر مجھ کو پناہ دی مگرخیر «حساب دوستاں در دل» آئیے کچھ ضروری باتیں کریں ۔ کھیرکا پور جو آپ کو انعام میں ملا ہے، میرا دیکھا ہوا ہے ۔ میں گوڑ گانوہ کے صاحب کلکٹر کے ساتھ کئی بار وہاں شکار کو گیا ہوں ۔ گاؤں میں تھوڑا سا رمنہ اور ایک بہت بڑا تالاب ہے ۔ گیہوں ، چاول نیشکر ، روئی ، نیل سب طرح کی عمدہ پیداوار وہاں بہ کثرت ہوتی ہے ۔ جب وہاں میرے جانے کا اتفاق ہوا نادان سنگھ جس کا یہ گاؤں ہے ، مجھ سے ملا ، اچھی شان سے رہتا تھا ۔ اُس کے رہنے کی گڑھی بجائے خود چھوٹا سا قلعہ ہے ۔ نادان سنگھ کو گھوڑیوں اور بھینسوں کا بہت شوق تھا ۔ ہزار ہزار روپے کی گھوڑی اُس کی سواری میں رہتی تھی ۔ غرض نادان سنگھ گوڑ گانوہ کے بڑے خوش حال زمینداروں میں تھا ۔ یوں تو اُس کے پاس اور بھی گاؤں تھے مگر اُسی کا مقولہ تھا کہ بھگوان نے کھیرکا پور کی دھرتی بڑی اُبجاؤ کی ہے اور اُس نے

کھیرکاپور کی آبادی میں اپنی پونجی اور عمر اور آسائش کو بے دریغ خرچ کیا ہے اور وہ اسی ایک گاؤں کی آمدنی سے چھوٹا سا راجہ بنا ہوا تھا۔ خیر فرض کیا جائے کہ جس قدر محاصل لوگ بیان کرتے تھے اس میں مبالغہ ہو اور لوگوں کا دستور بھی ہے کہ دوسرے کی آمدنی کے جانچنے میں سخی بن جاتے ہیں اور خرچ کے اندازہ کرنے میں بخیل مگر عموماً ضلع گوڑگانوہ کے بندوبست سے وہاں کے زمیندار اس قدر رضامند ہیں کہ جس گاؤں کی جمع سنگین ہے اس میں بھی بعد وضع مصارف بقدر جمع سرکار منافع ہے تو اس حساب سے بھی آپ کی اکسٹرا اسسٹنٹی کی تنخواہ کہیں نہیں گئی۔ میں نے اس گاؤں کے انتخاب میں دو باتوں کا لحاظ کیا۔ اول تو قرب دھلی دوم اس گاؤں کے رقبے میں سے ہو کر ریل نکلنے والی ہے اور ریل کی وجہ سے گاؤں کی حیثیت کی ضرور ترقی ہو گی۔ میں نے آپ کے لئے نوکری کے حاصل کرنے میں جان بوجھ کر خود کوشش نہیں کی، اس لئے کہ میں نے عزت طلب ہندوستانیوں کو اکثر انگریزوں کی مدارات کا شاکی پایا اور اگر آپ نوکری کی خواهش کریں گے تو میں ہر وقت کوشش کرنے کو موجود ہوں۔

ابن الوقت ۔ میں آپ سے بار بار عرض کرچکا ہوں کہ ہم لوگ پشت ها پشت سے شاھی سرکاروں کے متوسّل ہیں۔ ان سرکاروں کی مدارات کا یہ رنگ تھا کہ چھوٹی بڑی کل خدمتیں موروثی؛ یہ کتنے بڑے اطمینان کی بات تھی کہ سارے ملازم نہ صرف اپنی بلکہ اولاد کی معاش سے بھی بے فکر تھے۔ میں واقعات کے طور پر ان سرکاروں کے دستور اور قاعدے آپ سے بیان کرتا ہوں، آپ ان کو درست نا درست، واجب ناواجب

جو چاهیں سمجھیں؛ جرمانے، معطلی، موقوف کا نام بھی سارے قلعے میں کبھی کسی نے نہیں سنا، داد دهش انعام اکرام کی کوئی حد نہ تھی، تیمور کی نسل نے کبھی روپے کو روپیہ سمجھا هی نہیں۔ شاهی تنخواهیں اولاد اور اولاد کی اولاد پر تقسیم هوتے هوتے بعض کے حصے میں صرف پیسے رہ گئے تھے اور وہ بھی دو دو ڈھائی ڈھائی برس میں ملی تو ملی، ورنہ اکثر تنخواهیں محض برائے نام تبرک کی طرح۔ صرف سرکار کی داد دهش پر نوکروں کا گزر تھا مگر وہ پیسے لوگوں کو ایسے عزیز تھے کہ مفتی صدرالدین خاں صدرالصدور دهلی کی نقل مشہور ہے کہ قلعے سے ڈھائی یا تین روپے ان کی تنخواہ کے بھی تھے۔ خواجہ محبوب علی خاں نے تخفیف کا قلم جاری کیا تو مفتی صاحب کا نام بھی زمرۂ ملازمان شاهی سے کاٹ دیا۔

مفتی صاحب تو مفتی صاحب، ایسے تین تین روپلّی کی آن کے خدمت‌گاروں کو بھی پرواہ نہ تھی مگر مفتی صاحب نے جب سنا تو دهائی دیتے هوئے حضور تک پہنچے اور آخر اپنی تنخواہ بحال کرا کے ٹلے۔ غرض قلعے کی سرکاروں کا برتاؤ نوکروں کے ساتھ ایسا تھا جیسے ماں باپ کا اپنے بال بچوں کے ساتھ۔ تو صاحب میں تو ایسی سرکاروں میں رہا هوں اور میں خود اپنے تئیں انگریزی نوکری کے قابل نہیں سمجھتا۔ میرے نسبتی بھائی ڈپٹی هیں۔ برس دن هوا رخصت لے کر انهیں دنوں حج کو گئے اب آج کل میں آنے والے هیں۔ مزاج کے هیں تیز، کسی حاکم سے آن کی نہیں بنتی اور برس میں دو دو بار نہیں تو بے چارے هر برس ضرور بدلتے رہتے هیں۔ وہ کبھی آ نکلتے هیں اور اپنے حالات بیان کیا کرتے هیں، آن سے میں قیاس کرتا هوں کہ واقع میں ایک دن بھی مجھ جیسے آدمی کا انگریزی دربار میں گزر هونا مشکل ہے۔

فصل هفتم

ایک ڈپٹی کلکٹر انگریزوں کی مدارات کا شاکی

میں نے اپنے ان بھائی صاحب سے ایک دن پوچھا تھا کہ کہیے کچھ آپ نے سرمایہ بھی جمع کیا تو کہنے لگے ''اجی اللہ اللہ کرو، کیسا سرمایہ، خدا جانے کیسے کتر بیونت کرتا ہوں کہ قرض نہ لینا پڑے۔ مجھ کو تو آئے دن کی بدلی اُدھیڑے ڈالتی ہے، ورنہ خدا کا فضل ہے میری تنخواہ خرچ کو کافی ہے بلکہ کچھ پس انداز ہو رہتا ہے''۔

میں۔ حقیقت میں آپ کو برس دن بھی کہیں جم کر رہنا نصیب نہیں ہوتا، آخر اس کا سبب کیا ہے؟ اور بھی تو ڈپٹی ہیں «قطب از جا نہ جنبد»؛ برسوں سے ایک جگہ جمے بیٹھے ہیں۔

بھائی صاحب۔ خدا جانے صاحب لوگ کیا کمال کرتے ہیں۔ میں ہر چند کوشش کرتا ہوں کہ حکّام کو راضی رکھوں مگر کچھ ایسی تقدیر کی گردش ہے کہ خواہی نخواہی ناچاقی ہو ہی جاتی ہے اور بار بار کی بدلی نے مجھے اور بھی بدنام کر رکھا ہے۔ لوگ میرا نام سن کر پکار اُٹھتے ہیں، «اجی وہ لڑاکو ڈپٹی کلکٹر»۔

میں۔ آپ نے اصلی سبب اب بھی نہ بتایا کہ حکّام آپ سے کیوں ناراض رہتے ہیں۔ اگر آپ کو میں سرمایہ دار دیکھتا تو شبہ کر سکتا کہ شاید آپ رشوت لیتے ہوں گے۔

بھائی صاحب۔ بات صاف صاف تو یہ ہے کہ میں رشوت نہیں لیتا اور مجھ جیسا تنک مزاج آدمی رشوت لے بھی نہیں سکتا۔

میں ۔ میں تو سنتا تھا کہ انگریز رشوت سے بہت چڑتے ہیں اور آپ کے فرمانے سے بالکل الٹی بات معلوم ہوتی ہے ۔

بھائی صاحب ۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھ کو کسی مرتشی انگریز سے معاملہ نہیں پڑا ؛ نہ میں نے کبھی کسی انگریز کو رشوت دی نہ کسی سے سنا کہ اس نے انگریز کو رشوت دی ۔ انگریزوں کی بڑی رشوت کیا ہے ڈالی یا دورے میں گئے تو رسد یا ڈاک بٹھانے کی ضرورت ہوئی تو گھوڑا گاڑی یا شکار کو نکلے تو سانگے کے ہاتھی وغیرہ یا خاص خاص لوگوں سے شاذ نادر تحفہ تحائف ؛ سو میں ان چیزوں پر رشوت کا اطلاق نہیں کر سکتا ۔ رسد میں تو اکثر نوکروں کی شرارت ہوتی ہے کہ صاحب سے بھی ایک ایک کے دو دو لیتے ہیں اور بیچ میں آپ چٹ کر جاتے ہیں اور صاحب کو خبر نہیں ہونے دیتے اور شاید کوئی میم والا صاحب ہوا اور میم ہوئی کفایت شعار ، جز رس اور اس نے دھیلے انڈا اور آنے مرغی کے دام کاٹ دیے اور لکڑی گھاس مفت کہ یہ چیزیں تحصیل دار ، تھانہ‌دار دیہات سے ضرور بے قیمت لیتے ہیں اور ہم کتنے ہی دام کیوں نہ دیں ، اصل مالکوں کو کوڑی ملنے والی نہیں ؛ تو ہاں اس کا بھی عجب نہیں مگر پھر بھی میں یہی کہوں گا کہ انگریزوں میں رشوت نہیں چلتی مگر ان کے حصے کی بلکہ اس سے بہت زیادہ ان کے اردلی ، خدمت گار ، شاگرد پیشہ ، پیشی کے عملے لے مرتے ہیں اور صاحب کی آنکھ ، کان ، زبان ، بلکہ ہم زاد ، جو کچھ کہو یہی لوگ ہوتے ہیں ۔ اگر کوئی شخص میری طرح ان ہم زادوں یا حرام زادوں کو راضی نہیں رکھ سکتا تو کتنا ہی بڑا عہدہ دار کیوں نہ ہو ، اختیارات ، حکومت ، تنخواہ سب کچھ ہے مگر عزت نہیں

اور میں چاہوں تو انگریزوں کے شاگرد پیشوں کو کچھ خرچ کرکراکے راضی کرلے سکتا ہوں مگر مجھ کو ان کے نام کی کچھ ایک چڑ سی آ پڑی ہے کہ دوھری دوھری سواریاں رکھتا ہوں؛ خدا کے فضل سے نوکر بھی متعدد ہیں؛ مکان کا کرایہ، اخبار، کھانا، کپڑا میرا سارا خرچ میرے پندار میں اُجلا ہے؛ سال میں سینکڑوں روپے تو ھسپتال، مدرسہ اور متفرق چندوں میں نکل جاتے ہوں گے؛ یہ تمام مصارف میں خوش دلی سے کرتا ہوں لیکن ڈالیوں اور شاگرد پیشوں کے انعام میں مجھ سے ایک روپیہ خرچ نہیں کیا جاتا۔

اتنی مدت مجھے نوکری کرتے ہوئی اور چھوٹے بڑے صدھا انگریزوں سے میری معرفت ہے، مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں خوشی سے کبھی کسی انگریز سے ملنے گیا ہوں یا کسی انگریز سے مل کر میری طبیعت خوش ہوئی ہو۔ میں انگریزوں سے ملتا ضرور ہوں مگر بہ مجبوری؛ دفع مضرت کے لیے کہ ایسا نہ ہو مغرور سمجھا جاؤں یا عملوں اور اردلیوں کو جو ہمیشہ مجھ سے ناراض رہتے ہیں، چغلی کھانے کا موقع ملے۔ مجھ کو بعض ایسے کریم النفس انگریزوں سے بھی واسطہ پڑا ہے جنھوں نے صرف بہ تقاضائے انصاف کارگزاری دیکھ کر مجھ کو فائدے پہنچائے ہیں اور میں ان کا دل سے ممنون ہوں مگر انگریزوں کے عام برتاؤ سے میرا دل کچھ ایسا کھٹا ہو گیا ہے کہ جنھوں نے مجھ پر احسان کیے ہیں اُن کے ساتھ بھی میں نے اس سے زیادہ راہ و رسم نہیں رکھی کہ جب تک افسری ماتحتی کا تعلق رہا، رہا؛ جب وہ بدل گئے یا میں بدل گیا تو بھول کر بھی میں کسی کو عرضی نہیں بھیجتا۔

''میں انگریزوں کی ملاقات کا ایسا چور ہوں کہ

جب دیکھتا ہوں کہ اب بہت دن ہو گئے ہیں تو ہفتوں پہلے سے ارادہ کرتا ہوں اور آخر زبردستی ٹھیل کر، دھکیل کر اپنے تئیں لے جاتا ہوں تو کوٹھی پر جا کر ہمیشہ وہی بے لطفی، وہی بے عزتی ۔ جاڑا ہو، پانی برستا ہو، کڑاکے کی دھوپ ہو، لوئیں چلتی ہوں، ہندوستانی ڈپٹی نہیں، ڈپٹی کا باوا کیوں نہ ہو اور چاہے وہ اپنے مکان سے چار گھوڑے کی بگھی پر سوار ہو کر کیوں نہ آیا ہو؛ کلکٹر، جنٹ، اسسٹنٹ کی تو بڑی بارگاہیں ہیں اگر یوریشین ڈپٹی کلکٹر سے بھی ملنے گیا ہے (اور نہ ملے تو رہے کہاں) تو احاطے کے باہر اترنا ضرور اور احاطے بھی شیطان کی انتڑی کہ ہم جیسے پرانی فیشن کے لوگ کوٹھی تک پہنچتے پہنچتے ہانپنے لگتے ہیں اور اگر صاحب کہیں اس حال میں دیکھ پائیں تو سمجھو کہ ملاقات کو گئے، نوکری نذر کر آئے؛ اسی دن رپورٹ ہوئی دھری ہے کہ یہ شخص دس قدم پیدل نہیں چل سکتا، گویا ڈپٹی کلکٹری کو ضرور ہے کہ کم سے کم ڈاک کے ہرکارے کی ایک چوکی تک، پوئی نہیں تو دلکی، پیشی کا بستہ لے کر بھاگ سکے ۔ پس اس ڈر کے مارے کسی درخت کی آڑ میں یا کوئی ایسا ہی گانٹھ کا پورا ہے اور اس نے شاگرد پیشوں کو پہلے سے چکھوتیاں کرادی ہیں تو باورچی خانے یا اصطبل میں پاؤ گھنٹے، آدھ گھنٹے کھڑے کھڑے دم لیا اور جب سانس اچھی طرح پیٹ میں سمانے لگا تو رومال سے منہ ہاتھ پونچھا، ہاتھ سے ڈاڑھی مونچھ کو سنوار، آہستہ سے عمامے کو ذرا اور جما لیا، چغے کے دامن سمیٹے اور بڑے مؤدّب اور مقطّع بن کر ہاتھ باندھے، نیچی نظریں کیے، ڈرتے ڈرتے، دبے پاؤں کوٹھی کی طرف کو بڑھے ۔ خدمت گار اور اردلی کے چپڑاسیوں نے تو احاطے کے

باھر ھی سے تاڑ لیا تھا ، کوٹھی کے پاس آتے دیکھ ، قصداً ادھر اُدھر کو ٹل گئے۔ تھوڑی دیر زینے کے نیچے ٹھٹکے کہ کوئی آدمی نظر آئے تو اوپر چڑھنے کا قصد کریں۔ چلنے کی ، باتوں کی اور چیزوں کے رکھنے اٹھانے کی آوازیں ھیں کہ چلی آتی ھیں مگر کوئی آدمی نظر نہیں آتا۔ آخر ناچار ستون کی آڑ میں جوتیاں اُتار کر ھمت کر کے بے بلائے اوپر پہنچے ؛ کرسی نہیں ، سونڈھا نہیں ، فرش نہیں ، کھڑے سوچ رھے ھیں کہ کیا کریں ، لوٹ چلیں۔ پھر خیال آتا ھے کہ ایسا نہ ھو لوٹتے کو صاحب اندر آئینوں میں سے دیکھ لیں ؛ شرمندگی کے ٹالنے کو وھیں تھوڑی سی جگہ میں ٹہلنا شروع کیا ؛ اتنے میں باورچی خانے کی طرف سے ایک آدمی آتا ھوا نظر آیا۔ جی خوش ھوا کہ اس سے صاحب کا اور اردلی کے لوگوں کا حال معلوم ھوگا۔ وہ لپک کر ایک دوسرے دروازے سے اندر گھس گیا اور ادھر کو رخ بھی نہ کیا۔ غرض کوئی آدھے گھنٹے (اور اُس انتظار میں تو ایسا معلوم ھوا کہ دو گھنٹے) اسی طرح کھڑے سوکھا کیے۔ بارے خدا خدا کر کے ایک چپڑاسی اندر سے چٹھی لیے ھوئے نمودار ھوا۔ کیا کریں اپنی غرض کے لیے گدھے کو باپ بنانا پڑتا ھے ؛ حیا اور غیرت بالائے طاق ، آپ منہ پھوڑ کر اُس کو متوجہ کیا ”کیوں جمعدار کچھ ملاقات کا بھی ڈھنگ نظر آتا ھے؟“۔ بس اس کو ڈپٹی کلکٹری کا ادب سمجھو یا شکایت کا ڈر مگر میں جانتا ھوں کہ ادب اور ڈر تو خاک بھی نہیں صرف اتنی بات کا لحاظ کہ شہر کی فوجداری سپرد ھے ، خدا جانے کب موقع آ پڑے چاروناچار اُچٹتا ھوا سا سلام کر کے جیسے کوئی مکھی اُڑاتا ھے ، اُس کو کہنا پڑا کہ آج ولایت کی ڈاک کا دن ھے ، ملاقات تو شاید

ہی ہو لیکن آپ بیٹھیے ابھی تو صاحب غسل خانے میں ہیں۔ یہ کہ کر وہ پھر اندر کو جانے لگا تو آخر نہ رہا گیا اور زبان سے نکلا کہ کہاں بیٹھوں اپنے سر پر۔ تب اُس نے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی، تکیہ اور ایک بازو ندارد، گویا بید کی تپائی لا کر ڈال دی۔ اس کے بعد سے جب کوئی چپڑاسی یا خدمتگار باہر آتا یہی معلوم ہوتا کہ صاحب ابھی غسل خانے سے نہیں نکلے (الٰہی کیا غسل سیت ہے)، اب کپڑے بدل رہے ہیں، اب میم صاحب کے کمرے میں ہیں، اب چٹھی لکھ رہے ہیں؛ یہاں تک کہ آخر کو معلوم ہوا کہ کھانے کی میز پر ہیں۔ یہ سن کر جی ہی تو بیٹھ گیا کہ بس اب کیا خاک ملاقات ہوگی۔ ارادہ ہوا کہ گھر کی راہ لیں۔ پھر خیال ہوا کہ کون وقتوں سے انتظار کر رہے ہیں، آنا تو پڑے ہی گا؛ دوسرے دن کا کیا بھروسا، اتنی محنت کیوں ضائع کی، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اور صبر کرو۔ بڑی دیر بعد چپڑاسی یہ حکم لے کر نکلا کہ سررشتہ دار کو رپورٹ خوانی کے لیے بلایا ہے۔ اب رہی سہی اُمید اور بھی گئی گزری ہوئی۔ تب تو اپنا سا منہ لے کر چپڑاسی سے یہ کہتے ہوئے اُٹھے کہ خیر میں تو اب جاتا ہوں، صاحب سے میرے آنے کی اطلاع کر دینا۔ تب خدا جانے چپڑاسی کے دل میں کیا آئی کہ کہنے لگا میں دوبارہ آپ کی اطلاع کر چکا ہوں، کچھ بولے نہیں؛ اب پھر کہے دیتا ہوں، خفا ہوں گے تو آپ میری آدھ سیر آٹے کی فکر رکھنا۔ غرض بلائے گئے۔ صاحب کو دیکھا تو پیپ منہ میں لیے ٹہل رہے ہیں: بس معلوم ہو گیا کہ مطمئن ملاقات نہیں ہوسکتی۔ سر جھکائے کوئی کاغذ یا کتاب دیکھ رہے ہیں؛ اب کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی کہ کیونکر ان کو خبر کروں کہ میں آیا ہوا کھڑا ہوں اور کیا معلوم ہے

شاید جان بوجھ کر کھڑا رُکھا ہو بلکہ مجھ کو تو اس بات کا
بھی شبہ ہے کہ میرے آنے کی بہت دیر پہلے سے اُن کو خبر
تھی - چپڑاسی نے شاید نہ بھی کہا ہو مگر چاروں طرف آئینے
کے کواڑ ہیں؛ عین سامنے کے دروازے سے آیا ، درختوں کے
نیچے ٹہلتا رہا ، پھر بڑی دیر تک برآمدے میں بیٹھا رہا ؛ کیا
اتنے عرصے میں ایک بار بھی اُن کی نظر نہ پڑی ہوگی ؟ ضرور
پڑی ہوگی - خیر آخر آپ ہی سر اُٹھایا «او ڈپٹی صاحب» -
حاکم بالا دست ہو کر جو اتنی آؤبھگت کرے تو اُس کا شکر گزار
ہونا چاہیے - صاحب نے بندہ نوازی میں کچھ کمی نہیں کی ؛
آنکھیں چار ہوتے ہی اپنے مقابل میز کی دوسری طرف کرسی پر
بیٹھنے کا اشارہ کیا - اپنے گھر یا آپس میں ایک دوسرے کے گھر
کرسیوں پر بیٹھنا کون نہیں جانتا لیکن میں تو اپنے سے زیادہ
تنخواہ کے ہندوستانی صدرالصدوروں اور ڈپٹیوں کا انگریزوں
کے روبرو کرسی پر بیٹھنا دیکھے ہوئے تھا ؛ (کہنے کو کرسی پر
بیٹھا مگر حقیقت میں بید پر چوتڑ ٹیکے ہوں تو جیسے چاہو قسم
لو -) تم خدا کے بندے ہو ، (یقین ماننا بس ڈنڈے پر الگ تھلگ
جیسے اڈّے پر گلدم) کرسی پر بیٹھنا ہی تھا کہ کم بخت چپڑاسی
نے پیچھے سے ہاتھ جوڑ کر کہا ''خداوند ، سر رشتہ دار حاضر
ہیں'' - صاحب ہیں کہ میری طرف دیکھتے جاتے ہیں اور
چپڑاسی سے فرما رہے ہیں ''اچّا آنے بولو'' یعنی اچھا سررشتہ دار
سے کہو چلے آئیں - سبحان اللہ سات برس اسسٹنٹ رہے، نو برس
کے قریب جنٹ اور اس سولہ برس میں صرف ایک بار ڈیڑھ برس
کے لیے فرلو پر ولایت گئے تھے ؛ بارہ برس دلی میں رہے اور بھاڑ
جھونکا - چودہ برس میں حضرت نے اردو میں کیا کمال حاصل
کیا ہے ''اچا آنے بولو'' - اب میں منتظر ہوں کہ صاحب کچھ

پوچھیں تو جواب دوں اور سر رشتہ دار مردود ، آگے آگے آپ پیچھے بستہ قلمدان لیے ہوئے چپڑاسی ، آ ہی گھسا ۔ سر رشتہ دار کے روبرو مجھ سے پوچھتے ہیں تو کیا پوچھتے ہیں ''ول صاحب گرمی بُوت''

میں ۔ (گردن جھکا کر) ہاں خداوند گرمی کے تو دن ہی ہیں ۔ میرے علاقے میں تو پولیس کی رپورٹ سے ایسا معلوم ہوا کہ لُو سے بھی کئی آدمی مرے۔

صاحب کو تو یہ جواب دے رہا ہوں اور دل میں کہہ رہا ہوں کہ گرمی کا تو حال معلوم تھا ، ارے ظالم تجھ کو یہ بھی خدا کا ترس آیا کہ ایک بندۂ خدا جس کو کچہری میں سرکار سے ایک ٹٹی ملتی ہے (ناظر اپنی بد ذاتی سے تین برس کے پرانے خس کی بندھوا دیتا ہے تو وہ جانے اور اس کا ایمان) اور جس کو گھر پر بھی ٹٹی لگانے کا مقدور ہے اور جو واقع میں گرمی بھر اپنے گھر ٹٹی میں رہتا ہے، کتنی دیر سے برآمدے میں پڑا بھن رہا ہے' لاؤ سلام لے کر اس کو آزاد کروں ۔ میں تو سمجھا تھا کہ آدمیوں کا لُو سے مرنا سن کر چونک پڑے گا اور ضرور پوچھے گا کہ کس تھانے سے رپورٹ آئی ، کتنے آدمی مرے' کب مرے' لُو کا ہندوستانی کیا علاج کرتے ہیں اور کوئی لاش ڈاکٹر صاحب کے ملاحظے کو بھی آئی یا نہیں؟ غرض آدمی کا دل بولنے اور بات کرنے کو چاہے تو بہتیرے حیلے ہیں، پر صاحب تو کچھ پی سے گئے : نہیں معلوم دھیان سے نہیں سنا یا سمجھے نہیں یا کالے آدمیوں کے مرنے کی پروا نہیں کی ۔ اب سر رشتہ دار ہے کہ بستہ کھول ، کاغذ پھیلا رہا ہے اور میری اور صاحب کی یہ تپاک کی ملاقات ہو رہی ہے کہ

دونوں چپ۔ جب سر رشتہ دار کاغذ پھیلا، لگا صاحب کا منہ دیکھنے تو صاحب مجھ سے فرماتے ہیں ''آپ کُچ کُچ ...'' یعنی آپ کو کچھ اور کہنا ہے۔ یہ سنتے ہی میں تو یہ کہ کر اٹھ کھڑا ہوا کہ نہیں میں تو صرف سلام کے لیے حاضر ہوا تھا، بہت دن ہو گئے تھے، جی ملنے کو چاہتا تھا؛ پھر حاضر ہوں گا۔

میری اس اخیر بات میں—اور باتیں ہی ایسی کون سی بہت ہوئی تھیں کہ اس کو اخیر کہوں—بلکہ دوسری بات میں جی ملنے کو چاہتا تھا، بالکل جھوٹ تھا؛ کس مسخرے کا جی ملنے کو چاہتا تھا اور کس مسخرے کا جی اب ملنے کو چاہتا ہے۔ ملاقات کے با مزہ اور بے مزہ ہونے کا معیار وقت ہے؛ دیر تک ملاقات رہی تو جانو کہ خوب دل کھول کر باتیں ہوئیں۔ ہماری ملاقات کیا خاک بامزہ سمجھی جائے کہ جانا اور اٹھاؤ چولھے کی طرح بیٹھنا اور گفتگو اور رخصت سب کچھ دو ہی منٹ میں ہو ہُوا چکا۔ اپنے حساب سے کون ایسا تیسا ملاقات کے ارادے سے گیا تھا؛ خدا گواہ ہے صرف منّھا پھٹّول؛ وہ بھی اپنے سر کا چھدا اتارنے کے لیے۔ صاحب مجھ سے چاہتے ایک بات بھی نہ کرتے مگر سررشتہ دار اور چپڑاسیوں کو میرا الٹے پاؤں لوٹ آنا معلوم نہ ہوتا تو مجھ کو کچھ بھی شکایت نہ تھی مگر میری تفضیح ان لوگوں کی نظروں میں ہوئی جو منصبی عزت میں میرے پاسنگ بھی نہ تھے۔

باہر نکلا تو چپڑاسیوں اور خدمت گاروں کا غول کا غول برآمدے میں موجود تھا۔ مجھ کو دیکھتے ہی سب نے فرّاشی سلام کیا۔ الٰہی یہ کاہے کی ایسی لمبی چوڑی تعظیم ہو رہی ہے۔ گھنٹوں میں برآمدے میں بیٹھا سوکھا کیا، ان میں سے

کسی کی صورت بھی نظر نہیں پڑی ، اب یہ حشرات الارض کہاں سے نکل پڑے؟ آہا! میں اتنی جاں فشانی کے بعد صاحب کو ایک سلام کر لینے کا گنہ گار ہوں ۔ یہ سرکاری پیادے اُس کا جرمانہ وصول کرنے کے لیے مجھ پر تعینات ہیں ۔ ہر چند کہتا ہوں مکان پر آنا تنخواہ پر دیکھا جائے گا ، عید قریب ہے اُس میں سمجھ لینا ؛ بے حیا پیچھا نہیں چھوڑتے ۔ آخر میں نے ذرا ترش رو ہو کر کہا کہ اس وقت میرے پاس نہیں ہے ، ہوتا تو دینے کا نام دینا کبھی کا دے چکا ہوتا ؛ ایسی ہی بے اعتباری ہے تو ایک آدمی میرے ساتھ چلو ۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ایک آدمی تیار سا ہوا کہ مجھ سے پہلے آگے کوچ بکس پر بیٹھ لے ۔ اتنے میں جمعدار نے پنسل اور ایک پرچہ کاغذ نکال میرے ہاتھ دیا کہ حضور ناظر کو رقعہ لکھ دیں ۔ جب جب میں قلم اُٹھاتا تھا ، بے ادب ہاتھ پکڑ پکڑ لیتے تھے "پہلے فرما دیجیے کہ آپ کیا لکھتے ہیں"۔ اسی کشمکش میں بڑھتے بڑھتے میں تو اپنی بگھی تک جا پہنچا ۔ سائیس پٹ کھولے کھڑا ہی تھا ؛ لپک کر پائیدان پر پاؤں رکھ غڑپ بگھی کے اندر ۔ سائیس نے کھٹ سے پٹ بھیڑ دیا اور گھوڑا تھا کہ آہٹ پاتے ہی چل نکلا ۔ میں نے کوچبان سے لے کر کاغذ کے پرزے میں ایک روپیہ رکھ ، پڑیا بنا ، اردلیوں کو دکھا کر نیچے پھینک دیا ۔ پھر میں نے کھڑکی سے منھ نکال کر دیکھا تو ایک چپڑاسی نے پڑیا اُٹھائی بھی ۔ ایک روپیہ دیکھ کر یقیناً بہت ہی بگڑے ہوں گے مگر میں ان کی گالیوں کی زد سے باہر نکل جا چکا تھا ۔

بگھی کے اندر بیٹھ کر میں نے ایک ایسا لمبا سانس لیا

جیسے کوئی مزدور سر پر سے بھاری بوجھ اُتار کر۔ تمام راستہ اسی ملاقات کی اُدھیڑبن میں طے ہوا۔ بار بار خیال آتا تھا کہ سررشتہ دار اور چپڑاسیوں کی نظر میں میری کیا عزّت رہی ؛ اب یہ لوگ تمام شہر میں اس کا ڈھنڈورا پیٹیں گے ، ایسی بے حرمتی سے روٹی کمانے پر لعنت ہے۔ پھر دل کو سمجھاتا کہ عزت ایک امر اضافی ہے ، مجھے اپنے اقران و امثال پر نظر کرنی چاہیے ؛ ان کے ساتھ بھی تو اُنیس بیس کے فرق سے ایسی ہی مدارات کی جاتی ہے؛ تو جس مجلس میں سب ننگے ہیں وہاں لنگوٹی کی کیا شرم؟

اسی حیص بیص میں گھر پہنچا ۔ چند آدمی منتظر ملاقات بیٹھے ہوئے تھے مگر نہ وہ ڈپٹی تھے اور نہ میں کلکٹر کہ برآمدے میں محتاج اطلاع بیٹھے ہوں ؛ آئے تو میں موجود نہ تھا، مزے میں گاؤ تکیوں کے سہارے سے پھیل پھیل کر بیٹھے۔ گھر میں سے پان آ گئے، آدمیوں نے حقّے بھر دیے ۔ جوں مجھ کو دیکھا ایک صاحب بولے ''اللہ اکبر! ڈپٹی صاحب، آج تو کلکٹر صاحب سے خوب گاڑھی چھنی؛ کون وقتوں سے میں آپ کا منتظر بیٹھا ہوں''۔

دوسرے صاحب ۔ آج بندے کا ارادہ بھی کلکٹر صاحب کے سلام کو جانے کا تھا ؛ معلوم ہوا کہ ڈپٹی صاحب تشریف لے گئے ہیں ؛ میں نے کہا کہ بس آج کسی کی دال نہیں گلتی۔

تیسرے صاحب۔ مدت سے جدید تحصیل داری قائم ہونے کی خبر تھی، یہاں تک کہ بورڈ سے منظوری بھی آ چکی ہے ؛ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج اسی انتظام کے صلاح مشورے میں اتنی دیر لگی۔

لوگ آپس میں یہ باتیں کر رہے ہیں اور میں کپڑے اُتارتا جاتا ہوں اور اندر ہی اندر دل میں خوش ہوں کہ بھلا ہے ؛ خدا کرے لوگ ایسی ہی غلط فہمی میں مبتلا رہیں ۔

فصل هشتم

نوبل صاحب ابن الوقت کو رفارمر بناتے ہیں

نوبل صاحب نے اس قصّے کو بہت ہی غور اور توجہ سے سنا - بیچ بیچ میں کبھی مسکرانے لگتے تھے اور کبھی استکراہ اُن کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا مگر اُنھوں نے ابن الوقت کی بات کو نہیں کاٹا - جب ابن الوقت نے بات پوری کی تو فرمانے لگے کہ ہمیشہ سے میری یہ رائے ہے کہ انگریزی عملداری میں یہی بڑا خطرناک نقص ہے کہ حاکم و محکوم میں ارتباط نہیں - یہ اجنبیت اگر سبب غدر نہیں ہوئی تو غدر کی ترقی کا موجب تو ضرور ہوئی اور جب تک ہندوستان کے لوگ انگریزوں کے ساتھ مانوس نہیں ہوں گے، سلطنت ایک منٹ کے لیے بھی قابل اطمینان نہیں، مگر اس میں دونوں کا قصور ہے- انگریز بہ غرور حکومت ہندوستانیوں کی طرف ملتفت نہیں ہوتے اور ہندوستانی بوجہ نادانی انگریزوں سے پرہیز اور گریز کرتے ہیں - کیوں کر ایسے دو آدمیوں میں اتحاد ہو سکتا ہے جن کی نہ زبان ایک، نہ مذہب ایک، نہ رسم و عادت ایک، نہ مزاج ایک ؟ پھر اس اجنبیت کے نقصان بھی دونوں کی طرف عائد ہیں: ہندوستانیوں کا تو صریح نقصان یہ ہے کہ خدا نے انگریزوں کو سلطنت کے ذریعے سے عزّت اور دولت کا منبع بنا دیا ہے اور اب اس غدر نے بخوبی ثابت کر دیا کہ جس سلطنت کو انگریزوں نے بہ زور شمشیر حاصل کیا ہے، اُس کو بہ زور شمشیر قائم رکھنے پر قادر بھی ہیں؛ ہندوستانی

جس قدر انگریزوں سے بھاگتے ہیں اسی قدر عزت سے محروم اور دولت سے بے نصیب ہیں۔ اس کے مقابلے میں انگریز کب نقصان سے محفوظ ہیں، ضعف سلطنت سے بڑھ کر اور کیا نقصان ہوگا؟ آج کو اگر رعایا دوست دار ہوتی تو تلنگوں کو اوّل تو بغاوت کرنے کی جرأت ہی نہ ہوتی اور خیر نادانی کر بھی بیٹھے تھے تو بغاوت اس قدر جلد کبھی نہ پھیلتی کہ گویا چٹکی بجانے میں اس سرے سے اس سرے تک آگ سی لگ گئی؛ تلنگوں نے سلگائی اور رعایا نے بھڑکائی۔

ابن الوقت ـ پھر کسی طرح یہ آپس کا نفاق دفع بھی ہو۔

نوبل صاحب ـ دونوں ایک دوسرے کی طرف کو جھکیں، سو میں سمجھتا ہوں خدا کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں۔ شاید یہ غدر اسی غرض سے ہوا تھا کہ دونوں کو اپنی اپنی غلطیوں پر تنبّہ ہو۔ ابھی تو غدر کی یادداشت تازہ ہے؛ چند سال بعد غدر اور اس کی خوف ناک حکایتیں سب قصے اور افسانے معلوم ہونے لگیں گے۔ ایک بار اچھی طرح پھٹ کر اس زخم کا انگور بندھے گا اور جس طرح آپ آج کے بعد کل اور کل کے بعد پرسوں کو دیکھ رہے ہیں، مجھ کو وہ دن نظر آ رہا ہے اور خدا نے چاہا تو میں اس کو اپنی زندگی میں ان آنکھوں سے دیکھوں گا۔ ہندوؤں کا کفر تو شاید مدتوں میں جا کر ٹوٹے گا کیوں کہ ان بے چاروں کے پاس رسم و رواج کے سوائے مذہب کوئی چیز نہیں مگر ہاں مسلمانوں کو اپنے مذہب پر بڑا ناز ہے اور جہاں تک مجھ کو معلوم ہے ان کے مذہبی اصول اکثر اچھے بلکہ بہت اچھے ہیں؛ ان میں اور انگریزوں میں ارتباط اور اختلاط کا ہو جانا چنداں دشوار نہیں معلوم ہوتا۔

ابن الوقت ـ بے شک ہونا تو یوں ہی چاہیے مگر میں

سمجھتا ہوں کہ یہاں کے مسلمان اس خصوص میں ہندوؤں سے بہت زیادہ شدید ہیں ۔

نوبل صاحب ۔ شدید ہیں یا دونوں کی اجنبیت کی وجہ سے ارتباط و اختلاط کا موقع نہیں ملا اور اس بارے میں کسی نے کوشش نہیں کی ۔

ابن الوقت ۔ دونوں ہی باتیں ہیں ۔

نوبل صاحب ۔ آپ اپنی فرمائیے، میرے جتنے دوست ہیں سب ہی تو آپ کی ملاقات کے مشتاق ہیں بلکہ بعض تو متقاضی ہیں ۔ اس بات کو تو میرا جی نہیں چاہتا کہ انگریزی سوسائٹی میں اس طرح پر آپ کی تقریب کروں کہ گویا آپ اہل غرض ہیں یا اُمیدوار خدمت ۔ اس وقت ساری انگریزی سوسائٹی خیر خواہی کی وجہ سے آپ کو نظر وقعت سے دیکھتی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اُسی وقعت کے ساتھ آپ کو انٹروڈیوس[1] کروں یعنی صاحب لوگوں کے ساتھ آپ کی دوستانہ اور برابری کی ملاقات کرا دوں مگر میں آپ سے اس بات کے کہنے کی معافی مانگتا ہوں کہ اس کے لیے آپ کو اپنی حالت کچھ بدلنی پڑے گی اور اگر آپ کو اس میں تعذّر ہو تو شاید نہیں ملنا بہتر ہوگا؛ اگرچہ اس صورت میں مجھ کو بڑی مشکل پیش آئے گی اور میں اپنے دوستوں کو شاید کوئی معقول وجہ نہیں بتا سکوں گا ۔

ابن الوقت ۔ میں آپ سے ذرا تفصیل کے ساتھ سننا چاہتا ہوں کہ آپ کس طرح کی تبدیلی کی مجھ سے توقع رکھتے ہیں ؟

نوبل صاحب ۔ کم سے کم اس قدر کہ انگریزی مذاق کے مطابق ایک مکان درست ہو ۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ہم لوگ

---

۱ ۔ تقریب ۔

ہمیشہ بیرون شہر، کھلے ہوئے مکانوں میں رہنا پسند کرتے ہیں اور ہم لوگوں کا طریقۂ نشست و برخاست اور طرز ساندوبود بھی مختلف ہے ۔ میرے دوست آپ سے ملنے کے لیے کہتے ہی رہتے ہیں ۔ کئی بار دل میں آیا کہ آپ کے پاس لے چلوں ؛ پھر سوچا کہ آپ اُن لوگوں سے ملنے کے لیے تیار نہیں ہیں، ناحق شرمندگی ہوگی ۔ اول تو آپ کا مکان ایسی گلیوں میں واقع ہے کہ وہاں تک بگھی جا نہیں سکتی ؛ پھر گلیاں تنگ اور ناصاف کہ کوئی صاحب لوگ ایسی پیچ در پیچ جگہ جانا پسند نہیں کرسکتا ۔ آپ کا مکان اگرچہ چنداں برا نہیں مگر صاحب لوگ کی آسائش کے لیے میز کرسی وغیرہ کوئی سامان نہیں ۔ ان وجوہ سے میں نے کسی دوست کو آپ کے پاس لے جانے کی جرأت نہیں کی ۔ تو اس بارے میں جیسا کہ آپ کو منظور ہو بیان کیجیے کہ آپ کو انگریزوں کے ساتھ جس طرح پر کہ میں چاہتا ہوں ملنا پسند ہے یا نہیں ۔

ابن الوقت ۔ یہ معاملہ بڑا ٹیڑھا ہے ۔ ہمارے مسلمان بھائیوں کا تعصّب (یہ ایک دوسری بات ہے کہ بجا ہے یا بیجا) اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ آپ ہرگز اُس کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتے ۔ جن لوگوں نے غدر میں آپ کا ہمارے یہاں رہنا سنا ہے، مجھ کو اُن کے تیور بھی بدلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور آج میں نے آپ کے ساتھ کھانا کھانے کو تو کھا لیا اور میں نے اپنے اذعان میں ہرگز خلاف مذہب اسلام نہیں کیا کیوں کہ آپ لوگ اہل کتاب ہیں اور ہمارے قرآن مجید میں اہل کتاب کے ساتھ کھانے کی صریح اجازت موجود ہے مگر شہر کے مسلمان اگر سن پائیں گے (اور کیوں نہ سنیں گے) کم بخت اس طرح کے جاہل ہیں کہ شہر میں میرا رہنا دشوار کر دیں گے اور میں

ٹھہرا کنبے اور جتھے کا آدمی ، عجب نہیں سب مل کر مجھ کو برادری سے خارج کر دیں ۔

نوبل صاحب ۔ مگر آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ بے اصل تعصّب جس کو عقل کی تائید اور مذہب کی سند نہیں محض شورش جاہلانہ بے ثبات ہے ۔ بے شک شروع شروع میں چند روز تک شاید لوگ آپ کو حقارت سے دیکھیں گے اور اس سے آپ کو ضرور کسی قدر ایذا بھی ہوگی مگر تا بہ کے ۔ اگر آپ استقلال کے ساتھ ایک طرز کو اختیار کریں گے اور کچھ شک نہیں کہ لوگوں پر اس نمونے کا مفید ہونا اویر سویر ثابت ہوگا پر ہوگا تو مجھ کو پورا یقین ہے کہ رفتہ رفتہ لوگ اپنی غلطی پر متنبّہ ہوتے جائیں گے اور نفرت کے عوض خود اسی طریقے کی تقلید کرنے لگیں گے ۔ پس جس بات سے آپ ڈرتے ہیں ، ایذا ہے عارضی اور تکلیف ہے چند روزہ ۔ آپ نے سرکاری خیرخواہی کے لیے کیسی جان جوکھوں اٹھائی تو کیا اپنی قوم ، اپنے بھائی بندوں کے مفاد کے لیے تھوڑی سی خیالی ایذا کا تحمّل کرنا کچھ بڑی بات ہے؟

یہ بات اچھی طرح سمجھ رکھنے کی ہے کہ پہلے ہی سے مسلمان ہندوستان کے باشندوں میں سب سے زیادہ خستہ حال تھے ، اب اس غدر نے اُن کو رہا سہا اور تباہ کر دیا ۔ معدودے چند ، شاید سارے ہندوستان میں پورے ایک درجن بھی نہیں ، برائے نام کچھ رئیس تھے ۔ میں سمجھتا ہوں اس غدر کی آفت سے شاذ نادر کوئی بچا ہو تو بچا ہو ؛ کارطوس کے کاٹنے پر بگڑے ہندو اور اس اعتبار سے بغاوت کی ابتدا ہندوؤں نے کی مگر آخرکار تھپ گئی مسلمانوں پر ۔ اب بغاوت کا سارا نچوڑ مسلمانوں پر ہے اور ان احمقوں نے ہم وطنی کے لحاظ سے ہندوؤں کا ساتھ دے کر اپنا ایسا نقصان کر لیا ہے کہ سالہائے دراز تک ان کے پنپنے کی

کچھ توقع نہیں۔ اب ان کے فلاح کی صرف یہی ایک تدبیر ہے
کہ تلافیٔ مافات کریں اور جس قدر انگریزوں سے الگ تھلگ
رہے ہیں اُسی قدر بلکہ اُس سے بھی زیادہ اُن سے ٹوٹ کر ملیں
اور ہمارے نزدیک کوئی وجہ نہیں کہ کوئی آدمی کیوں ایسی
تدبیریں عمل میں نہ لائے جو اُس کے حق میں مفید ہیں۔

مسلمان کتنے ہی گئے گزرے کیوں نہ ہوں، اب بھی اُن
کے سروں میں تعزّز کے خیالات بھرے ہوئے ہیں۔ جہاں تک
میں نے آزمایا ہے مسلمانوں کے مزاج کارفرمائی کے لیے نہایت
مناسب ہیں۔ میں نے اُن کو کبھی ذلیل خوشامد کرتے ہوئے
نہیں دیکھا۔ یہ لوگ سختی اور مصیبت کو بڑے استقلال کے
ساتھ برداشت کرتے ہیں۔ ان کے ذہنوں میں جُودت، ان کی
عقلوں میں رسائی دوسری قوموں سے بہت زیادہ ہے۔ راست بازی،
راست گوئی، دیانت، حمیّت اور غیرت میں یہ لوگ اپنے ہم وطنوں
سے ضرور سر بر آوردہ ہیں۔ میں نے مختلف اضلاع میں بہ تعلق
خدمت سرکاری ہندوستانیوں کی اکثر قوموں کا تجربہ کیا ہے۔
خدمتگار، چپڑاسی، عملۂ کچہری، حکّام، پیشہ ور تاجر، کوئی
حیثیت کیوں نہ ہو، میں نے ہمیشہ مسلمانوں کو بہت بہتر پایا ہے
بہ مقابلہ دوسری قوم کے۔ میں اُن کے مذہب کو (آپ معاف
کیجئے گا) سپاہیانہ مذہب خیال کرتا ہوں اور میرے نزدیک
ہر مسلمان مذہباً سپاہی ہے۔

ایک مسلمان تحصیلدار صاحب میرے دوست ہیں۔ نہیں معلوم
غدر میں اُن کو کیا پیش آئی مگر آدمی تیز مزاج شدیدالحکومت
تھے، ضرور مبتلائے بغاوت ہوئے ہوں گے۔ ایک روز ہندوؤں اور
مسلمانوں کے تذکرے میں کہنے لگے کہ میں بدون دیکھے
ہندو فقیر کی آواز پہچان لیتا ہوں؛ ہندو فقیر جب بھیک

مانگے گا گڑ گڑا کر اور مری ہوئی آواز سے ”بھگوان بھلا کریں،“ برخلاف مسلمان فقیر کے کہ فقیری میں بھی طنطنے کو نہیں جانے دیتا، یا علی کہ کر جو ایک ڈانٹ بتاتا ہے تو سارا محلہ چونک پڑتا ہے۔

میں ایسا سمجھتا ہوں کہ مدّتوں اس قوم میں سلطنت رہی ہے۔ یہ تمام صفات اُسی کے آثار ہیں لیکن سو برس بھی مسلمانوں پر افلاس کے اور گزرے تو ضرور اُن کی نسلیں ایسی بگڑ جائیں گی کہ پھر ان کی اصلاح شاید ناممکن ہو۔ یہ قوم ایک رفارمر کی پہلے سے محتاج تھی اور اب تو رفارمر کے ہونے نہ ہونے پر انھیں کے ہونے نہ ہونے کا فیصلہ ہے۔ میں کہتا ہوں وہ رفارمر تمھیں کیوں نہ ہو۔ شخصی عزّتیں فروع ہیں قومی عزت کی۔ کوئی شخص دولت یا ہنر یا کسی اور وجہ سے کیسا ہی قابل عزت کیوں نہ ہو، جب تک وہ ایک ذلیل قوم کا ادمی ہے، اُس کو پوری پوری عزت کی توقع ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔ ہزاروں مثالیں موجود ہیں کہ ذلیل قوموں کے لوگ دولت پیدا کرکے بڑے مال‌دار ہو جاتے ہیں مگر ناصیۂ امارت سے قومی ذلّت کے داغ کو نہیں چھڑا سکتے اور سوسائٹی کبھی اُن کی ایسی وقعت نہیں کرتی جس کے وہ امیری کی وجہ سے مستحق ہیں۔ میں نے اب نہیں، غدر سے بہت پہلے، اسی ہندوستان کے بڑے شہر میں اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایک بازار میں کوئی چار گھڑی دن رہے لوگوں کی آمد و شد اس کثرت سے تھی کہ اس سرے سے اُس سرے تک گویا ایک میلہ لگا ہوا ہے: جو لوگ سواریوں پر تھے وہ اور اُن کے نوکر سبھی تو چلاتے تھے، ہٹو، بڑھو، بچوا کون سنتا ہے۔ اتنے میں سامنے سے ایک گورا نظر پڑا کہ اکیلا پیپ پیتا ہوا سیدھا چلا آ رہا ہے اور

لوگ ہیں کہ آپ سے آپ کائی کی طرح اُس کے آگے پھٹتے چلے جاتے ہیں ۔ میں نے اُس وقت خیال کیا تھا کہ یہ قومی تعزّز کا اثر ہے ۔ شخصی تعزّز پر اگر قومی تعزّز مستزاد ہو تو نورٌ علیٰ نور، ورنہ بدون قومی تعزّز کے شخصی تعزّز اصلی عزت نہیں بلکہ عزت کا ملمع ہے ۔

دنیا میں نیکی کے بہت سے کام ہیں لیکن قوم کی رفارم سے بڑھ کر کوئی نیکی نہیں ۔ یہی وہ نیکی ہے جس کا فائدہ عام اور اثر نسلاً بعد نسل باقی رہ سکتا ہے ۔ جن کو آپ پیغمبر کہتے ہیں وہ بھی میرے نزدیک اپنے وقت کے رفارمر تھے" ۔

ابن الوقت ۔ مسلمانوں میں رفارمر کی ضرورت کو میں تسلیم کرتا ہوں مگر یہ کام میرے بُوتے کا نہیں ۔ ایک آدمی بگڑا ہوا ہوتا ہے تو کوئی اُس کی اصلاح کا بیڑا نہیں اُٹھا سکتا نہ کہ قوم ۔ یہ کام مقدور بشر نہیں ؛ قوم کے دلوں کو پھیر دینا میرے نزدیک تصرّف الٰہی ہے ۔

نوبل صاحب ۔ تصرّف الٰہی ہی سہی اور سہی کا لفظ میں نے غلط کہا ، مجھ کو کہنا چاہیے تھا تصرّف الٰہی ہے لیکن دنیا میں تصرّفات الٰہی ہمیشہ اسباب ظاہری کے ذریعے سے ہوتے ہیں ۔ آئندہ کا حال کسی کو معلوم نہیں ؛ کون کہ سکتا ہے شاید مسلمانوں کی تباہی حد کو پہنچ چکی ہو اور اب خدا کو ان کی حالت کا بہتر کرنا منظور ہو اور عجب نہیں اس بہتری کا یہی سامان ہو یا یہی نہ ہو تو مِن جُملہ بہت سے اسباب کے یہ بھی ہو کہ ہم آپ اس قسم کا تذکرہ کر رہے ہیں اور خدا آپ کے دل میں ڈال دے اور آپ استقلال کے ساتھ اس کام کو شروع کریں اور آپ کی سعی مشکور ہو ۔

تاریخ سے ثابت ہے کہ دنیا کے بڑے واقعات اکثر محض خفیف اور ضعیف اسباب سے پیدا ہوئے ہیں جیسے بڑے عظیم‌الشان درخت چھوٹے چھوٹے بیجوں سے۔ دنیا کے حالات پر نظر کرنے سے ایسی امید کی جا سکتی ہے کہ شاید تمام روئے زمین پر ترقی کا دورہ شروع ہو گیا ہے۔ لوگ جو اس زمانے میں پیدا ہوتے ہیں خلقۃً متقدمین سے زیادہ ذہین اور روشن دماغ اور آزاد مزاج اور وسیع خیال ہوتے ہیں۔ پس اس زمانے میں رفارم کوئی ایسا بڑا مشکل کام نہیں کیوں کہ طبیعتیں خود رفارم کی طرف متوجہ ہیں جیسے بادبانی جہاز کا بادشرط* کے رخ پر لے چلنا یا ایک بوجھ کا اوپر سے نیچے کو آتارنا۔ پھر اگلے زمانوں میں رفارمر کو اپنے خیالات کا دوسروں تک پہنچانا سخت مشکل ہوتا تھا؛ وہ اُنھیں لوگوں کو اپنے خیالات سے آگاہ کر سکتا تھا جن کے ساتھ اُس کو بالمشافہ گفتگو کرنے کا موقع ملتا اور اس زمانے میں چھاپے اور ڈاک اور ریل نے ایسی سہولتیں بہم پہنچا دی ہیں کہ ایک بات کو مشتہر کرنا چاہو تو ساری دنیا میں ڈھنڈورا پیٹنے کے لیے شاید ایک مہینہ کافی ہے۔ پس ایک رفارمر کا صلہ یعنی شہرت اور شہرت بھی نیک نامی کے ساتھ اور خوشنودئی سرکار انگریزی اور جو منفعتیں اس پر مترتب ہوں اور ثواب عاقبت، سب کچھ مفت ہے اگر کسی کو خواہش ہو اور میں آپ کے لیے اس سے بہتر کوئی مشغلہ نہیں پاتا۔

ابن‌الوقت۔ ہمارے ملک میں تو یہ بالکل ایک انوکھا اور کٹھن کام ہے۔ آپ کے فرمانے سے جی تو میرا بھی چاہتا ہے مگر بوجوہ چند در چند ہمّت قصور کرتی ہے۔

---

* ہوائے موافق کشتی

نوبل صاحب ۔ سنیے صاحب ! ملک کی آب و ھوا رفارم ، رفارم پکار رھی ھے اور مجھے تو ایسا دکھائی دیتا ھے کہ عن قریب پردہ غیب سے رفارمر خروج کرنے والے ھیں ۔ میرا جی چاھتا تھا کہ یہ نیک نامی آپ کے حصے میں آتی اور فرض کیجیے کہ آپ کو اس کوشش میں ناکامیابی ھو ، جو کبھی ھونے والی نہیں اور میں اس کا ذمّہ لے سکتا ھوں ۔ تاھم آپ کا نقصان ھی کیا ھے ؛ یہ کیا کم ھے کہ اوّل آپ فلاح قوم کے محرّک ھوئے ۔

ابن الوقت ۔ تنہائی سے طبیعت اُلجھتی ھے ۔ ساری قوم کنفس واحدۃ میری مخالفت کرے گی ۔ میں اکیلا چنا بھاڑ کا کیا کرلوں گا ۔ ایسے بڑے کام کے انجام کو چاھئیں اعوان و انصار اور میں اپنے متعارفین میں کسی کو اس خیال کا نہیں پاتا ۔

نوبل صاحب ۔ میں ھندوستانی تو نہیں ھوں مگر جتنا میں ھندوستانیوں سے ملتا ھوں شاید کوئی انگریز نہ ملتا ھوگا ۔ جہاں تک مجھ کو معلوم ھے جتنے انگریزی خواں ھیں ، سب انھیں خیالات کے ھیں اور اُن کے دوست ، آشنا ، رشتہ دار ملا کر کم سے کم اُتنے ھی اور سمجھ لیجیے ۔ پھر جو لوگ انگریزوں کے ساتھ میل جول رکھتے ھیں ، کسی وجہ سے کیوں نہ ھو ، اکثر اُن میں کے بھی اور پھر اس قسم کے لوگوں کا شمار روز افزوں ھے ۔ خلاصہ یہ کہ یہ خیالات اگر نہیں ھیں تو مسلمانوں میں اور مسلمانوں میں بھی ممالک مغربی شمالی اور اودھ اور پنجاب کے مسلمانوں میں ؛ سو اودھ عیّاش اور پنجاب سپاھی ، دونوں کو ھندوستانی عملداریوں نے مدتوں جاھل رکھ کر ھیولیٰ صفت بنا دیا ھے جو ھر صورت کو آسانی سے قبول کر سکتا ھے ۔ عسیرالانقیاد * اگر ھیں تو

---

* مشکل سے مطیع ھونے والے ۔

ممالک شمالی مغربی کے مسلمان جن کو انگریزی عملداری کے امن و اطمینان نے اس بات کا موقع دیا کہ اپنے علوم کی یادگار کو جو فی زماننا بالکل بے سود ہیں، تازہ رکھیں۔

آپ کو یورپ جانے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن اگر آپ گئے ہوتے تو آپ پر ثابت ہو جاتا کہ اہل یورپ کی عظمت سلطنت میں نہیں ہے بلکہ ان کی تمام عظمت اُن علوم میں ہے جو جدید ایجاد ہوئے ہیں اور ہوتے جاتے ہیں اور جن علوم کے ذریعے سے انھوں نے ریل اور تار برقی اور سٹیمر اور ہزارہا قسم کی بکار آمد کلیں بنا ڈالی ہیں اور بناتے چلے جاتے ہیں اور ہر طرح کی کاری گری میں دوسرے ملکوں کے لوگوں پر سبقت لے جا کر روئے زمین کی دولت اپنے ملک میں گھسیٹ لے گئے اور گھسیٹے لیے چلے جا رہے ہیں۔ جس جس طرح کے ہنر اور کمال اہل یورپ میں ہیں، ان کے ہوتے ممکن نہ تھا کہ ان کو سلطنت نہ ہو۔ سلطنت ان کے کمالات کی قیمت نہیں ہے بلکہ رو کھن میں ہے اور ان کا حق لازمی ہے۔ سلطنت سے انگریزوں کو اگر کچھ مفاد ہے تو یہی کہ ان کے ملک کے چند آدمی یہاں آ کر نوکری کرتے اور تنخواہ پاتے ہیں۔

اس سے بھی ہم کو انکار نہیں کہ ہندوستانیوں کے مقابلے میں انگریزوں کو بڑی تنخواہ ملتی ہے اور کیوں نہ ملے: ان کے سفر دور و دراز کو دیکھو، اختلاف آب و ہوا کی وجہ سے ان کی جان جوکھم پر نظر کرو، ان کی اُجلی شان دار کثیر المصارف طرز زندگی اور ساتھ ہی اُن کی دیانتداری کا بھی خیال کرو تو معلوم ہو کہ انگریزوں کی تنخواہیں بہ واجب بڑی ہیں یا بنا واجب۔ یہ بھی انگریزوں ہی کے جگر ہیں کہ ان تنخواہوں پر کیسے کیسے سخت امتحان

دیتے ہیں اور اپنا دیس اور اپنے عزیز یگانے چھوڑ کر کالے
کوسوں نوکری کو نکل آتے ہیں کیوں کہ یہ بات ان
کے اصول زندگی میں داخل ہے کہ ہر انسان کو اپنی
قوت بازو سے کمائی کرنی چاہیے ۔ جب کہ خاندان شاہی میں
کا کوئی متنفس اس کلیّے سے مستثنیٰ نہیں اور خود مَلکۂ معظمہ
کے بیٹے پوتے قاعدے کے مطابق چھوٹے چھوٹے عہدوں
سے نوکری شروع کرتے ہیں تو دوسرے کس گنتی میں
ہیں ۔ یہی تنخواہیں اور یہی امتحان اور یہی پردیس اور
یہی اختلاف آب و ہوا اور یہی تمام حالات ہندوستانیوں کے
ہوں تو شاید گھر سے نکلنے کا نام نہ لیں ۔ ولایت تو
ولایت آج کسی کو برما جانے کا حکم دیا جاتا ہے تو
سارے گھر میں رونا پیٹنا مچ جاتا ہے ۔ اپنی ہمت کا تو یہ
حال اور انگریزوں کی تنخواہوں پر حسد ۔

بہر کیف یہی سہی کہ جتنے انگریز ہندوستان میں
نوکر ہیں حتیٰ گورے سب کے سب یہاں کی تنخواہیں پا پا
کر آسودہ حال ہو جاتے ہیں لیکن ان معدودے چند کے
تموّل سے اس ملک کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے
جس میں سے ان سے دو چند سہ چند ہر سال جزائر دوردست
میں جا کر سکونت اختیار کر لیتے ہیں ؛ صرف اس
وجہ سے کہ علم طب اور صفائی میں جو بہت ترقی ہوئی
ہے تو عمروں کا اوسط بڑھ گیا ہے ، بیماری اور موت میں
بہت کمی ہو گئی ہے ، توالدتناسل کثرت سے ہوتا ہے ،
ملک کی وسعت اس قدر کثیرالتعداد باشندوں کو کافی نہیں
اور اہل یوروپ کے تموّل کا اندازہ کسی قدر آپ اس بات سے
کر سکیں گے کہ وہاں دو روپے روز کی آمدنی کا آدمی

سوسائٹی میں اس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا جیسے یہاں ڈیڑھ دو آنے روز کا مزدور اور دس ہزار روپیہ سالانہ کہ یہ سولین کی پنشن کی مقدار غایت ہے ، سواری اور اپنے ذاتی ملازم رکھنے کے لیے مشکل سے کفایت کر سکتا ہے تو موٹی سے موٹی سمجھ کا آدمی بھی یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ سلطنت کی وجہ سے یوروپ میں یہ کچھ دولت پھٹ پڑی ہے -

اصلی بات یہ ہے کہ خدا کو اہل یوروپ کی ترقی ، اُن کی فلاح منظور تھی کہ ملک کے ملک کو واقعات نفس الامری اور موجودات خارجی میں غور کرنے کی دھن لگادی - اس غور سے سینکڑوں ، ہزاروں نئے نئے اصول دریافت ہوئے جن پر عمل کرنے سے انسان کی قدرت اس قدر بڑھ گئی کہ کچھ انتہا نہیں - غرض یوروپ کی دولتمندی کے اصل لٹکے سٹیم[1] اور الکٹریسٹی[2] وغیرہ یعنی ان کے علوم جدیدہ ہیں - ہالوے کا تو نام آپ نے سنا ہوگا ؛ اس شخص کے یہاں مرہم اور گولیوں کا کارخانہ ہے مگر اُس کی آمدنی کو آپ اس پر قیاس کر سکتے ہیں کہ چار لاکھ روپیہ سالانہ تو صرف اُجرت اشتہار کا خرچ ہے اور پھر کچھ بڑے کارخانوں میں اس کا شمار نہیں - ولایت جا کر دیکھیے تو معلوم ہو کہ تجارت کے مقابلے میں سلطنت ایک محض بے حقیقت چیز ہے - اگر تاجروں کے تموّل کا حال میں آپ سے بیان کروں تو آپ مبالغہ سمجھیں - پھر ہماری ولایت کوئی سیر حاصل ملک نہیں - پیداوار اور معدنیات کے اعتبار سے یوروپ کسی طرح ہندوستان سے لگّا نہیں کھا سکتا مگر

۱- بھاپ - ۲- قوت برق -

چونکہ ہندوستان کے لوگ نئے علوم سے ناواقف ہیں، خداداد سرمائے سے فائدہ اٹھانے کا سلیقہ نہیں رکھتے۔ ہندوستانیوں کی بد قسمتی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گی کہ مثلاً روئی ہندوستان سے ولایت جاتی اور وہ لوگ اپنی ہنر مندی سے اسی روئی کے انواع واقسام کے کپڑے بنا کر پھر ہندوستانیوں کے ہاتھ چند در چند نفع پر فروخت کرتے۔ پس ہندوستانیوں کے پنپنے کی اگر کوئی تدبیر ہے تو یہی کہ ان میں علوم جدید کو پھیلایا جائے اور ان کو اس بات کی طرف متوجہ کیا جائے کہ اپنی تمام قوت عقلی واقعات میں صرف کریں۔

یہاں کے لوگ بالطبع ذہین ہوتے ہیں؛ ادھر طبیعتیں لڑانی شروع کریں اور اس کا ان کو چسکا پڑ جائے تو بس ساری شکایتیں رفع ہیں اور از بس کہ تمام علوم جدیدہ جن پر ملکی ترقی کا انحصار ہے انگریزی میں ہیں، سب سے پہلے زبان انگریزی کو رواج دینا ہوگا۔

بعض لوگوں نے یہ بھی خیال کیا ہے کہ علوم جدیدہ کی کتابیں اردو میں ترجمہ کرائی جائیں مگر میں اس رائے سے متفق نہیں ہوں۔ اول تو زبان اردو میں اتنی وسعت نہیں کہ علوم جدیدہ کی تمام مصطلحات کا اردو ترجمہ ہو سکے؛ ناچار اکثر مصطلحات انگریزی کو اختیار کرنا پڑے گا اور ان کے تلفظ میں ضرور غلطیاں ہوں گی۔ میں نے اس طرح کی بعض طبّی اور بعض کیمیا اور بوٹنی* وغیرہ علوم کی کتابیں دیکھی ہیں، کوئی سطر انگریزی الفاظ سے خالی نہیں۔ یہ ترجمے اردو و انگریزی مخلوط، آدھا

* علم نباتیات۔

تیتر آدھا بٹیر ، مجھ کو تو سخت بدمزہ معلوم ہوتے ہیں اور
پھر کسی زبان کے ایک لفظ کی دوسری زبان میں کیسی
ہی ھندی کی چندی کیوں نہ کرو اُس کا ٹھیک مفہوم
دوسری زبان میں ادا ہونا مشکل ہے۔

اس کے علاوہ انگریزی زبان کے رواج دینے سے ایک
غرض تو علوم جدیدہ کا پھیلانا ہے اور دوسری غرض اور
بھی ہے یعنی عموماً انگریزی خیالات کا پھیلانا۔ اکیلے
علوم جدیدہ سے کام چلنے والا نہیں جب تک خیالات
میں آزادی ، ارادے میں استقلال ، حوصلے میں وسعت ،
ہمت میں عُلو ، دل میں فیاضی اور ہم دردی ، بات میں
سچائی ، معاملات میں راست بازی یعنی انسان پورا پورا
جنٹلمین نہ ہو اور وہ بدون انگریزی جاننے کے ہو نہیں
سکتا ۔ انگریزی داں آدمی کو اخباروں اور کتابوں کے
ذریعے سے انگریزی خیالات پر آگہی بہم پہنچانے کی بڑی
آسانی ہو سکتی ہے ۔ رفارم جس کی ضرورت ہندوستان کو
ترقی کے لیے ہے ، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک
ممکن ہو ہندوستانیوں کو انگریز بنایا جائے خوراک میں ،
پوشاک میں ، زبان میں ، عادات میں ، طرز تمدن میں ، خیالات
میں ، ہر ایک چیز میں اور وقت اس کے لیے چپکے چپکے کوشش کر
رہا ہے مگر اس کی کوشش دھیمی ہے اور اس پر نتیجے کا
مترتّب ہونا دیر طلب۔ لوگوں کے دلوں میں خود بخود اس طرح
کے خیالات بہ تقاضائے وقت پیدا ہو چلے ہیں ، کوئی رفارمر
کھڑا ہو کہ اس سلگتی ہوئی آگ کو جلدی سے بھڑکا دے ۔

ابن الوقت ۔ آپ کے سمجھانے سے دل میں آتا ہے کہ اس کام
کو کرنا چاہیے ۔ اس کے ضروری اور مفید ہونے میں تو کچھ شک

نہیں مگر یہ تو فرمائیے کہ اس کی ابتدا کس طرح پر کی جائے ؟

نوبل صاحب ۔ رفارمر بننے کی بسم اللہ یہ ہے کہ رفارمر جو کیفیت لوگوں میں پیدا کرنی چاہتا ہے پہلے خود اُس سے متکیّف ہولے اور اپنا نمونہ دکھا کر لوگوں کو تقلید کی ترغیب دے ۔

ابن الوقت ۔ اگر عرض کرنا سوء ادب نہ ہو تو میں کہتا ہوں کہ آپ ہی رفارمر کیوں نہیں بنتے ۔ یوروپ ٹھہرا آپ کا وطن، وہاں کے حالات سے تو آپ بالتفصیل واقف ہیں؛ رہا ہندوستان، آپ نے ذاتی شوق سے ہر طرف کی سیروسیاحت کی ہے، ہر قوم و ملت کے ہندوستانیوں کے ساتھ آپ کو اختلاط بھی بہت رہا ہے اور بلاتخصیص قوم و مذہب و ملک عام انسانی ہمدردی بھی آپ کے دل میں کچھ کم نہیں تو اس صورت میں منصب رفارم کے لیے آپ سے بہتر اور کون ہوگا ؟

نوبل صاحب ۔ میں آپ کے ان خیالات کا شکر گزار ہوں مگر میرا یوروپین ہونا منصب رفارم کے منافی ہے ۔ ہم ملکی انگریزوں میں شاذ نادر کوئی ایسا ہوگا جس کے دل میں اس طرح کے خیالات نہ گزرتے ہوں ۔ ہم ہی میں کا ایک گروہ مشنری لوگوں کا ہے جن کی تمام ہمّت اسی کام میں مصروف ہے مگر چونکہ ان کے اغراض میں مذہب کا شمول ہے، ان کی تمام کوششیں رائگاں ہیں ۔ شروع شروع میں تو پادریوں نے اکثر ہنود کے چند نوجوان لڑکوں کو اور بعض مسلمانوں کو بھی عیسائیت کی طرف راغب کر لیا تھا اور کبھی کبھی سننے میں آتا تھا کہ فلاں ہندو یا مسلمان نے اصطباغ لیا مگر مذہب کا عجیب معاملہ ہے، دل کی تسلی کا نام مذہب ہے؛ پھر تو لوگ چوکنّے ہو گئے ۔ پادریوں کی بڑی چوٹ ہنود پر تھی، سو اُنھوں نے بھی کاٹ چھانٹ کر اپنے مذہب کو ایسا کر لیا کہ کوئی ہندو انگریزی لکھ پڑھ کر

بگڑنا چاھتا ھے تو کوئی نہ کوئی سماج اُس کو اپنے میں ملا لیتا ھے۔ غرض مدّتوں سے غیر مذھب کے لوگ عیسائی ھوتے ھواتے نہیں الاّ شاذ۔ اب پادریوں کی بڑی کامیابی اس پر آ کر ٹھہری ھے کہ قحط کی دعائیں مانگا کرتے ھیں؛ کال پڑے اور صاحب ضلع سے لاوارث بچوں کو پرورش کے لیے لیں، اُن کو اپنے طور پر لکھائیں، پڑھائیں، تربیت کریں، یہ بچے بڑے ھو کر عیسائی ھوں؛ اللہ اللہ خیر صلاح! پس فرض کیجیے کہ مشنری نہیں کوئی انگریز رفارمر بننا چاھے تو مذھبی بدگمانی کا کیا انسداد؟ انگریز کی تو صورت دیکھ کر لوگ ھتّے سے اکھڑ جائیں، سنتے بھی تو نہ سنیں، مانتے بھی تو نہ مانیں۔ رفارمر چاھیے اپنی قوم کا کہ وہ تردید کے عوض تائید کا اور اعتراض کی جگہ سند کا کام دے۔

ابن الوقت ۔ بہت خوب، خدا نے چاھا تو میں اس کام کو شروع کروں گا ع ھرچہ بادابادما کشتی در آب انداختیم، لیکن آپ سے توقع کرتا ھوں کہ آپ میرے مددگار رھیں گے۔

نوبل صاحب ۔ نہ صرف میں بلکہ تمام انگلش کمیونٹی* اور سرکار اور خود آپ ھی کی قوم کے بہت سے اشخاص معقول پسند جن کے سروں میں یہ خیالات بھرے ھوئے ھیں اور ضعف ھمت کی وجہ سے سہارا ڈھونڈ رھے ھیں کہ کوئی مقدمۃ الجیش بنے تو ھم پیچھے ھو لیں۔ اور سنیے مجھ کو کامل یقین ھے کہ بہت جلد آپ کو اس ارادے میں کامیابی ھوگی۔ لوگوں کے مادّے تیار ھیں، تھوڑے ھی دنوں میں میں آپ کو دیکھوں گا کہ ایک بڑا گروہ آپ کی رائے کی تحسین کرتا ھے، گویا وہ آپ کی اُمت ھیں اور آپ اُن کے امام۔

اللہ اکبر! نوبل صاحب اور ابن الوقت کون وقتوں کے باتوں میں لگے ھیں۔ گیارہ بجے کے بیٹھے بیٹھے چار بجا دیے اور باتوں

* انگریزی سوسائٹی۔

کا سلسلہ ہے کہ منقطع نہیں ہونے پاتا ۔ چپڑاسی ، خدمت گار ہیں کہ آئینوں میں سے جھانک جھانک کر چلے جاتے ہیں ۔ جمعدار چپکے چپکے ایک چپڑاسی سے کہ رہا ہے تمھیں کہتے تھے نہ کہ ان کو ملاقات سے پہلے کمرے میں کیوں بٹھایا ، اب دیکھا اس لیے بٹھایا تھا ۔ صاحب کی نظروں میں آج جو یہ ہیں دوسرا نہیں ہونے کا ۔ اتنے میں نوبل صاحب اور ابن الوقت دونوں باتیں کرتے ہوئے باہر نکلے ۔ ابن الوقت کہتے ہوئے چلے آرہے تھے کہ بیچ میں آپ کو ضرورت ہو تو بلوا بھیجیے گا ورنہ جس دن مجھ کو حاضر ہونا ہوگا ایک دن پہلے آپ کو اطلاع دوں گا اور ہاں جان نثار خاں کو اتنی اجازت دیجیے کہ یہاں کے کام سے فارغ ہو کر آج رات کو میرے یہاں رہیں، علی الصّباح توپ سے پہلے پھر اپنی نوکری پر آموجود ہوں گے ۔

بُری بات بھی کتنی جلد شہرت پکڑتی ہے ۔ گیارہ بجے کے قریب ابن الوقت نے نوبل صاحب کے ساتھ کھانا کھایا اور ظہر کی اول جماعت کے بعد محلے کی مسجد کے نمازی آپس میں تذکرہ کررہے تھے کہ کیوں جی میاں ابن الوقت کی نسبت بازار میں یہ کیا چرچا ہو رہا ہے کہ کرسٹان ہو گئے ؟

ایک نمازی ۔ کرسٹان ہونے کی تو نہیں سنی ، اتنا البتہ سنا ہے کہ وہی انگریز جو ان کے یہاں غدر میں چھپا تھا ، اُس کو شہر میں کوئی بڑا بھاری کام ملا ہے ؛ یہ اُس کے پاس آتے جاتے رہتے ہیں ، آج اُس کے ساتھ کھانا کھا لیا ۔

دوسرا ۔ میاں تم بھی عجیب آدمی ہو ۔ . . نہیں چھی چھی ، انگریز کے ساتھ کھانا کھایا تو وہ کرسٹان ، اُس کی ہفتاد پشت ، کرسٹان ؛ کیا کرسٹان کے سر میں سینگ لگے ہوتے ہیں ؟

تیسرا ۔ اس انگریز کے ساتھ اُنھوں نے آج کچھ نیا کھانا

نہیں کھایا ؛ سارے غدر وہ انگریز ان کے گھر رہا اور برابر اُن کے ساتھ کھاتا رہا ۔

دوسرا ۔ دیکھو تو اس ظالم نے کیا غضب کیا ہے! خیر انگریز کو چھپایا تھا تو وہ جانے اُس کا ایمان جانے مگر انگریز کے ساتھ کھا کر اُس کو ہم لوگوں کے ساتھ کھانا پینا نہیں رکھنا چاہیے تھا ۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ شاید روزے اور نماز سب کی قضا لازم آئے گی ۔ دیکھو مولوی صاحب (امام مسجد) سلام پھیر لیں تو مسئلہ پوچھا جائے ۔

پہلا ۔ شہر پر یہ کچھ تو آفتیں ٹوٹ رہی ہیں کہ کام والے کام سے گئے، نوکر نوکری سے ، گھر والے گھر سے بے گھر ہوئے اور ہنوز کسی کی جان کا بھروسا نہیں ، تحقیقات بغاوت درپیش ہے ؛ وہی کہاوت ہے کہ کر تو ڈر اور نہ کر تو خدا کے غضب سے ڈر۔ تم کو اگر اپنی جان دوبھر ہے تو مرنے کے سو حیلے ، ہزار بہانے ؛ ہم غریبوں کو زبردستی اپنی آنچ میں کیوں دھکیلتے ہو۔ «دیوار ہم گوش دارد» ۔ یہی بات اگر کوئی میاں ابن الوقت سے جا لگائے تو دم کے دم میں ساری مشیخت کرکری ہو جائے ۔ نا بابا ہمارا تو اس وقت سے جماعت کی نماز کو سلام ہے ۔ کس کی شامت آئی ہے کہ بیٹھے بٹھائے کھینچا کھینچا پھرے ۔

اتنے میں تو مولوی صاحب دعا سے فارغ ہو کر منہ پر ہاتھ پھیر رہے تھے کہ اُس کٹّے نمازی نے مسئلہ پوچھا ہی پوچھا ۔ مولوی صاحب نے جواب دیا کہ انگریز کے ساتھ کھانے سے آدمی عیسائی نہیں ہو جاتا مگر وعید «من* تشبہ بقوم

---

*۔ جو شخص کسی قوم کے ساتھ مشابہت پیدا کرے وہ بھی انھیں میں سے ہے ۔

فھو سنھم کے اس پر متوجہ ہوتا ہے، مسلمان کو اس سے محترز رہنا چاہیے لیکن «الخبر یحتمل الصدق والکذب[1]» افواہ کا کیا اعتبار اور لو فرضنا سچ بھی ہو تو «لاتزر[2] وازرۃ وزر اخرای» ایک شخص کا فعل اُس کے اسلاف[3] کی طرف کیوں متعدی ہونے لگا۔

غرض اُس وقت تو نمازی متفرق ہو گئے مگر اتنوں کے کان پڑی ہوئی بات سارے محلّے میں ایک غل سا پڑ گیا۔

ابن الوقت لوٹ کر گھر آیا تو ہر طرف سے آنگلیاں آٹھتی تھیں اور جن لوگوں کا معمول صاحب سلامت میں تقدیم کرنے کا تھا، وہ بھی آنکھیں چراتے اور منہ چھپاتے تھے۔ جوں ابن الوقت نے مردانے میں پاؤں رکھا ہے کہ زنان خانے سے عورتوں نے ڈیوڑھی میں آ آ کر جھانکنا شروع کیا۔ ابن الوقت لوگوں کی یہ مدارات دیکھ کر جی ہی جی میں کھٹکا تو سہی مگر نہ کسی نے سوڑ پھوڑ کر اُس سے کچھ پوچھا اور نہ اُس نے اپنی طرف سے ابتدا کا کرنا مناسب سمجھا۔ ابھی درباری لباس کے بوجھ سے بھی سبکدوش نہیں ہوا تھا کہ اندر سے پھوپھی صاحب کی طلب آئی۔ ابن الوقت کے ساتھ چار آنکھیں ہوتے ہی وہ نیک بخت بی بی آپ ہی بولیں ”میں تو کچھ نہیں کہتی، بس جھوٹوں سے خدا ہی سمجھے۔ سدا سے لوگوں کو اسی گھر کی جلن رہی، پر انشاءاللہ لوگ جلیں گے اور ہم پھلیں گے۔ تیسرے پہر سے سنتے سنتے کان بہرے ہو گئے کہ دشمنوں کو انگریزوں نے اپنے مذہب میں ملا لیا، بُرا چاہنے والوں کو اپنا جھوٹا کھانا کھلا دیا۔ کہنے والوں کو

۱- خبر میں دونوں طرح کے احتمال ہیں سچ ہو یا جھوٹ۔
۲- ایک کا بوجھ دوسرے پر نہیں لادا جائے گا۔
۳- بزرگوں۔

اب گھر میں آنا ہی نہیں ملنے کا اور میں ایک ایک سے کہتی تھی کہ نوج! میرا بھتیجا اس قابل ہی نہیں، وہ تو انگریزوں کو عقل سکھانے والا ہے۔ لاکھ جتن کریں گے ایک نہ ایک بات مغز سے ایسی اُتار کر کہے گا کہ سب کے سب اُس کا منہ دیکھنے لگیں گے۔ قربان جاؤں اُس غفور رحیم کے کہ تم بھلے چنگے لوٹ کر آئے بیٹا۔ اگر سچ مچ انگریزوں کی نیت بدلی ہوئی دیکھو جیسا کہ لوگ پکارا کر رہے ہیں تو پھوپھی صدقے گئی ایسی خیر خواہی پر لعنت بھیجو۔ قلعہ غارت ہوا تو خیر خدا کی مرضی؛ جس نے جان دی ہے وہ کہیں نہ کہیں سے اُن بزرگوں کے طفیل میں جن کے ہم نام لیوا ہیں، نان بھی ضرور دے گا۔"

ابن الوقت ۔ یہ کیا بیہودہ بات آپ سے کسی نے آ کر کہہ دی ہے ۔ حقیقت تو اسی قدر ہے کہ میں نوبل صاحب کے پاس گیا تھا ۔ کھانے کا تھا وقت، اُنھوں نے اصرار کر کے مجھ کو بھی میز پر بٹھا لیا ۔

پھوپھی ۔ پھر تم نے کھایا تو نہیں۔

ابن الوقت ۔ کھایا تو کیا ہوا، وہی نوبل صاحب ہیں نا جو کامل تین مہینے ہمارے گھر مہمان تھے ۔

پھوپھی ۔ خیر وہ الگ بات تھی ۔

ابن الوقت۔ آپ تو قرآن کا ترجمہ پڑھی ہوئی ہیں ۔ سورہ مائدہ کے پہلے ہی رکوع میں دیکھ لیجیے «وطعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم وطعامکم حل لھم» * کے کیا معنے لکھے ہیں ۔ پھر ایک انگریز کے ساتھ کھانا کھا لینے کے علاوہ آپ بے دینی

* اہل کتاب کا کھانا تم کو حلال ہے اور تمھارا ان کو۔

کی کوئی اور بات بھی مجھ میں دیکھتی ہیں۔ میں بدستور نماز پڑھتا ہوں ۔ آپ کو یاد ہوگا عین رمضان کا مہینہ تھا کہ نوبل صاحب ہمارے یہاں آئے، میں دن بھر روزہ رکھتا تھا؛ خدا کے فضل سے ایک روزہ قضا نہیں کیا اور رات کو صاحب کے ساتھ کھانا بھی کھاتا تھا ۔ صبح کی تلاوت جو میرا معمول تھا، میں نے اس کو ناغہ نہیں ہونے دیا ۔ میں نہیں جانتا کہ مسلمان میں اور کیا سرخاب کا پر لگا ہوتا ہے ۔ مذہب کیا چیز ہے، بندے کا معاملہ خدا کے ساتھ؛ پس کسی شخص کو دوسرے کے مذہبی معاملے میں دخل دینے کی ضرورت نہیں اور فرض کیجیے کہ نعوذ باللہ من ذالک اگر میں کرسٹان ہونا چاہوں تو کون مجھ کو روک سکتا ہے ۔ میں جانتا ہوں کہ دنیا کے اعتبار سے کنگالوں کے زمرے سے نکل کر امیروں کے گروہ میں جا ملوں گا، محکوموں سے حاکموں میں، احمقوں سے عقلمندوں میں، بے عزتوں سے عزّت والوں میں، مگروہ بھی کچھ مذہب ہے جس پر دنیا کا لالچ یا خوف اثر کر سکے ۔

فصل نہم

ابن الوقت تبدیل وضع کے بارے میں جان نثار سے صلاح اور استمداد کرتے ہیں

ابن‌الوقت یہ کہ کر پھر مردانے میں چلا آیا۔ نماز مغرب کے تھوڑی دیر بعد جان نثار آ پہنچا۔ بیٹھتے کے ساتھ ہی پہلی بات اس نے یہی کی کہ ''آج صاحب ہوا خوری کو بھی نہیں گئے۔ آپ کے چلے آنے کے بعد سے جو چٹھیاں لکھنے بیٹھے تو میرے شیر نے چراغ ہی جلا دیے۔ پھر مجھ کو بلا کر آپ کے پاس حاضر ہونے کا حکم دیا کہ ابھی چلے جاؤ۔ صاحب آپ سے اس قدر خوش ہیں کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ جو ملاقاتی آتا ہے آپ کا تذکرہ اس سے ضرور کرتے ہیں اور میز پر تو صاحب لوگوں میں برابر آپ ہی کا مذکور رہتا ہے۔ وہ تو آپ شہر میں رہتے ہیں اور آپ کا مکان بھی پیچ در پیچ گلیوں میں ہے اور گلیاں بھی صاف ستھری نہیں؛ اگر کہیں آپ انہیں لوگوں کے میل میں شہر کے باہر کسی بنگلے میں رہتے ہوتے تو دیکھتے کہ سارے سارے دن اور آدھی رات تک انگریز آپ کا پیچھا نہ چھوڑتے۔ صاحب ہیں تو یہ لوگ کہنے کو کافر مگر مروّت اور خدا ترسی اور اخلاق، غرض نیکی کی کل باتیں جیسی میں نے ان لوگوں میں دیکھیں ہم لوگوں میں تو کہیں پاسنگ بھی نہیں۔ یہ نہ منے تک کے ہوّا ہیں اور ملے پیچھے ایسے ملتے ہیں کہ کیا کوئی اتنا ملے گا۔

میم صاحب کی چٹھی ولایت سے آتی ہے تو سائیسوں تک کو سلام لکھتی ہیں اور نام بنام ایک ایک کے بی‌بی بچوں کی خیر و عافیت پوچھتی رہتی ہیں۔ سامنے والی نیلی کوٹھی میں فوج کے ایک صاحب رہتے ہیں، اُن کی میم صاحب اور بابا لوگ بھی ہیں۔ کل نہیں پرسوں کوئی رات کے دو بجے ایک آیا کے سینے میں درد اُٹھا، اُسی وقت صاحب آپ جا کر ڈاکٹر کو لائے اور دونوں میاں بی‌بی صبح کے پانچ بجے تک اُس آیا کے پاس سے ٹلے نہیں۔ بھلا آج کوئی ہندوستانی سردار ہے جو ادنیٰ نوکروں کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ کرے۔ معاملے کے ایسے سچے کہ کسی نوکر کو کیسے ہی ناراض ہو کر موقوف کریں، کیا مجال کہ کسی کی تنخواہ کی کوڑی لگا رکھیں۔ ہم لوگوں کی طرح نہیں کہ پہلے چوری کی تہمت کا منصوبہ سوچ لیں، تب نوکر کے نکالنے کا نام لیں اور تنخواہ تو تنخواہ اگر نوکر تن بدن کے کپڑے سلامت لے کر عزّت آبرو سے رخصت ہو جائے تو بڑا خوش نصیب۔ ہم لوگوں میں سے جو کوئی تھوڑے دنوں کے لیے بھی انگریز کو چھو گیا ہے، پھر کسی ہندوستانی کی نوکری اُس سے ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر مذہب کا فرق نہ ہوتا تو چاہے آپ اس کو نمک کی تاثیر سمجھیں، انگریز میرے نزدیک پوجنے کے قابل تھے۔ بال بچوں کی طرح نوکروں کی پرداخت کرتے ہیں''۔

ابن الوقت۔ سب انگریز ایک مزاج کے نہ ہونگے۔ اتفاق سے تم کو جن لوگوں کے ساتھ معاملہ پڑا اچھے ہی اچھے ملے۔

جاں نثار۔ ہاتھ کی پانچ اُنگلیاں تو کیوں کر برابر ہو سکتی ہیں؛ اچھے برے سبھی جگہ ہیں مگر اتنا فرق ضرور

ہے کہ انگریزوں میں اکثر اچھے اور ہم میں اکثر برے ہیں ۔"

ابن الوقت۔ میں سمجھتا ہوں شاید فوجی انگریز زیادہ اکھڑ اور بد مزاج ہوں گے ۔

جاں نثار۔ ہرگز نہیں! ایسے بھلے مانس، دل کے سخی اور بے تکلف کہ ملکی انگریز کی دوستی نہ فوجی کی صاحب سلامت؛ ہاں دوغلے جن میں ہندوستانیوں کا تخم ملا ہوا ہے، اُن کی جس قدر برائی کی جائے تھوڑی ۔ «خدا گنجے کو ناخن نہ دے»، ان کا بس چلے تو ہندوستانیوں کو کچا کھا جائیں ۔ ان دنوں کا تو کچھ ٹھکانا نہیں، غدر کے دنوں میں ہندوستانیوں کے ہاتھ سے طرح طرح کی ایذائیں ان لوگوں کو پہنچی ہیں ۔ اس سے دلوں میں غصّہ بھرا ہوا ہے، اور سری کا ہوتا تو ملک میں گدھوں کا ہل پھروا کر بھی بس نہ کرتا ۔ پھر بھی میں یہی کہوں گا کہ یہ اُنہیں لوگوں کے حوصلے ہیں کہ رعیت نے اتنا ظلم کیا اور ان کو رعیت کا اُجاڑنا منظور نہیں ۔ صاحب تو ایسا فرماتے تھے کہ یہ پکڑ دھکڑ بھی تھوڑے دن کی اور ہے ۔ ہمارے یہاں تو صاحب لوگوں کا بڑا جمگھٹا رہتا ہے ۔ یہ لوگ آپس میں اکثر غدر ہی کی باتیں کیا کرتے ہیں ۔ میں انگریزی خوب تو نہیں سمجھتا مگر اتنا معلوم ہے کہ اب رحم کی نظر زیادہ ہے ۔ یہ غدر بھی ایک کسوٹی تھی ۔ جس طرح کھوٹے کھرے ہندوستانی الگ پہچانے گئے، اسی طرح برے بھلے انگریز؛ جو لوگ ان میں شریف خاندانوں کے ہیں وہ درگذر ہی کی رائے دیتے ہیں ۔ ایک روز ہمارے صاحب تذکرہ کرتے تھے کہ ولایت میں پہلے یہ قاعدہ تھا کہ سرکار

شریف خاندانوں کے لڑکوں کو اپنے خرچ سے پڑھا لکھا کر ہندوستان کی نوکریوں کے واسطے تیار کرتی تھی۔ اُن دنوں جو انگریز آتے تھے سب خاندانی ہوتے تھے۔ اب چند سال سے سرکار نے اس دستور کو موقوف کرکے امتحان کا طریقہ جاری کیا ہے۔ لوگ اپنے طور پر ہندوستان کی نوکری کے لیے لیاقت بہم پہنچا کر امتحان دیتے ہیں، جو امتحان پاس کرتا ہے اُس کو نوکری مل جاتی ہے۔ شریف اور رذیل کا امتیاز نہیں ہوتا؛ اکثر عوام کے بلکہ دھوبی، حجام، موچی، بھٹیارے وغیرہ پیشہ وروں کے لڑکے جن کی ولایت میں کچھ بھی عزت نہیں، محنت کرکے امتحان پاس کر لیتے ہیں۔ اگرچہ ان کے تعلیم یافتہ ہونے میں کچھ شک نہیں مگر تاہم ع اصل بد از خطا خطا نہ کند، ان کی ذات سے رعایا کو کم تر فیض پہنچتا ہے۔ مگر میں تو یہی کہوں گا کہ ان کے برے بھی ہمارے اچھوں سے اچھے اور بہت اچھے ہیں۔ آپ ان سے ملیں تو میرے کہنے کی آپ کو تصدیق ہو۔

ابن الوقت۔ نوبل صاحب بھی مجھ کو یہی صلاح دیتے ہیں مگر وہ چاہتے ہیں کہ مجھ کو برابری کے دعوے سے انگریزوں میں ملائیں۔

جاں نثار۔ ملنے کا مزہ بھی برابری ہی میں ہے۔ یہ کیا کہ اُمیدوارانہ گئے، اردلیوں کے دھکے کھائے، سارے دن کی محنت میں دور سے سلام ہوا، نہ بات، نہ چیت اور خدانخواستہ آپ کو اس طرح ملنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ چلیے اُدھر ہی ایک کوٹھی کرایے لے کر رہیے تو بڑا مزہ ہو۔

ابن الوقت۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ انگریز مجھ کو اپنی سوسائٹی میں لینا پسند کریں گے؟

جان نثار۔ آپ کو اور آپ کے غلاموں کو۔ آپ کی صورت شکل اور شان میں ماشاء اللہ کسی طرح کی کمی نہیں۔ خدا نے آپ کو امیر کیا ہے، کچھ یہ بات نہیں کہ آپ اونچی حیثیت سے رہ نہیں سکتے۔ انگریزی میں کسی قدر کمی ہے، سو آپ باتیں سمجھ تو سب لیتے ہیں، بولنے میں جھجک ہے، دو چار مہینے میں ملنے جلنے سے خود بخود نکل جائے گی اور سب سے بڑھ کر تو صاحب کا زبردست پایہ ہے؛ خدا اُن کو سلامت رکھے، آج سٹیشن میں اُن کی وہ بات بن رہی ہے کہ واہ واہ اور میں سمجھتا ہوں کہ کوئی دن جاتا ہے آپ کو کچھ کام بھی ضرور ہونے والا ہے۔

ابن الوقت۔ مگر ہندوستانی لوگ اس کی نسبت کیا خیال کریں گے؟

جان نثار۔ ہندوستانی تو یہی سمجھیں گے کہ آپ کرسٹان ہو گئے اور میں تو جانتا ہوں اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ کوئی بیسیوں آدمیوں نے تو آج ہی مجھ سے پوچھا ہے۔

ابن الوقت۔ تم انگریز کے ساتھ کھانا کھانے کو کیسا خیال کرتے ہو؟

جان نثار۔ صاحب کے منہ سے سنا ہے کہ روم اور مصر اور ایران اور عرب کہیں کے مسلمان پرہیز نہیں کرتے، بے تکلف انگریزوں کے ساتھ کھاتے پیتے ہیں مگر ہمارے ملک کے لوگ تو بڑی چھوت مانتے ہیں۔

ابن الوقت۔ خیر جیسی بپتی آئے گی، دیکھی جائے گی۔ میں نے نوبل صاحب سے وعدہ کر لیا ہے مگر انگریزوں کی شان کے مطابق سامان کا بہم پہنچنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

جان نثار۔ جناب ذرا بھی مشکل نہیں۔ اس کا تو آپ خیال بھی

نہ کیجیے - کلکتے میں جنرل سپلایر* ایک کمپنی ھے ، اُس کا ایجنٹ یہاں آیا ھوا ھے - ایک بنگلہ تجویز کر کے اُس کو دکھا دیا جائے گا کہ اس طور پر اُس کو سجا دو- ھمارے صاحب نے بھی تو یہی کیا تھا - اس کوٹھی کی تو چھت تک بھی اُکھاڑ کر لے گئے تھے - صاحب جھجّر جاتے ھوئے اُس ایجنٹ سے کہتے گئے - اُس نے ایک ھی مہینے میں مکان بھی بنوا دیا اور جتنا ساز و سامان آپ دیکھتے ھیں ، سب مہیا کردیا - ھماری کوٹھی کے مقابل سڑک پار ۲۴ نمبر کا بنگلہ خالی ھے؛ صاحب سے بھی قریب ھے ، موقع بھی اچھا ھے، شاید چالیس ، پینتالیس ، ایسا ھی کچھ کرایہ ھے - اگر حکم ھو اُس کو روک دیا جائے - جس مہاجن کا بنگلہ ھے ، اُس نے حال ھی میں اس کو درست کرایا ھے ، غدر میں یہ بھی بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا - جنرل سپلایر کا ایجنٹ دو ھفتے کے قریب میں جیسا فرمائیے گا ، سجا دے گا - ان لوگوں میں ٹھہرانے چکانے کا دستور نہیں ، بل بنا کر بھیج دے گا ، آپ اُس کی رقم چکا دینا ؛ نہ ھڑ ھڑ نہ کھڑ کھڑ بلکہ فرمائیے تو میں صاحب سے عرض کر دوں ، وہ تو خوشی خوشی اس کا انتظام کر دیں گے مگر کہیں گے وہ بھی ایجنٹ ھی سے -

ابن الوقت- نہیں صاحب کو کیوں تکلیف دو ، تمھیں جس طرح مناسب سمجھو کر دھر لو اور ھاں بھائی کپڑوں کے بارے میں کیا کہتے ھو ؟

جان نثار - ھر چیز میل سے بھلی معلوم ھوتی ھے؛ پیروں میں انگریزی ھاف بوٹ ، ٹانگوں میں ڈھیلے پائچوں کا پاجامہ ، آدھی پنڈلیاں کھلی ھوئی یا کوٹ پتلون کے ساتھ سر پر عمامہ یا اسی

---

*جو شخص ھر طرح کا سامان مہیا کر دے -

طرح کی دوسری بے جوڑ چیزیں مجھ کو تو بری معلوم ہوتی ہیں۔ نقل کیجیے تو پوری پوری کیجیے ورنہ دونوں جگہ ہنسی ہوگی، آگے آپ کو اختیار ہے۔

ابن الوقت۔ خیر تو ایک سال کے کپڑوں کے لیے بھی اسی ایجنٹ سے فرمائش کر دینا اور چونکہ تم انگریزی سوسائٹی کے دستور سے بہ خوبی واقف ہو، اس بات کا خیال رکھنا کہ انگریزوں کی نظر میں سبکی نہ ہو۔

جاں نثار۔ کیا مجال، خدا نے چاہا تو آپ کی کوٹھی سرتاپا ایسی آراستہ ہو کہ لیڈیاں دیکھنے کو آئیں اور ساری چھاؤنی میں آپ کے کھانوں کا غل ہو۔ اصل چیز ہے روپیہ اور سلیقہ، سو روپے کی خدا کے فضل سے آپ کے پاس کمی نہیں اور سلیقہ تو خاک چاٹ کر کہتا ہوں، برسوں میم صاحب کی جھڑکیاں سہیں، گھُرکیاں سنیں، صاحب نے لاٹ گورنر کو کھانا دیا، شاہزادۂ بلجیم کی دعوت کی؛ خیر اپنے منہ سے اپنی بڑائی کرنی مناسب نہیں، دیکھ لیجیے گا۔ اس بات کو آپ دریافت کر لیجیے کہ چھاؤنی میں جب کبھی کوئی بڑا کھانا دیا جاتا ہے، آپ کے خانہ زاد ہی کو بلاتے ہیں۔ فرنیچر* کا سجانا بڑا مشکل کام ہے، اچھے اچھے چوک جاتے ہیں مگر میم صاحب نے میرے پیچھے بڑی جان ماری ہے تب کہیں برسوں میں جا کر یہ بات حاصل ہوئی ہے۔ خیر اور سب باتوں کو تو میں دیکھ بھال لوں گا، مگر آپ کو خود بھی انگریزی قاعدہ سیکھنا چاہیے کیونکہ آپ ہوں گے صاحب خانہ؛ آؤبھگت، استقبال، رخصت، مزاج پرسی، تواضع وغیرہ وغیرہ بہت سے کام آپ کو اپنی ذات سے کرنے پڑیں گے، ایک ذرا سی بے تمیزی

---

* اسباب خانہ داری۔

سے سارا کیا دھرا اکارت ہو جاتا ہے۔ لیڈیوں کے ساتھ ملنے میں خاص کر بڑی احتیاط کرنی پڑتی ہے۔ میم صاحب کی دی ہوئی اٹیکٹ* کی میرے پاس ایک کتاب ہے، میں آپ کے پاس بھیج دوں گا۔ ایک دفعہ وہ کتاب نظر سے گزر جائے گی تو سارے کام سدھ ہو جائیں گے اور آخر ان لوگوں کو ایک دوسرے سے ملتے ہوئے بھی تو آپ دیکھیں گے۔ شروع شروع میں ذرا اس کا خیال رکھیے گا کہ یہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ کیونکر برتاؤ کرتے ہیں۔

نوبل صاحب بیچارے کا کچھ دوس نہیں۔ انھوں نے اپنے انگریزی خیالات کے مطابق نیک نیتی سے اپنے دوست ابن الوقت اور اس کی قوم کے حق میں مفید سمجھ کر اس کو ایک صلاح دی۔ ابن الوقت دودھ پیتا بچہ نہ تھا کہ نوبل صاحب کے جھانسے میں آ گیا؛ اس کو اپنی قابلیت، قوم کی حالت، اطراف و جوانب، نتائج و عواقب پر نظر کرکے کام کرنا تھا۔ بات یہ ہے خود اسی کی طبیعت شروع سے اس طرف راغب تھی۔ نوبل صاحب کا کہنا اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہوگیا۔ اپنی قوم اور قوم کی ہر چیز کی حقارت اور انگریز اور ان کی ہر بات کی وقعت پہلے سے اس کے ذہن میں مرتکز تھی مگر وہ ایک شخصی رائے تھی نہ کسی کے حق میں مفید، نہ کسی کے لیے بہ کارآمد۔ اتنی بات ابن الوقت کو نوبل صاحب نے سجھائی کہ اس خیال سے کس طرح پر اس کو اور اس کی قوم کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

ابن الوقت کی ظاہری حالت کے بدلنے میں ابھی دیر ہے مگر جاں نثار کے چلے جانے کے بعد بھی وہ اسی خیال میں مستغرق ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے اس کو ایسا معلوم ہوا کہ گویا

---

* آداب معاشرۃ۔

نوبل صاحب کی سی کوٹھی ہے اور خانہ باغ میں کرسی بچھائے صاحب لوگوں کی شکل بنائے بیٹھا ہوا، شب ماہ کے مزے لے رہا ہوں۔ پھر وہ آپ ہی آپ چونک پڑا کہ اس حالت میں کسی نے مجھ کو دیکھا تو نہیں۔ تب وہ اس خیال کو دفع کرتا ہے کہ آو کھلی میں سر دیا تو دھاکوں کا کیا ڈر۔ رہ رہ کر اس کو خیال آتا ہے کہ اپنے عزیز رشتہ دار، دوست آشنا، جان پہچان، اہل محلہ، اہل شہر، اہل ملک میرے ساتھ کیا معاملہ کریں گے۔ یہ تصوّر ہے کہ رفارم پر طبیعت کو مطلقاً نہیں جمنے دیتا کہ اس کا کچھ منصوبہ سوچے۔ نوبل صاحب کو زبان دیے پیچھے اس ارادے سے دست کش ہونا کسی طرح ممکن نہیں۔ کبھی جی ہی جی میں اپنے تئیں ملامت کرتا ہے کہ جلدی ناحق کی، پھر کہتا ہے اس سے بہتر اور کون سا موقع ہوگا کہ نوبل صاحب پُچ پر ہیں۔

غرض ابن الوقت ہر وقت سوچ میں رہتا تھا اور زیادہ دیر تک سوچتے سوچتے گھبرا اُٹھتا تھا اور چاہتا تھا کہ جو کچھ ہونا ہے پرسوں کا ہوتا کل اور کل کا ہوتا آج ہو جائے۔ صرف ایک آدمی نوبل صاحب تھے جن کے ساتھ وہ اس بارے میں صلاح یا مشورہ یا گفتگو یا بحث جو کچھ کہو کر سکتا تھا۔ وہ بھی ان دنوں کسی سرکاری ضرورت سے باہر چلے گئے تھے۔ پس ابن الوقت کا ایک مہینہ کیوں خاصے دس دن اوپر ایک مہینہ بہت ہی پریشانی میں گزرا مگر اس کو انگریزی اٹیکٹ سیکھنے کی خوب مہلت ملی۔ اسی اثناء میں جان نثار نے ضروری ادب آداب اس کو سب تعلیم کر دیے گویا انگریزی سوسائٹی کی یونیورسٹی کا انٹرنس پاس کرا دیا۔

بارے مئی ۱۸۵۸ء کی تیرھویں تاریخ تھی کہ جان نثار

نے آ کر خبر دی کہ لیجیے حضرت آج دن کے چار بجے سب سامان آپ کو مہیا ملے گا۔ دیر تو ہوئی مگر کوٹھی کو بھی ایجنٹ نے ایسا سجایا ہے کہ پڑی جگمگا رہی ہے۔ دیکھیے گا تو پسند کیجیے گا اور آج رات کو نو بجتے بجتے صاحب بھی خدا نے چاہا تو آ پہنچیں گے، آپ چاہیں آج رات کو وہیں چل کر آرام کریں، دن بھی اچھا ہے، مہورت بھی اچھی ہے، خدا مبارک کرے۔

ابن الوقت۔ بہتر ہے صاحب کو آلینے دو اور خود دھیان کر لو، کسی چیز کی کسر تو نہیں رہ گئی۔

جان نثار۔ میں نے اچھی طرح خیال کر لیا ہے اور دو ایک اور شخصوں کو بھی دکھا لیا ہے۔ بس اگر کسر ہے تو آپ ہی کی ہے۔ انشاءاللہ ہر چیز آپ تیار پائیں گے۔

آفتاب نکلا ہی تھا کہ اگلے دن نوبل صاحب کا بلاوا آموجود ہوا۔ نوبل صاحب جیسا اُن کا دستور تھا، بہت تپاک سے ملے اور کچہری کے بکس سے ایک چٹھی نکال ابن الوقت کے حوالے کی کہ لیجیے مبارک، ڈھائی سو کی اکسٹرا اسسٹنٹی کی منظوری آئی ہوئی چار دن سے میرے پاس رکھی ہے؛ چونکہ میں آنے کو تھا، میں نے چاہا کہ اپنے ہاتھ سے چٹھی اور اپنی زبان سے مبارک باد دوں۔ ایک بات میں نے آپ کے بے پوچھے کی کہ مقدمات تحقیقات بغاوت میں مجھ کو آپ سے مدد لینے کی ضرورت پڑتی، اس کام کے ختم ہونے تک میں نے آپ کو اپنے محکمے میں لے لیا ہے۔

ابن الوقت۔ آپ نے تو احسانات سے اس قدر مجھ کو لاد دیا کہ شکر گزاری کا نام منہ سے نکالنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ بھلا خیر زمینداری تک تو مضایقہ نہ تھا، یہ اکسٹرا اسسٹنٹی کیوں کر میرے سنبھالے سنبھلے گی؟

نوبل صاحب۔ ایسی سنبھلے گی کہ دوسروں کے چھکے

چھوٹ جائیں گے ۔ ضوابط کچھری سے آپ کو ایک طرح کی ناآشنائی بے شک ھے، سو کچھ بڑی بات نہیں اور اسی غرض سے میں نے آپ کو اپنے محکمے میں لیا ھے۔ ایک ھوشیار سا منشی آپ کے اجلاس میں تعینات کر دیا جائے گا اور وہ تھوڑے دنوں میں آپ کو ضوابط سے آگاہ کردے گا ۔ آپ کے لیے زمینداری کے ساتھ اس خدمت کی تجویز ہو چکی تھی مگر ایک دم سے اتنی بڑی نوکری دیتے ہوئے لوگ ھچکچاتے تھے ، آخر لاٹ صاحب کے یہاں سے منظوری منگوائی گئی۔ حسنِ اتفاق سے آج غدر کو بھی پورا برس ہوا، بس کل سے ضلع کی کچھری میں میرے اجلاس کے پہلو میں اجلاس شروع کیجیے ۔ میں جاں نثار سے یہ بات سن کر بہت ھی خوش ھوا کہ آپ نے ۲۴ نمبر کا بنگلہ اپنے رھنے کے لئے تجویز کیا ھے اور وہ بہمہ وجوہ مرتب بھی ھو گیا ھے۔

ابن الوقت۔ شاید آپ کو یہ بھی معلوم ھوا ھوگا کہ میں مکان کے ساتھ لباس اور تمام ھندوستانی طرز کو بھی بدلنے والا ھوں ۔

نوبل صاحب۔ آھا تو آپ کو پورا پورا رفارمڈ اور رفارمر جنٹلمین دیکھ کر میں بہت ھی خوش ھوں گا ۔

کھانے کا وقت تھا قریب ، نوبل صاحب نے چاھا کہ ابن الوقت بھی شریک ھو مگر اس نے عذر کیا کہ بس آج اس وقت اور معاف کیجیے ۔ اس وقت کے بدلے اگر آپ چاھیں تو میں رات کو کھانے میں وضع جدید کے ساتھ شریک ھو سکتا ھوں ، مجھ کو اس حالت سے آپ کے پاس بیٹھنا، باتیں کرنا اور آپ کے ساتھ کھانا کھانا بھلا نہیں معلوم ھوتا ۔ نوبل صاحب نے اس بات کو بہت پسند کیا اور فرمایا کہ آج ڈنر* پر میں اپنے احباب کو بھی جمع کروں گا اور کھانے کے بعد سب سے آپ کی تقریب بھی کردوں گا تاکہ ایک جلسے میں سب صاحب لوگوں سے معرفت ھوجائے ۔

---

* رات کا کھانا ۔

فصل دھم

ابن الوقت نے انگریزی وضع اختیار کر لی۔ نوبل صاحب نے اس کی دعوت کی

نوبل صاحب کے پاس سے اٹھا تو جاں نثار ابن الوقت کو سیدھا اس کے بنگلے پر لے گیا اور جاتے کے ساتھ حجامت کروا، اصطباغ دے، یعنی نہلا دھلا، موسم اور وقت اور موقع کے لحاظ سے فیشن کے مطابق انگریزی سوٹ[1] پہنا، نکٹہ، دمچی، پوزی یعنی بریسز، ٹائی، کالر سب کس کسا کر اس کو اچھا خاصا عین مین یورپین جنٹلمین بنا دیا۔ ابن الوقت نے آئینے میں دیکھا تو اپنے تئیں انگریزوں کے ساتھ اشبہ پایا، بے اختیار تن کر لگا کپڑے بدلنے کے کمرے میں پینترے بدلنے، کھانے کے بعد اس کے کئی گھنٹے کوٹھی کی دیکھ بھال میں گزرے؛ گرمی کے دن، چاروں طرف خس کی ٹٹیاں لگی ہوئی، تھرمینٹیڈوٹ[2] سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھکولے آرہے ہیں۔ کوچ پر دراز ہونا تھا کہ آنکھ لگ گئی، جاگا تو ہوا خوری کے کپڑے بدل، باہر نکل گیا۔ کوئی دو گھڑی رات جاتے جاتے لوٹ کر آیا تو نوبل صاحب کے یہاں جانے کا وقت قریب تھا۔

ڈنر کے لیے تیاری شروع ہوئی، کچہری نہیں، دربار نہیں، کوئی پارٹی نہیں، اس پر بھی دن کے گیارہ بجے سے لے کر اب یہ تیسری دفعہ ہے کہ انگریزی تہذیب کپڑے بدلنے کی متقاضی ہے۔ سڑک بیچ تو نوبل صاحب کی کوٹھی تھی۔ جب معلوم ہوا کہ اور

۱۔ جوڑا۔ ۲۔ چرخے کی طرح کا انگریزی پنکھا۔

مہمان آنے شروع ہوئے یہ بھی اپنے بنگلے سے آٹھ جاموجود ہوا۔ کھانے سے پہلے اور کھانے میں صاحب لوگ اس کو اجنبی سمجھ کر بار بار دیکھتے تھے، لیکن چونکہ کسی نے اس کو انٹروڈیوس* نہیں کیا تھا، کوئی اس سے پوچھ نہیں سکتا تھا کہ تم کون ہو اور نہ یہ کسی سے بات کر سکتا تھا۔ نوبل صاحب مہمانوں کی آؤبھگت میں لگے تھے، آن سے لمحے دو لمحے کا چھٹکارا پاتے تو ابن الوقت سے ایک دو بات کر جاتے۔ ڈنر تھا کہ اچھا خاصا پہر ڈیڑھ پہر کا جھمیلا تھا، جہان کے قصے اور دنیا بھر کی بکواس۔ خیر خدا خدا کرکے ڈنر سے چھٹی پائی۔ ابھی سب لوگ اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے ہیں کہ نوبل صاحب نے کھڑے ہو کر یہ تقریر کی۔

صاحبو! یوں تو آپ صاحبوں سے اکیلے دکیلے یا مجمع میں ملنا ہمیشہ خوشی کا موجب ہوتا ہے مگر آج رات کی ملاقات ایک خاص وجہ سے بڑی، بہت بڑی خوشی کی بات ہے۔ آپ کو دعوت کے رقعوں سے معلوم ہوا ہوگا کہ آج کی دعوت سے ایک نئے دوست کو آپ کی سوسائٹی میں انٹروڈیوس کرنا منظور تھا۔ (چیرز) اگرچہ میرے اکثر حالات غدر بھی آپ سب صاحبوں نے بار بار میری زبان سے سنے ہیں مگر میرے حق میں وہ ایسے دلچسپ ہیں کہ ہر بار کے بیان کرنے میں مجھ کو ایک نیا مزہ ملتا ہے اور اس سے میں قیاس اور اُمید بھی کرتا ہوں کہ اس محل پر آن کا بالتفصیل اعادہ کرنا نہیں بلکہ مختصر طور پر آن کی طرف اشارہ کر دینا کسی صاحب کی طبیعت پر ناگوار نہیں گزرے گا۔ (ہر گز نہیں، ہر گز نہیں)۔ یہ ہر گز میرے خیال میں نہیں آیا کہ غدر میں مجھی پر

*تقریب ملاقات۔

سب سے زیادہ مصیبت پڑی مگر اتنا تو میں ضرور سمجھتا ہوں کہ میرے حصے کی مصیبت بھی کچھ کم نہ تھی ۔ مجھ کو غدر نے اچانک آ دبایا جب کہ میں بہ عزم ولایت بمبئی جاتے ہوئے علالت مزاج کی وجہ سے تھوڑی دیر کے لیے مسافرانہ دھلی کے ڈاک بنگلے میں ٹھہرا ہوا تھا ۔ میرا جان پہچان یا دوست یا دردمند جو کچھ سمجھو میرا ایک ذاتی ملازم تھا جو اب بھی میرے پاس ہے اور وہ بمبئی تک میرے ساتھ جانے والا تھا ۔ مجھ کو اس شدّت کا درد سر تھا کہ تکیے پر سے سر نہیں اٹھا سکتا تھا ۔

دفعتاً دین دین اور علی علی کا غل سن پڑا اور ایک منٹ بھی نہیں گذرنے پایا تھا کہ شہر کی بازاری خلقت بنگلے میں ٹوٹ پڑی ۔ میرا آدمی مجھ کو پیچھے معلوم ہوا اس وقت میری دوا کے لیے شفاخانے گیا ہوا تھا ۔ انھیں لٹیروں میں سے پانچ چار خنگے مجھ کو کشاں کشاں کشمیری دروازے باغیوں کے گارد میں لے گئے ۔ وھاں میں نے دیکھا کہ اور چند انگریز مرد اور عورتیں اور بچے قیدیوں کی طرح زمین پر بیٹھے ھیں ۔ مجھ کو بھی انھیں میں بٹھا دیا مگر ھم ایک دوسرے سے بات نہیں کر سکتے تھے ۔ مجھے اچھی طرح یاد ھے کہ درد سر جو ایک لمحے کے لیے مفارقت نہیں کرتا تھا اور جس نے مجھ کو ولایت جانے پر مجبور کیا تھا ، اس وقت بالکل زائل ھو گیا تھا ۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اپنے آدمی کو دیکھا کہ تماشائیوں میں ملا ھوا مجھ کو دیکھ رھا ھے ؛ اس کا چہرہ اداس تھا اور اس کی صورت پریشان ، مگر وہ ٹکٹکی باندھ کر میری طرف کو دیکھ بھی نہیں سکتا تھا اور دیکھ بھی سکتا تو وہ مجھے کیا فائدہ پہنچا سکتا تھا لیکن جب جب میں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا

کسی نہ کسی طرف اُس کو کھڑا ہوا پایا ۔ اس سے میں سمجھا
کہ وہ میری مصیبت پر متّاسف ہے ۔ حوالات کی مصیبت کا
بیان کرنا دیر طلب بات ہے اور میں اُس کے تذکرے سے سکوت
کرتا ہوں کیوں کہ مجھ کو کچھ اور بھی کہنا ہے ۔ تیسرے
دن ہم سب کو گھیر کر میگزین کے میدان میں لے گئے
اور جب تک قلعے کے حوالاتی آئے ہم کو کھڑا رکھا ،
پھر سب کو بٹھا کر باڑ مار دی ۔ اُس وقت تک بھی میں نے
اپنے آدمی کو کالج کے دروازے کے پاس دیکھا ۔ شاید میرا
دماغ مدتوں کے درد سر سے ضعیف ہو رہا تھا کہ باڑ کے
صدمے سے یا زخموں کی وجہ سے مجھ کو غش آ گیا ۔ اس وقت
تک جو کچھ میں نے بیان کیا وہ میری ذاتی معلومات ہے ، اس
کے بعد جو میں نے آدھی رات کے بعد آنکھ کھولی اور مجھ
کو ہوش آیا تو میں نے اپنے تئیں (ابن الوقت کی طرف اشارہ کر کے)
ان کے مکان میں پایا ، جن سے ملنے کو میں نے آپ صاحبوں
کو بلایا ہے (چیرز) ۔

میں یہ بات کچھ اس نظر سے نہیں کہتا کہ اپنے وفادار
نوکر کی خیر خواہی کو میں اعلیٰ درجے پر نہیں خیال کرتا ،
مگر اُس پر میرے احسانات اور نمک کے حقوق ثابت تھے ۔ مگر
ان صاحب کو بلکہ ان کے معزز خاندان میں سے کسی کو کبھی
کسی انگریز سے کسی طرح کا تعلق نہیں رہا ، انھوں نے چند
سال تک دھلی کالج میں مشرقی علوم کی تعلیم پائی اور کالج
چھوڑنے کے بعد اپنی موروثی خدمت پر شاہی ملازموں میں
جا ملے ؛ پس عام ہم دردی اور نیک دلی کے سوائے اور کوئی
خیال ان کو میری پناہ دھی کا محرّک نہیں ہو سکتا تھا ۔ آپ
میری شکل و صورت کو دیکھتے ہیں کہ اگر میں بھیس بدل

کر ہندوستانیوں میں ملنا چاہتا تو رنگ اور بال اور آنکھیں ہر چیز میرا پردہ فاش کرنے کو موجود تھی - اس کے علاوہ ان کا گھر خانقاہ سے جس کو مجاہدین کا اکھاڑا کہنا چاہیے ، بہت ہی قریب ہے - پس میرا پناہ دینا بڑی خطرناک بات تھی ، خصوصاً ملازم شاہی کے حق میں - پھر مدارات جو انھوں نے کی ، شروع سے آخر تک یکساں تھی اور یہ بھی اس بات کی ایک دلیل ہے کہ میری پناہ دہی میں کسی غرض دنیاوی کو دخل نہ تھا۔

میں ان باتوں کو چنداں اپنی احسان مندی ظاہر کرنے کے ارادے سے ذکر نہیں کرتا بلکہ آپ صاحبوں کے ذہن سے اس غلط اور بے اصل خیال کو نکالنا چاہتا ہوں کہ حکومت انگریزی کا سب سے بڑا دشمن مذہب اسلام ہے - بانی اسلام نے بالتخصیص عیسائیوں کی نسبت قرآن میں اپنی رضا مندی اور خوشنودی صاف طور پر ظاہر کی ہے - اُنھوں نے اپنے معتقدین کے لیے ہمارے ساتھ کھانا اور رشتہ و پیوند کرنا جائز قرار دیا ہے اور میں نے قسطنطنیہ اور دوسری اسلامی سلطنتوں میں مسلمانوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ انگریزوں کے ساتھ بے تامّل کھاتے پیتے ہیں اور اُن کا لباس بالکل ہم لوگوں کا سا ہے ، صرف قر * اُن کا شعار قومی مابہ الامتیاز ہے جس سے وہ پہچانے جاتے ہیں - ساتھ کھانا اور رشتہ و پیوند کرنا دو بڑے ذریعے اتحاد پیدا کرنے کے ہیں اور ان دونوں باتوں کی اجازت سے ثابت ہے کہ مسلمانوں کے پیغمبر صاحب کو منظور تھا کہ اُن کے گروہ کے آدمی ہم لوگوں کے ساتھ دوستانہ برتاؤ رکھیں اور ہندوستان کے مسلمانوں کے سوائے اور

---

* ترکی ٹوپی -

ملکوں کے مسلمان اس حکم کی پوری پوری تعمیل کرتے ہیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندوؤں کی صحبت نے بڑے نقصان پہنچائے ہیں اور من جملہ اُن کے ایک یہ بھی ہے کہ یہاں کے مسلمان اُنھیں کی طرح شکّی اور وہمی ہو گئے ہیں؛ پس جو نفرت ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریزوں سے ہے، ہرگز مذہبی نہیں ہے بلکہ ایک رسم ہے جو اُنھوں نے ہندوؤں سے اخذ کی ہے اور جتنے مسلمان اپنے مذہب سے بہ خوبی آگاہ ہیں، ہرگز اس نفرت میں شریک نہیں۔ مجھ کو معلوم ہے کہ دھلی کے مسلمانوں میں جو مستند عالم تھے، باغیوں نے ہر چند اُن پر سختی کی مگر اُنھوں نے جہاد کا فتویٰ دینے سے انکار کیا اور انھیں انکار کرنے والوں میں یہ میرے دوست بھی تھے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ باغیوں میں بہت سے مسلمان بھی ہیں مگر کون مسلمان؟ اکثر عوام الناس، پاجی، کمینے، رذیل جن کے پاس رسم و رواج کے سوائے مذہب کوئی چیز نہیں یا اگر کسی رو دار مسلمان نے بغاوت کی ہے تو مذہب کو اُس نے صرف آڑ بنایا ہے اور اصل میں غصّہ یا لالچ یا کوئی اور سبب محرّک ہوا ہے۔

جس طرح ہماری قوم ہمیشہ سے بہادری میں ناموَر رہی ہے اسی طرح ہمارا سچا مذہب بردباری اور درگزر میں اور خدا کی مقدّس مرضی نے ہم کو ان دو صفتوں میں آزمانا چاہا۔ ہم بہادری کی آزمائش میں خدا کے فضل سے پورے اُترے، اب ہم کو دوسری آزمائش میں پورے اُترنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جب تک ہم مغلوب تھے ہم نے بہادری سے کام لیا، اب ہم کو خدا نے غلبہ دیا ہے تو چاہیے کہ بردباری اور درگذر سے کام لیں۔ قدرت پا کر

معاف کردینے سے ایشیائی قومیں ہم کو ضعیف سمجھنے کے عوض بہت زیادہ طاقت ور خیال کریں گی۔ سلطنت کی عمارت میں بہادری نے اگر گارے کا کام دیا ہے تو بردباری چونے گچ کا کام دے گی۔ (ابن الوقت کی طرف اشارہ کرکے) انھوں نے مجھ پر اپنا یہ ارادہ بھی ظاہر کیا ہے کہ آیندہ ہندوستانیوں یعنی کم سے کم اپنے ہم قوم مسلمانوں اور انگریزوں میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ اگر انھوں نے ایسا کیا اور مجھ کو پورا بھروسا ہے کہ ضرور کریں گے تو گورنمنٹ کو چاہیے کہ میری پناہ دھی سے بڑھ کر ان کی اس کوشش کی قدر کرے۔ میری پناہ دھی کے صلے میں گورنمنٹ نے ان کو ڈھائی سو روپے ماھوار کے منافع کی زمینداری عطا فرمائی ہے اور اکسٹرا اسسٹنٹی کی خدمت جو ہندوستانی کے لیے اعلیٰ درجے کی نوکری ہے۔ تمام زمانۂ غدر میں ان کے پاس رھنے سے مجھ کو ان کے تفصیلی حالات معلوم ہیں؛ علوم مشرق کے یہ بڑے عمدہ سکالر ہیں، انھوں نے دھلی کالج میں جغرافیہ اور تاریخ اور پولیٹیکل اکانمی* اور ریاضی وغیرہ علوم بہ خوبی پڑھے ہیں، ان کی عام معلومات اونچے درجے کی اور قابل قدر ہے، ان کو اخبار بینی کا بڑا شوق ہے، ان کے خیالات وسیع اور شگفتہ ہیں۔ غرض آپ لوگ اگر ان کے ساتھ ارتباط پیدا کرنا چاھیں گے تو مجھ کو امید ہے کہ آپ ان کی ملاقات سے ہمیشہ محظوظ ہوں گے۔ اب شاید آپ صاحبوں کو زیادہ دیر تک باتوں میں لگائے رکھنا موجب تصدیع ہوگا اس واسطے شکر قدوم پر تقریر کو ختم کرتا ہوں۔

---

* سیاست مُدن۔

فصل یازدہم

انگریزی دستور کے مطابق ابن الوقت نے نوبل صاحب کی دعوت میں کھانے کے بعد تقریر کی

نوبل صاحب بیٹھنے کو تھے کہ ابن الوقت اٹھے - مہمانوں میں سے کسی کو بلکہ خود نوبل صاحب کو بھی توقع نہ تھی کہ یہ بھی کچھ کہیں گے مگر کھڑے ہوئے تو انھوں نے کہنا شروع کیا کہ "صاحبو مجھ کو اس طرح کے معزز جلسے میں پہلے پہل حاضر ہونے کا اتفاق ہوا ہے اور مجھ کو آپ صاحبوں کے روبرو بات کرنے کی عادت اور صلاحیت دونوں نہیں مگر نوبل صاحب نے ایسی مہربانی کے ساتھ میری تقریب آپ صاحبوں سے کی ہے کہ ان کی شکر گزاری کو میں اپنا فرض موقت خیال کرتا ہوں - میں نے اپنے پندار میں کوئی کام ایسا نہیں کیا جس کے واسطے نوبل صاحب یا گورنمنٹ میری احسان مند ہو - میں نے نوبل صاحب کو مُردوں کے انبار میں سے اٹھایا اور اپنے گھر لے جا کر رکھا لیکن اگر ایسا نہ کرتا تو میں مسلمان بلکہ انسان نہ تھا ؛ پس میں نے اپنا فرض مذہبی بلکہ فرض انسانیت ادا کیا اور میں نہیں سمجھتا کہ مجھ کو کسی طرح کی خاص مدح کا استحقاق حاصل ہے - یہ نوبل صاحب کی ذاتی شرافت اور گورنمنٹ کی فیاضی ہے کہ نوبل صاحب میرا احسان مانتے ہیں اور گورنمنٹ نے کثیر المنفعت زمینداری اور

باوقعت پیش قرار ماھانے کی نوکری مجھ کو عطا فرمائی ۔

ابھی تک غدر سے پوری پوری نجات حاصل نہیں ہوئی لیکن اُس کی جڑ کٹ گئی ھے اور شاخ و برگ اگر کوشش نہ بھی کی جائے آپ سے آپ خشک ھو کر اور گل سڑ کر خاک میں مل جائیں گے ۔ دنیا کا قاعدہ ھے کہ نتیجے کے واقع ھونے کے بعد اُس کے اسباب کی جستجو کی جاتی ھے لیکن مبارک ھیں وہ لوگ جو وقوع نتیجہ سے پہلے اسباب پر نظر کرتے ھیں

مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

خیر اگر وہ موقع ھم سے فوت ھو گیا تاھم بعدالوقوع اسباب غدر کا خیال کرنا اس وقت دل چسپ اور آئندہ مفید ھوگا ۔ اخبار والوں نے اس کی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی ھے اور ھر شخص جو کچھ اُس کے منہ میں آتا ھے کہتا ھے لیکن اگر گورنمنٹ جس کو واقعی اسباب غدر کا جاننا سب سے زیادہ ضروری ھے ، اخبار والوں کی رائے پر عمل کرے گی اور اخبار والے تو آخر اسی غرض سے خامہ فرسائی کر ھی رھے ھیں تو میں گورنمنٹ سے اور آپ سب صاحبوں سے معافی مانگ کر یہ بات کہتا ھوں کہ گورنمنٹ بڑا دھوکا کھائے گی اور گورنمنٹ کی خیر خواھی مجھ کو اس بات کے کہنے پر مجبور کرتی ھے کہ شاید وہ ویسی ھی نا واقف اور بے خبر گورنمنٹ رھے گی جیسی غدر سے پہلے تھی ۔

سلطنت میں رعایا اور گورنمنٹ دونوں کی اغراض وابستۂ یک دگر ھیں ۔ اگر ھندوستانیوں کو انگریزی سلطنت سے امن اور آزادی کے گونا گوں فائدے پہنچے ھیں جو فی الواقع ان کو کسی زمانے میں نصیب نہیں ھوئے تو اس سے بھی انکار نہیں ھو سکتا کہ انگلستان اسی سلطنت کی بدولت مالا مال ھو گیا ھے

اور اسی سلطنت کے برتے پر اُس نے تمام یوروپ کی سلطنتوں کی کنّی دبائی ہے۔ ممکن ہے بعض احمق ہندوستانی اسی کو انگلستان کا بڑا مفاد سمجھتے ہوں کہ انگریز بڑی بڑی تنخواہیں پاتے ہیں، یہ تو ان فائدوں کا پاسنگ بھی نہیں۔ بات یہ ہے کہ انگلستان ہنر مندی اور صناعی کا گھر ہے اور اُس کے تموّل کا بڑا ذریعہ بلکہ میں کہہ سکتا ہوں تنہا ذریعہ تجارت ہے؛ سو ہندوستان کی سلطنت نے انگلستان کی تجارت کو ہزارہا گونہ تو اب بڑھا رکھا ہے اور کوئی کہہ نہیں سکتا آئندہ اس میں کہاں تک افزائش ہوگی۔ پس اگر اغراض کا موازنہ کریں تو میرے نزدیک انگلستان کی اغراض کا پلّہ جھکتا رہے گا۔ یہ سبب ہے کہ انگریزوں کو غدر کا زیادہ فکر ہونا چاہیے۔

میں اس کو انگریزوں کی اقبال مندی سمجھتا ہوں کہ حسن اتفاق سے اس وقت کوئی معاصر سلطنت ہندوستان کی دعوی دار نہیں ہوئی اور اہل ہند میں اس سرے سے اُس سرے تک کسی فرد بشر میں سلطنت کی صلاحیت نہ تھی اور ہندوستان کی مختلف اقوام میں اتفاق کا رنگ پیدا ہونے نہیں پایا تھا۔ انگریزوں نے اس ملک کو بہ زور شمشیر فتح کیا اور بہ زور شمشیر اس پر قابض رہے اور بہ زور شمشیر غدر کو بھی فرو کردیا مگر زورشمشیر رعایا کے جسموں کو مسخر کرسکتا ہے نہ دلوں کو۔ یہ ملک صدہا بلکہ ہزارہا برس سے شخصی سلطنتوں کا محکوم رہا ہے اور یہاں کی رعایا نے ابھی تک انگریزی سلطنت کی حقیقت کو نہیں سمجھا اور یہ لوگ حکّام ضلع کو بادشاہ کا اوتار خیال کرتے ہیں، پس اس ملک کے عہدہ داران انگریزی کے ذمّے دوسرے فرائض خدمت کے علاوہ ایک

بڑا ضروری فرض مزید یہ ھے کہ ہر وقت اپنے تئیں ملکہ کا قائم مقام سمجھ کر لوگوں کے ساتھ اُسی طرح کا برتاؤ کریں جو ملکہ کے لیے زیبا ھے ۔ اب آپ صاحبوں میں سے ہر شخص اپنے دل میں خیال کر سکتا ھے کہ اُس نے اس فرض کو کہاں تک ادا کیا ھے ۔ انگریز الّا ماشاء اللہ اس ملک میں ایسا روکھا مزاج بنائے رکھتے ھیں اور ھندوستانیوں کو ایسی حقارت اور نفرت سے دیکھتے ھیں کہ کوئی اُن کے پاس نہیں پھٹکتا تاوقتیکہ اُس کو ضرورت مجبور نہ کرے ۔ انگریزوں اور ھندوستانیوں میں محبت اور اخلاص کا ھونا ایسا شاذ ھے جیسے شیر اور بکری میں ۔ میں ھندوستانیوں کے ڈفنس* میں ایک لفظ نہیں کہنا چاھتا اور اس بات کو تسلیم کرتا ھوں کہ کوئی انگریز جنٹلمین ان کی ملاقات سے کبھی محظوظ ھو نہیں سکتا لیکن اگر بروں سے پالا پڑ جائے تو تھوڑا بہت اپنی طبیعت پر بھی جبر کرنا چاھیے ؎ چہ تواں کرد مردماں ایند

اور جو شخص اس تکلیف کا متحمّل نہیں ھونا چاھتا تو اُس کو ان بروں سے بھلائی کی توقع بھی نہیں رکھنی چاھیے ۔ غدر کے بعد سے ہر انگریز کو یہ شکایت پیدا ھوئی کہ ھندوستانیوں نے اُس کی مدد نہیں کی لیکن ذرا گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیے کہ وہ کس احسان ، کس سلوک ، کس مہربانی کے عوض میں اس مدد کا مستحق تھا ۔ وہ شاید اپنا ایک حق بھی کسی ھندوستانی پر ثابت نہیں کر سکے گا ۔ اس اُصول منصفانہ کو پیش نظر رکھیں تو بغاوت کی لمبی فہرست صرف ایک فرد مختصر رہ جائے گی ۔

اب رہ گئی بغاوت بہ مقابلۂ سرکار ، سو میں آپ صاحبوں کی

---

* حمایت ۔

خدمت میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ہندوستانیوں کے نزدیک سرکار کوئی چیز نہیں۔ احسان فراموشی انسان کا نیچر یعنی تقاضائے طبیعت ہے۔ غدر جس کا لوگوں نے اتنا بڑا بتنگڑ بنا رکھا ہے، میرے نزدیک انسانی نیچر کے ظہور سے کچھ زیادہ نہ تھا۔ ہر چند انگریزی عملداری سے ہندوستانیوں کو بہت سے فائدے پہنچے تھے مگر اُن کو واقعی یا ادعائی واجب یا غیر واجب چند در چند شکائتیں بھی تھیں۔ پس اگر اُنھوں نے شکایتوں کے جوش میں فائدوں پر نظر نہ کی تو اس کو ضعف بشریت اور انسان کے نیچر کے نقصان کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ انگریزی اور ایشیائی حکومتوں کا طرز ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہے کہ ایک کو دوسرے سے کچھ مناسبت نہیں۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں برس سے ہندوستانی خوگر تھے اپنے ہم وطنوں کی حکومت کے، جن کے درباروں میں اُن کی رسائی بہ آسانی ہوسکتی تھی، ملک کی تمام آمدنی بادشاہ کی خاص ملکیت ہوتی تھی اور وہ اُس کو بلا مزاحمت جس طور پر چاہتا تھا خرچ کرتا تھا مگر اس بد نصیب ملک کی ساری دولت ایشیائی حکومتوں میں سدا بیہودہ نمود و نمائش اور ممنوع عیاشی میں برباد ہوا کی اور اُس سے متمتع ہوتے رہے خوشامدی، خود غرض۔

بہر کیف دولت کا دریا ایک رخ کو بہتا اور اُن لوگوں کو سیراب کرتا رہا جن کی قسمتوں میں اُس سے فائدہ اُٹھانا تھا۔ ہندوستانی عملداری جا کر انگریزی عملداری کا آنا اس سے تو کسی طرح کم نہیں کہ وہ دریائے زخّار ایک سمت کو بہتے بہتے یکایک اُلٹا بالکل سمت مخالف میں دوسری جگہ بہنے یعنی ایک ایسی سلطنت شروع ہوئی جس کی مثال اس ملک میں

نہ دید ہے نہ شنید ہے؛ خلق خدا کی ، ملک وکٹوریہ بادشاہ زادی کا اور حکم کمپنی بہادر کا ، خلقت ایک اور اکھٹے تین تین فرماں روا اور تینوں نظر سے پوشیدہ - آپ صاحب یہاں کے لوگوں کی حیرت پر تعجب کریں گے مگر اس میں رتّی برابر مبالغہ نہیں - انگریزی سلطنت رعایائے ہندوستان کے حق میں ایک پہیلی ہے جس کو اس وقت تک اکثر عوام‌الناس نہیں بوجھ سکے - تبدل سلطنت یوں بھی کچھ آسان بات نہیں اور پھر ایسا تبدل کہ حاکم و محکوم دونوں میں کسی طرح کی مناسبت نہیں ؛ نہ وطن ایک ، نہ زبان ایک ، نہ مذہب ایک - پس ہندوستانیوں کے حق میں سلطنت کیا بدلی گویا ساری خدائی بدل گئی ؛ اگلے تمام ذریعے معطل ، ساری لیاقتیں بیکار ، کل تدبیریں بے اثر - پس شاہی متوسّل اور متوسّلوں کے متوسّل اور متوسّلوں کے متوسّلوں کے متوسّل کہ ان کا مجموعہ بجائے خود ایک جمّ غفیر ہوگا ، محض بے آسرے اور بے سہارے ہو کر بیٹھ رہے - اب ہر ایک منصف مزاج آدمی خیال کر سکتا ہے کہ اس گروہ کو انگریزی عملداری سے نا خوش ہونے اور رہنے کی وجہ معقول تھی یا نہیں - پھر انگریزی عمل‌داری اتنی پرانی ہو گئی تھی کہ جن لوگوں نے بادشاہی وقت دیکھے تھے اکثر مر کھپ چکے تھے اور چاہیے تھا کہ اس زمانے کی باتیں بھی بھول بسر جاتیں مگر ہم دیکھتے ہیں تو اُن کی یادگار ہر دم تازہ ہے ؛ اس وجہ سے کہ اب بھی چھوٹی بڑی محکوم اور مختار بہتیری ہندوستانی ریاستیں جگہ جگہ موجود ہیں اور ان میں بلا کم و کاست ایشیائی حکومت کے نمونے باقی ہیں -

اگر سرکار انگریزی کو اپنی رعایا کا خوش دل رکھنا منظور ہے تو چار دانگ ہندوستان میں اس سرے سے اس سرے تک ایک طرح کا انتظام ہونا چاہیے - مجھ کو بیرون شہر کسی ہندوستانی ریاست میں رہنے یا نوکری کرنے کا اتفاق نہیں ہوا مگر لوگوں کے کہے سنے سے ، اخبار سے بعض ریاستوں کے عام حالات معلوم ہیں اور دہلی کا قلعہ بھی بجائے خود چھوٹی سی ریاست تھی اور میں پشتہا پشت سے اسی شہر کا رہنے والا اور سرکار شاہی کا متوسّل ہوں اور شہر اور قلعہ دونوں کا کوئی حال مجھ سے مخفی نہیں - اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اہل شہر اور اہل قلعہ کی زندگی ایک دوسرے سے اس قدر مختلف تھی کہ قلعہ ایک دوسری دنیا معلوم ہوتا تھا - جب سلطنت میں غدر کی وجہ سے اتنا بڑا انقلاب ہوا ہے کہ ملکہ معظمہ نے زمام حکومت اپنے دست خاص میں لی اور کمپنی کا کچھ تعلق نہ رہا تو میں اس کو ملک کے حق میں فال نیک سمجھتا ہوں اور مجھ کو پورا بھروسا ہے کہ گورنمنٹ کے انتظامات میں یقیناً بڑی بڑی تبدیلیاں ہونے والی ہیں -

پس اگر کوئی مجھ سے صلاح پوچھے تو میں پہلے اسی بات کو بڑے شدّ و مد کے ساتھ پیش کروں کہ گورنمنٹ اپنے تعلقات اندرونی ایشیائی گورنمنٹوں کے ساتھ درست کرے - یہ ہندوستانی ریاستیں جن کا مجموعہ کیا رقبہ ، کیا مردم شماری کیا محاصل ، کسی اعتبار سے انگریزی سلطنت سے کم نہیں ، باستثنائے معدودے چند اس قدر پیٹ بھر کر خراب ہو رہی ہیں کہ اُن کی حالت نہ صرف اُنھیں کے حق میں خطرناک ہے بلکہ انگریزی طرز انتظام ، انگریزی رعایا ، سبھی کے حق میں

اور جب تک ان ریاستوں کی پوری پوری اصلاح نہ ہو انگریزی گورنمنٹ کو کبھی اپنے انتظام کی طرف سے مطمئن نہیں ہونا چاہیے۔ ان میں سے ایک ایک ریاست اگر اس کے انتظام میں فساد ہے، انگریزی گورنمنٹ کے حق میں بغلی گھونسا ہے۔ فساد انتظام سے میری مراد یہی نہیں کہ رئیس اپنے تئیں سرکار انگریزی کا مدّمقابل سمجھتا ہو یا نافرمانی یا عدول حکم سے گورنمنٹ کا استخفاف کرتا ہو۔ میں اس بات کو پکارے کہتا ہوں کہ ہندوستانی رئیس ہندو ہو یا مسلمان آرام طلب ہوگا، کاہل ہوگا، احمق ہوگا، جاہل ہوگا، عیاش ہوگا، غافل ہوگا، مسرف ہوگا، خرچ آمدنی سے فاضل ہوگا، غرض اس میں سب طرح کے جنون ہوں گے مگر نہیں ہوگا تو ایک جنون بغاوت۔

سرکار نے اپنی فوجی طاقت کو ہندوستان میں خصوصاً بعد غدر ایسے زور سے ثابت کر دیا ہے جیسے آگ نے جلانے کی خاصیت کو۔ پس ہندوستانی رئیسوں کی طرف ایسا خیال بالکل لغو اور محض بے اصل ہے لیکن جس چیز سے گورنمنٹ انگریزی کو ہندوستانی ریاستوں کی طرف سے میں ڈرانا چاہتا ہوں یہ ہے کہ اکثر ہندوستانی رئیس اپنی چند در چند نالائقیوں اور گوناگوں بدکرداریوں کی وجہ سے ایسی خرابیاں کر رہے ہیں کہ اول توخود انھیں کی رعایائے نامہذب و ناشائستہ سے انگریزی گورنمنٹ کو ہمیشہ خائف رہنا چاہیے؛ دوسرے ان ریاستوں کے برے نمونے دیکھ کر رعایائے انگریزی کی طبیعتیں بگڑی چلی جاتی ہیں۔ جسد سلطنت میں یہ ریاستیں گویا برص کے چتّھے ہیں؛ کیونکر اطمینان ہوسکتا ہے کہ ان چتّھوں کا فساد دوسرے اعضائے صحیح تک متعدی نہیں ہوگا۔

اگر میری تقریر سے ایسا مستنبط ہوا ہو کہ میں ان ریاستوں کے ضبط کرنے کی رائے رکھتا ہوں تو مجھ سے بڑھ کر قوم وملک کا کوئی دشمن نہیں لیکن یہ میری رائے ضرور ہے کہ ان ریاستوں کا ناستنظم حالتوں میں رہنے دینا ویسا ہی ظلم ہے جیسا ان کا ضبط کرنا ۔ جب کہ انگریزی گورنمنٹ اپنے تئیں ان شکمی گورنمنٹوں کا مربّی اور حامی اور محافظ سمجھتی ہے اور واقع میں وہ ہے بھی تو ان کی اصلاح اس کا فرض لازمی ہے لیکن انگریزی گورنمنٹ نے اس فرض کے ادا کرنے میں کماحقہ اہتمام نہیں کیا ۔ بے شبہ سرکار کی طرف سے ایجنٹ یا ریذیڈنٹ کے نام سے ایک عہدہ دار ہر ایک ہندوستانی ریاست پر مسلّط ہے مگر اس کو ریاست کے اندرونی انتظام میں حکماً کچھ مداخلت نہیں ۔ وہ اتنی ہی بات کی نگرانی رکھتا ہے کہ ریاست میں سرکار انگریزی کا رعب و داب اچھی طرح قائم رہے اور کوئی عام بدنظمی نہ ہو ۔ اگر ایک باپ اولاد کے ساتھ وہ کرے جو انگریزی گورنمنٹ نے ہندوستانی ریاستوں کے ساتھ اب تک کیا ہے تو ہم ایسے باپ کی مدح نہیں کر سکتے ۔ جتنا اس نے کیا ' اچھا کیا مگر اس کو اس سے بہت زیادہ کرنا چاہیے تھا ۔ مہذّب دنیا کی نظر میں انگریزی گورنمنٹ کبھی من حیث المجموع منتظم گورنمنٹ نہیں سمجھی جائے گی تاوقتیکہ اس کی تمام شکمی گورنمنٹیں اسی طرح منتظم نہ ہوں جیسے اس کا اپنا علاقہ ۔ انگریزی گورنمنٹ کبھی بیرونی دشمنوں کے خدشے سے خالی نہیں رہتی اور اس کو خالی رہنا چاہیے بھی نہیں لیکن تعجب کی بات ہے کہ میں اس کو شکمی ہندوستانی ریاستوں کی طرف سے کبھی خدشہ کرتے ہوئے نہیں پاتا حالانکہ اگر یہ ریاستیں نا منتظم رہیں جیسی کہ اب ہیں تو یہ اندرونی دشمن بیرونی دشمن سے

بہت زیادہ خطرناک ہیں۔

اب میں آپ صاحبوں کو ایک دوسرے مطلب کی طرف متوجّہ کرنا چاہتا ہوں۔ دنیا کی قوموں میں نفرت اور عداوت کی بہت سی وجوہ ہو سکتی ہیں مگر سب سے زیادہ شدید اختلاف مذہب ہے خصوصاً ہندوستانیوں کے نزدیک ہندو اپنے مذہب کے ایسے سخت متعصّب ہیں کہ کسی طرح دوسرے مذہب کے لوگوں سے ملنا نہیں چاہتے؛ جو لوگ دوسری قوم کا چُھوا پانی نہ پی سکیں اُن سے دوستی اور اتحاد کی کیا توقع ہوسکتی ہے۔ ہندوستان کے باشندوں میں انگریزوں کے ساتھ ارتباط اور اختلاط کرنے والے اگر کچھ لوگ ہیں تو مسلمان ہیں کیونکہ سچا مذہب اسلام ایسے تعصّبات سے بالکل بری ہے۔ صرف یہی نہیں کہ مسلمانوں کی مقدّس آسمانی کتاب یعنی قرآن اس سے ساکت ہے بلکہ اُس میں نصاریٰ کے ساتھ مواکلت اور مناکحت دونوں کی صاف و صریح اجازت موجود ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ مواکلت اور مناکحت سے بڑھ کر دوستی پیدا کرنے کا کوئی اور بھی ذریعہ ہو سکتا ہے لیکن ہندوستان کی حالت میں ہم اس بات کا کافی ثبوت رکھتے ہیں کہ مذہب کہاں تک رسم و رواج سے متاثّر ہو سکتا ہے۔

ہندوستان میں ایک مدّت سے ہندو مسلمان ملے جُلے رہتے آئے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ دونوں قوموں نے ایک دوسرے سے بہت باتیں اخذ کی ہیں اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ دونوں میں اختلاف مذہب اور خاص کر مذہب ہنود کے روکھے پن کی وجہ سے جو منافرت ہونی چاہیے تھی، مدّتوں کی یک جائی نے اُس کو بہت کم کردیا ہے۔ مسلمانوں کی دیکھا دیکھی ہندو دھوتیاں اور کھڑاویں چھوڑ کر پاجامے اور جوتیاں پہننے، اپنی عورتوں

کو پردے میں بٹھانے اور مسلمانوں کے علوم پڑھنے لگے ؛ ہزارہا ہنود محرّم میں جو مسلمانوں کا مشہور مذہبی تیوہار ہے، تعزیہ داری کرتے ہیں، مسلمانوں کی طرح مسلمان بزرگوں کی قبروں کی تعظیم کرتے ہیں، اُن سے منّتیں مانتے ہیں کہ یہ ایک قسم کی پرستش ہے۔ اسی طرح مسلمان ہندوؤں کی تقلید سے کھانے پینے کا پرہیز کرنے لگے ہیں، اپنی بیوہ عورتوں کا نکاح نہیں کرتے، اکثر نجوم کے معتقد ہیں، شادی بیاہ میں بہت سی رسمیں ہیں جن کی مذہب میں کچھ اصل نہیں ہندوؤں سے لی گئی ہیں۔ غرض ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلاط کا یہ نتیجہ ضرور ہوا ہے کہ ایک دوسرے سے وحشت باقی نہیں رہی لیکن یہ کیفیت کہیں صدہا سال میں جا کر پیدا ہوئی ہے اور پھر بھی میں اس کو اتحاد کے درجے میں نہیں سمجھتا ؛ دونوں کے دل بہ دستور ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہیں، آج کوئی بھڑکانے والا کھڑا ہو تو مسلمانوں کے نزدیک ہندو ویسے ہی کافر اور مشرک ہیں اور ہندوؤں کی نظر میں مسلمان ویسے ہی ہتیارے[۱] بھرشٹ[۲] اور یہ نااتفاقی انگریزی گورنمنٹ کے حق میں ایک فال مبارک اور شگون نیک ہے مگر وہیں تک کہ باہم رعایا میں ہو۔

اب دیکھنا چاہیے کہ سرکار نے کہاں تک مذہبی ناراضامندی کو اپنے مقابلے میں پیدا نہیں ہونے دیا۔ سو لوگوں میں تو یہی بات مشہور ہے کہ یہ تمام فساد چربی کے کارتوسوں کا تھا مگر میرے نزدیک یہ ایک نہایت سخیف رائے ہے۔ عوام کو ایسا مغالطہ واقع ہو سکتا ہے کیونکہ کہ اُن کے نزدیک ہر انگریز سرکار ہے اگرچہ وہ امریکہ کے کسی مشن کا پادری یا سوداگر یا سیّاح یا شکاری ہی کیوں نہ ہو۔ مگر جو لوگ انگریزی گورنمنٹ کے حالات سے کسی قدر بھی واقف ہیں بہ خوبی جانتے

---

۱ خونی۔ ۲ ناپاک۔

ہیں کہ سرکار کسی مذہب سے سروکار نہیں رکھتی اور سرکار نے ابتدائے عملداری سے اپنے تئیں مذہبی بکھیڑوں سے ایسا الگ تھلگ رکھا ہے کہ سرکار پر مذہبی طرف داری کا الزام بہتان اور افترا ہے۔ لیکن رعایا کے خیالات نہ جاننے یا جان کر اُن کی پروا نہ کرنے سے سرکاری عہدہ دار یعنی حکّام انگریزی سے اس طرح کی غلطی کا ہونا ممکن ہے جس سے لوگوں کو مذہبی ناخوشی پیدا ہو اور میں خیال کرتا ہوں کہ چربی کا کارتوس بھی اسی قسم کی غلطی تھی؛ مگر میں نہیں سمجھتا کہ صرف کارتوس غدر کا سبب ہوا بلکہ میری رائے یہ ہے کہ غدر کا مادہ دلوں میں مدّتوں سے جمع ہورہا تھا، کارتوس اس کا محرّک ہوگیا۔ غدر کا اصلی سبب ہے کہ رعایا کی نارضامندی اور اُس کی بہت سی وجوہ ہیں، من جملہ اُن کے کارتوس بھی ہے۔ اب دیکھنا چاہیے کہ لوگوں کو صرف اسی ایک کارتوس سے شبہ ہوا کہ سرکار مذہب میں مداخلت کرنا چاہتی ہے یا سرکار کی کسی کارروائی سے لوگوں کو پہلے سے بھی بدگمانی کا موقع تھا۔ اگر سرکار انگریزی اس معنے میں مذہب سے الگ تھلگ رہی کہ اُس نے ہندو مسلمانوں میں سے کسی کو اُس کے فرائض مذہبی ادا کرنے سے نہیں روکا یا کسی کو زبردستی یا کسی طرح کا لالچ دکھا کر عیسائی نہیں کرنا چاہا تو یہ بالکل صحیح ہے اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن مذہب کا اور خاص کر ہندوؤں کے مذہب کا بڑا ٹیڑھا معاملہ ہے۔ ان کا مذہب ہی فی نفسہ تار عنکبوت۱ سے زیادہ بودا اور چھوئی موئی سے بڑھ کر نازک ہے؛ اس کا مدار نہ صرف دل کے خیالات پر ہے کہ ان پر کسی کا دست رس ہو نہیں سکتا بلکہ ایک ہندو بے قصد و ارادہ

---

۱ - مکڑی کا جالا ۔

کھانے سے پینے سے، چھونے سے بے دین ہو جا سکتا ھے اور ان کے مذھب کا یہی ضعف دیکھ کر بعض مسلمان بادشاھوں کو موقع ملا کہ ہزارھا ھندوؤں کو زبردستی مسلمان کر ڈالا۔ غرض مسلمانوں کی مدارات دیکھ کر ھندو پہلے سے سہمے ہوئے تھے؛ اب جو آئے انگریز تو اُنھوں نے دیکھا کہ یہ مسلمان سے بھی چند قدم آگے بڑھے ہوئے ھیں یعنی جن چیزوں سے مسلمانوں کو پرھیز ھے یہ اُن کو بھی نہیں چھوڑتے، مذھب کے پھیلانے میں سرگرمی اس درجے کی ھے کہ گلی گلی پادری وعظ کہتے، مذھبی کتابیں مفت بانٹتے پڑے پھرتے ھیں، چمار ھو بھنگی ھو ان کو اپنی ذات میں ملالینے سے انکار نہیں۔ یوں ھندوؤں کے دلوں میں ازخود سرکار انگریزی کی طرف سے مذھبی بدگمانی پیدا ھوئی؛ بد گمانی کی مثال اُس درخت کی سی ھے کہ کائی کی طرح ذرا سا آسرا پا کر جم کھڑا ھوتا ھے اور کانس کی مانند جلانے سے لہلہاتا اور کاٹنے سے بڑھتا ھے۔

بد گمان آدمی کے ساتھ کتنا ھی سلوک، کیسی ھی بھلائی کرو وہ ھمیشہ اُس کا برا ھی پہلو سوچا کرتا ھے۔ سرکاری تعلیم سے شکر گزاری اور احسان مندی کے عوض اُلٹی مذھبی بد گمانی کو ترقی ھوئی۔ لوگوں نے سمجھا کہ انگریز احمق اور عقل سے خارج تو ھیں نہیں کہ کھلّم کھلّا زور ظلم کرکے اپنے کو بد نام اور رسوا کرلیں؛ یہ ھیں میٹھی چھری زھر کی بجھی، سر سہلائیں بھیجا کھائیں۔ دیکھو تو لوگوں کو کرسٹان بنانے کی کیا تدبیر نکالی ھے۔

ع گڑ سے جو مرے تو زھر کیوں دو

پھر اس بد گمانی پر طرّہ ھوا یہ کہ انگریزی خوانوں کو جو دیکھا تو عقیدے کے متزلزل، مذھب سے برگشتہ اب وہ

بد گمانی بد گمانی نہ رہی بلکہ مرتبۂ یقین کو جا پہنچی ۔

یہ باتیں جو میں آپ صاحبوں کے روبرو بیان کر رہا ہوں ، اگرچہ فرداً فرداً بعض ان میں کی آپ صاحبوں کی نظرمیں بے وقعت بھی ہوں مگر جب آپ سب کو جمع کر کے دیکھیں گے تو آپ خود تسلیم کریں گے کہ مجموعی اسباب غدر و بغاوت کے لئے کافی تھے ۔

ھندوستانیوں کے معابد کی تعظیم میں بھی انگریز ضرور کمی کرتے رھے ھیں۔ دھلی کی مسجد جامع ایک مشہور عمارت ھے۔ ایسا کون سا مردہ دل انگریز ھوگا کہ اس شہر میں کسی تقریب سے اس کا آنا ھو اور وہ اس مسجد کو دیکھنا نہ چاھے! یہاں تک کوئی حرج کی بات نہیں مگر جب مسلمان جوتیاں پہن کر مسجد میں جانا اپنے مذھب کی توھین کا موجب خیال کرتے ھیں تو اگرچہ انگریزوں کے یہاں جوتی کا اتارنا خلاف تہذیب ھو مگر اس میں کیا حرج ھے کہ یا تو دروازے میں سے دور بین لگا کر دیکھ لیا کریں یا جوتی اتار کر اندر چلیں پھریں ۔ پھر یہ تو مسلمانوں کا حال ھے ، ھندو تو خوشی سے کسی حالت میں دوسرے مذھب والے کا اپنے معابد میں جانا جائز نہیں رکھتے۔ مانا کہ عمدہ اور مشہور عمارتوں کا دیکھنا ایک طبعی شوق ھے مگر شوق کے لیے دوسروں کی دل آزاری کیا ضرور ھے ۔ میں نے ایک مسلمان کے روبرو ایک بار یہ عذر پیش کیا تھا تو اس نے کیسا معقول جواب دیا کہ ”کیوں صاحب آج کو تو عمارت کے دیکھنے کا شوق ھے، کل کو اگر کسی کو شوق ابھرا کہ دیکھیں ان کی عورتیں گھروں میں کیوں کر اٹھتی بیٹھتی ھیں تو کیا یہ لوگ ھمارے زنان خانوں میں گھسیں گے ؟

بات یہ ہے کہ معاملہ پڑا ہے نادانوں کے ساتھ ؛ اگر ان کی دل جوئی مد نظر ہو تو ہزار تدبیریں ہیں اور اگر سرے سے ان کی کچھ حقیقت ہی نہ سمجھو اور ان کی رضامندی نارضامندی کا خیال ہی نہ کرو جیسا کہ ہوا ، تو پھر غدر کی شکایت کیا۔ ہندوستانیوں کو حقیر سمجھنا اور اُن کی خوشی نا خوشی کی مطلق پروا نہ کرنا، یہ رنگ نہ صرف عہدہ داران انگریزی کی سدارات بلکہ خود گورنمنٹ کے تمام کاموں میں بھی جھلکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ گورنمنٹ کی نیتْ بہ‌خیر ہے اور رعایا کو ہر طرح سے آسودہ اور خوش‌حال رکھنا چاہتی ہے مگر وہ دیکھتی ہے اپنے عہدہ داروں کی آنکھوں سے اور سنتی ہے انہیں عہدہ داروں کے کانوں سے جن کو رعایا کے ساتھ ارتباط و اختلاط نہیں؛ پس رعایا کا دکھ درد ، اُس کی حاجتیں اور ضرورتیں یعنی رعایا کا حال گورنمنٹ پر منکشف نہیں ہونے پاتا۔

میں اس بات کو مانتا ہوں کہ سارے ہندوستان میں اس سرے سے اُس سرے تک کوئی شخص ایسی معلومات اور لیاقت اور دیانت کا نظر نہیں آتا کہ گورنمنٹ اُس کو رعیت کا وکیل سمجھ کر اس سے مشورہ لے اور اُس کی بات پر اعتماد کرے۔ جن لوگوں پر وجاہت اور تموّل کے اعتبار سے نظر پڑتی ہے مثلاً ہندوستانی رئیس ، اکثر مٹی کے تھوے جن کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ دو اور دو کے ہوتے ہیں۔ پس ان کا عدم اور وجود دونوں برابر؛ اگر یہ لوگ گورنمنٹ انگریزی کو صلاح دینے کی قابلیت رکھتے ہوتے تو اپنی ہی ریاستوں کو نہ درست کرتے۔ زیادہ نہیں گنتی کے چند رئیس کچھ سمجھ دار بھی سنے جاتے ہیں؛ تو شاید کم فرصتی کا حیلہ کریں اور اصل بات یہ ہے کہ ان کو گورنمنٹ انگریزی کی مدد کا شوق کیوں ہونے لگا اور مانا کہ شوق ہو بھی

تو کونسل کے خرّانٹ تجربہ کار ممبروں کے ساتھ بحث کرنے کو بڑی لیاقت چاہیے۔ پس اگر گورنمنٹ وہی مثل ہے کہ «طفل بہ مکتب نمی رود ولے برندش» کسی ہندوستانی رئیس کو زبردستی لے جا کر کونسل میں بٹھادے تو وہ بے چارہ سوائے اس کے کہ ٹُکر ٹُکر بیٹھا دیکھا کرے اور بے فائدہ لوگوں کی نظر میں خفیف ہو، کیا کر سکے گا۔ کونسل کے ممبر ہیں کہ باہم ردوقدح کر رہے ہیں اور یہ سمجھتا بوجھتا خاک نہیں، اسی سوچ میں ہے کہ لاٹ صاحب کس کے پلّے پر ہیں؛ آخر جب ادائے رسم کے طور پر اس سے پوچھنے کی نوبت آئی تو لاٹ صاحب کی ہاں میں ہاں ملا کر اپنا پیچھا چھڑا الگ ہو گیا۔

اب رہ گئے وہ لوگ جنھوں نے انگریزی کالجوں میں تعلیم پائی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستانیوں میں سے اگر کسی میں مشیر گورنمنٹ ہونے کی صلاحیت ہے تو ان میں ہے؛ انگریزی جانتے ہیں، اپنے ملک کے حالات سے بھی واقف ہیں، خیالات بھی روشن اور وسیع ہیں، آزادی اور قومی ہمدردی کے بھی لمبے چوڑے دعوے ہیں اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ انگریزی گورنمنٹ کی ماہیت اور اس کے منشاء کو خوب پہنچے ہوئے ہیں۔ مگر نقص سے یہ گروہ بھی خالی نہیں؛ اول تو یہ لوگ، چھوٹا منہ بڑی بات، انگریزوں کے ساتھ مساوات کا دم بھرتے ہیں اور اسی وجہ سے انگریزوں کی نظر میں کھٹکتے ہیں، دوسرے چونکہ خود انگریزوں کی قوم کے نہیں، اُن کے حقوق پر بالکل نظر نہیں کرتے اور اُن سے منصفانہ صلاح کی توقع نہیں (لیکن با این ہمہ غایت مافی الباب یہ کہ اس راہ میں چند مشکلات ہیں تو کیا مشکلات پر نظر کرکے وہ راستہ چھوڑ دیا جائے گا جس میں چلنا ضرور ہے ؟

اگر شروع سے گورنمنٹ نے اس کا خیال کیا ہوتا تو آج کو یہی ہندوستانی رئیس جن کو میں ننگ ہندوستان کہتا ہوں، یہاں کی کونسل تو خیر ولایت کی پارلیمنٹ کے قابل ہوتے، لیکن گورنمنٹ نے ان ہندوستانی ریاستوں کے بارے میں بڑی غلطی کی: ان کو شتر بے مہار کی طرح مطلق العنان رہنے دیا کہ پیٹ بھر کر بگڑیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ان ریاستوں کی خرابی کو گورنمنٹ انگریزی اپنے استحکام کا موجب سمجھتی ہے۔ اب فرض کیجیے کہ ہم ان رئیسوں کو کونسل میں بٹھانے لگیں تو شروع شروع میں ان کی کارروائی ضرور ویسی ہی ہوگی جیسی تھوڑی دیر ہوئی میں نے بیان کی، لیکن اگر ہم چندے صبر کریں تو آخر ان رئیسوں کو کبھی تو غیرت آئے گی، کبھی تو شرمائیں گے۔ میں تو کہتا ہوں کہاں کے کالج اور کیسے مدرسے، رئیسوں کے حق میں تو یہی کونسل کافی ہے؛ علی سبیل البدلیت سب کو کونسل میں بٹھایا جائے اور پھر ایک ایسا چکّر بندھے کہ مثلاً ہر پانچویں برس کونسل میں حاضر ہونے پر مجبور کیے جائیں؛ پھر دوسری ہی نوبت میں دیکھیے کہ ان کی حالت میں کس قدر ترقی ہوتی ہے۔

غرض گورنمنٹ کا یہ رنگ کہ وہ ملک کا انتظام رعایا کی رائے پر کرنا چاہتی ہے، ہندوستان کی گورنمنٹ میں تو ہے نہیں۔ ہندوستانیوں کی قسمت کی جو ڈسپاٹک* گورنمنٹ سدا سے تھی، اب بھی ہے؛ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے اپنی گورنمنٹ تھی، اب اس پر اجنبی مسلّط ہیں۔

ہمیشہ سے ہندوستان سارے جہان میں بدنام رہا ہے کہ اس میں چاندی سونے کی ندیاں پڑی بہتی ہیں اور اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ یہ ملک زرخیز اور سیر حاصل ہونے میں

---

*شخصی خود مختاری۔

روئے زمین پر اپنا نظیر نہیں رکھتا لیکن ایک ایشیائی شاعر نے ہندوستانیوں کے حسب حال کیا اچھا کہا ہے:

تہی دستان قسمت را چہ سود از رہبر کامل
کہ خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را

اگر آپ صبر اور توجہ سے سننا چاہیں تو قبل اس کے کہ میں اپنی جگہ پر بیٹھوں میں آپ صاحبوں کو اس کا یقین کرا دوں گا کہ (ہندوستان کی رعایا پہلے کی بہ نسبت بہت سقیم الحال ہوگئی ہے اور یوماً فیوماً سقیم الحال ہوتی چلی جاتی ہے) ذرائع معاش کے اعتبار سے ہندوستان کے لوگ چار طرح کے ہیں: اول کسان، دوم اہل حرفہ، سوم نوکری پیشہ، چہارم تجارت پیشہ۔ کسان کی قسم میں تعلقہ دار سے لے کر ھکوا ہے تک زمیندار، کاشتکار باقسامہم سب داخل ہیں جو زمین سے معاش پیدا کرتے ہیں۔ انگریزی عملداری سے پہلے نہ کوئی رقبے کی پیمائش کرتا تھا اور نہ اقسام زمین دیکھتا تھا؛ پچھلی جمع پر نظر کرکے یا بہت سیانپت کی تو سرسری طور پر صورت حال دیکھ کر گاؤں پیچھے اٹکل پچو ایک جمع ٹھہرا دی، چھٹی پائی۔ اس کے ہزاروں لاکھوں تحریری ثبوت موجود ہیں کہ ہندوستانی گورنمنٹوں میں طرح طرح کے ظلم ہوتے تھے مگر سرکاری مالگزاری کے بارے میں ہمیشہ آلٹی سرکار ہی مظلوم تھی؛ زمیندار لوگ کارپردازان سرکاری کے ساتھ سازش کرکے جمع کم کراتے چلے جاتے تھے اور پھر جمع کے وصول کا یہ حال تھا کہ شاذ نادر کوئی بھلا مانس زمیندار وقت پر دیتا ہوگا؛ دو دو چار چار برس کی باقی داری تو ایک بات تھی، جب باقی بہت بڑھ جاتی تو آخر کو آدھی تہائی پر فیصلہ ہوتا تھا۔ رہے کاشتکاران کو تو یوں سمجھو کہ گویا سرکار کی رعیت ہی نہ تھے؛

ان کا نیک و بد ، نفع و نقصان سب بہ اختیار زمیندار مگر چونکہ زمینداروں کا اپنا مفاد تھا ، ہر زمیندار کاشتکاروں کو اپنی دولت سمجھتا تھا ، ضرورت پڑے پر تخم و تقاوی سے اُس کی مدد کرتا ، خرید مویشی اور شادی بیاہ تک کے لیے اُس کو قرض دیتا ۔ پھر نقدی لگان کا دستور نہ تھا ؛ فصل پک کر تیار ہوئی ، زمیندار کاشتکار دونوں نے غلہ بانٹ لیا ، کم ہوا تو کم، زیادہ ہوا تو زیادہ ؛ نہ حجت نہ تکرار ، اللہ اللہ خیر صلاح ۔ یہ ہے خلاصہ ہندوستانی سرکاروں کے انتظام مالگزاری کا ۔

اب گورنمنٹ انگریزی کے انتظام کو دیکھنا چاہیے کہ اول تو مزروعہ ، اُفتادہ ، بنجر ، چپّے چپّے زمین کی پیمائش کرائی ، پھر مٹّی کی ذات اور کھاد اور آب پاشی کے لحاظ سے کھیت کھیت کی حیثیت دریافت کی اور پھر کاغذات دیہی اور لوگوں کی گواہی اور ذاتی تجربے سے یہاں تک تحقیق کیا کہ اس کھیت میں اس قدر پیداوار کی قابلیت ہے ۔ اُس طرح پر جزرسی کے ساتھ گاؤں کی نکاسی نکال کر کہنے کو آدھا اور واقع میں اچھا خاصا کسا ہوا دو تہائی حق سرکار ٹھہرا دیا اور اتنی کاوش پر بھی ہمیشہ کے لیے نہیں بلکہ غایت درجے صرف تیس برس کے لیے کہ اتنے میں زمیندار پھر کچھ پنپیں گے تو پھر نچوڑیں گے ۔

میں یہ نہیں کہتا کہ سرکار اپنا حق واجب نہ لے ۔ اُس نے پیمائش سے ، اقسام زمین وغیرہ کی تحقیقات سے ، اپنے مطالبے کے ٹھہرانے میں اگر احتیاط کی تو ٹھیک کیا درست کیا مگر میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ رعایا اور سرکار کا تعلق من وجہ بندے اور خدا کا تعلق ہے ۔ یہاں انصاف سے کام نہیں چلتا ، بلکہ رحم و رعایت سے ۔ سرکار کو قرار داد جمع

میں ایک سود خوار بنیے کی طرح دمڑی دمڑی اور ادّھی ادّھی کا حساب نہیں کرنا چاہیے تھا خصوصاً ایسی رعایا کے ساتھ جو پچھلی سلطنتوں میں کار پردازان سلطنت کی نمک حرامی یا بددیانتی یا اپنی خود سری اور چالاکی سے چنگی کی طرح سرکاری مالگزاری ادا کرنے کی خو گر رہی ھے - پھر بندوبست کا میعادی ہونا گروہ زمینداران کی سخت بے دلی کا موجب ھے اور اگر سچ پوچھیے تو ملکی ترقی کا مانع - کوئی رعایا کیسی ھی سرکار کی خیر خواہ اور اطاعت گزار کیوں نہ ھو، کیوں پسند کرے گی کہ محنت کرے وہ، لاگت لگائے وہ اور جب زمین کی حیثیت درستی پر آئے تو سرکار محاصل میں سے آدھا تقسیم کرانے کو آ موجود ھو -

پچھلی سلطنتوں میں ھر گاؤں بجائے خود ایک چھوٹی سی ریاست تھا؛ اب سرکار انگریزی کے انتظام مالگزاری نے زمینداروں کو ایسا مجبور اور بے دست و پا کر دیا ھے کہ اکثر صورتوں میں زمینداری ایک مصیبت ھوگئی ھے - سرکار نے کاشتکاروں کے ایسے حقوق تسلیم کر لیے ھیں کہ کہ زمیندار کا کاشتکاروں پر ذرا بھی دباؤ باقی نہیں رھا - زمیندار کسی کاشتکار کو کھیت سے بے دخل کرنا چاھے کیا مقدور، کھیت کی پیداوار کو اٹکانا چاھے کیا طاقت، سختی اور تنگ طلبی کے ساتھ لگان وصول کرنا چاھے کیا مجال - سرکار اپنا لینا عین وقت پر زمیندار سے لیتی ھے اور جو زمیندار کو کاشتکار سے پانا ھے، اس کے لیے حکم ھے کہ نالش کرو، ڈگری جاری کراؤ؛ خلاصہ یہ ھے کہ سرکار کے انتظام مالگزاری نے زمینداروں اور کاشتکاروں میں ھم دردی اور

معاونت کی جگہ عداوت اور کشمکش پیدا کردی ہے۔ اب وہ اگلے دیہی جتھے ٹوٹ پھوٹ کر گھر گھر چودھری اور کھیت کھیت زمیندار ہو گئے۔

میں نہیں جانتا کہ آپ لوگوں میں اس طرح کی کوئی کہاوت ہے یا نہیں مگر میں یقین کرتا ہوں، ضرور ہو گی۔ عربی میں تو ایک مشہور مثل ہے، «الاتفاق قوۃ»۔ پس ہر ہر گاؤں اگر اگلی سی زمینداری ہو، اپنی اپنی بساط کے موافق ایک قوت ہے اور ان کا مجموعہ ایک بلا کا زور ہے، نا ممکن المقاومت۔ یہ زور اگر گورنمنٹ کا مساعد ہو سکے تو میں نہیں خیال کرسکتا کہ گورنمنٹ کو روپے کی، سپاہ کی، آلات حرب کی، اعوان و انصار کی، کسی قسم کی دوسری قوت درکار ہو لیکن گورنمنٹ نے بجائے اس کے کہ اس قدرتی، خدا داد زور سے فائدہ اٹھائے اس کو ضائع اور معدوم کر دینا آسان سمجھا اور ضائع اور معدوم کر دیا۔ اس بارے میں گورنمنٹ کی عقل اس جوگی کی عقل سے کچھ زیادہ تعریف کی مستحق نہیں جو اپنے ہاتھ کو خشک کر ڈالتا ہے اس خیال سے کہ شاید وہ اس ہاتھ سے کسی گناہ کا مرتکب ہو۔

زمیندار تو اس وجہ سے گرے کہ ان کو گورنمنٹ نے قصداً گرایا۔ رہ گئے عام کاشتکار، وہ سدا سے اس بات کے خوگر تھے کہ زمیندار ان کو انگلی پکڑا کر لے چلے تو آگے کو پاؤں اٹھائیں۔ اب زمیندار تو ہوا دست کش، ان میں کھڑے رہنے کا بوتا نہیں: یہ بھی گرے اور ایسی بری طرح گرے کہ سرکار نے ان کو اپنے پندار میں گڑھے میں پڑا ہوا دیکھ کر باہر نکالا؛ یہ جو لڑکھڑائے، دھڑام سے کوئیں

میں۔ زمینداران کو دباتے بھی تھے ، ستاتے بھی تھے مگر
یہ بھی نہیں دیکھ سکتے تھے کہ بگڑ جائیں ، اجڑجائیں۔
اب اُن کو پالا پڑا بنیوں سے ، ساھوکاروں سے ، سہاجنوں سے ،
جن کا دھرم یہ ھے کہ ان تلوں کو پیلیے جہاں تک پیلا
جائے اور پھر ان کی کَھلی کو سانی والوں کے ھاتھ بیچ
کر کوڑے سیدھے کیجیے ۔ اب کاشتکاروں کا حال کیا ھے
کہ ھزار میں شاید دو چار بچے ھوں تو خبر نہیں، ورنہ
سب کے سب گویا سہاجنوں کے مزدور ھیں؛ اتنا نہیں کہ
کسی کے گھر سے وقت پر بیج نکل آئے ۔ کھیت میں ھزار
نعمتیں کیوں نہ پیدا ھوں ، اُن کی اور اُن کے بال بچوں کی
تقدیر کا سانوان ، کودوں ، جو بنی اسرائیل کے من و سلویٰ
کی طرح ستو باندھ کر پیچھے پڑا ھے ، کیا مجال کہ کبھی
ناغہ ھو لے ؛ ایک دفعہ سہاجن کو چھو جانا شرط ھے ۔
غرض جتنے کسان پیشہ ھیں ، کیا زمیندار ، کیا کاشتکار ،
سب تباہ اور خستہ حال ھیں۔ چوں کہ سرکاری مالگزاری
وقت مقرر پر وصول ھو جاتی ھے، سرکار سمجھتی ھے کہ
انتظام مالگزاری اچھا ھے، زمیندار و کاشتکار مقدور والے ھیں۔

رعایا کا اصلی حال سرکار پر منکشف ھو بھی تو
کیوں کر ھو ۔ جو شخص ایسی فریاد کو سرکار کے کان تک
پہنچا سکتا ھے ، ھو نہ ھو یورپین ھی حاکم ضلع ھو: ھندوستانی
حاکموں میں سے نہ تو کسی کی ایسی وقعت اور نہ کسی میں
اتنی جرأت ؛ رھا حاکم ضلع ، وہ حتی الوسع سوتی بھڑوں کو
کیوں جگانے لگا ؟ اگر وھی مجوّز جمع بھی ھے تو پہلے اُس کو
اپنی غلطی کا اعتراف کرنا ضرور ھوگا اور معمولی حالتوں میں
انسان سے ایسی توقع کرنی فضول ھے اور وہ مجوّز جمع نہ

بھی ہو تاہم محصل تو چار و ناچار ضرور ہوگا، وہ جوش اظہار کار گزاری میں وصول جمع کو ملتوی یا موقوف کر نہیں سکتا اور پھر تخفیف جمع کی تحریک کرنا بیٹھے بٹھائے ایک جواب دہی کا مول لینا ہے۔ گورنمنٹ ایسے مین سیکھ نکالتی ہے (اور اس کا حق بھی ہے) کہ اُس کا رضامند کرنا ایک مصیبت ہے۔ یہ ہے خلاصہ ہمارے انتظام مالگذاری کا جو کم سے کم دو ثلث رعایا پر موثّر ہے۔

اہل حرفہ کی کیفیت کسانوں سے کہیں بدتر ہے۔ یہ سچ ہے کہ گورنمنٹ ان کے حال سے کم تر تعرّض کرتی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نہیں کرتی مگر یورپ کی کلوں نے ان کو مار پٹڑا کر دیا۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے بہت سے عمدہ اور یافت کے پیشے معدوم ہو گئے اور ہوتے چلے جاتے ہیں: اب کہاں ہیں وہ ڈھاکے کے ململ، بنارس کے مشروع، اورنگ آباد کے کمخواب، بیدر کے برتن، کالپی کے کاغذ، کشمیر کی شالیں، لاهور کے ریشمی ڈورے۔ اهل یورپ کیا اس پر بند هیں کہ جس چیز کی مانگ هندوستان سے هوئی، بنائی بھیج دی؟ نہیں وہ لوگ رات دن اس ٹوہ میں لگے هیں کہ هندوستان میں کیا کیا چیز پیدا هوتی هے اور وہ انسان کے کس مصرف کی هے اور اس ملک کے لوگوں کو کیا درکار هے۔ نتیجہ یہ هے کہ هندوستان سے هر طرح کی پیداوار ولایت ڈھُلی چلی جاتی هے؛ کچھ تو یورپ میں کھپی اور کچھ هندوستانیوں کے مصرف کی بن کر اُلٹی آ گئی۔ هندوستانی اهل حرفہ تھکے تو یوں تھکے کہ یہ جو کچھ کریں اپنے هاتھ پاؤں سے اور انسان کی قوت کا اندازہ معلوم هے، آٹھ پہر میں آخر وہ دم بھی لے گا، آسائش بھی کرے گا اور وهاں یورپ میں کلیں هیں

کہ سارے سارے دن ، ساری ساری رات ، برابر ، بے تکان
پڑی چل رہی ہیں ۔ ہندوستانیوں میں کلوں کا ایجاد کرنا تو
کجا ابھی تو کلوں سے کام لینے کے سلیقے کو بھی عمریں
چاہییں ۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ ہندوستان کے اہل حرفہ کی
تباہی خود اُنھیں کی نادانی کی وجہ سے ہے مگر ہندوستانی
اس درجے کے جاہل اور کاہل ہیں کہ ان میں اپنی حالت کے
درست کرنے کی گدگدی خدا نے پیدا ہی نہیں کی ۔ یہ تو
گورنمنٹ سے چاہتے ہیں 'لاد دو ، لدا دو ، لادنے والا ساتھ
دو ۔ یورپ کی تمام تر ترقی کا اصلی اور حقیقی سبب علوم جدید
ہیں اور اس زمانے میں تعلیم وہی مفید ہو سکتی ہے جس سے
یہاں کے لوگ ان علوم سے آگہی بہم پہنچائیں اور ان کی
طبیعتوں میں اس بات کا شوق پیدا ہو کہ واقعات کو سوچیں
اور موجودات میں غور کریں ۔ سو سررشتۂ تعلیم کا اتنا اثر تو
ضرور دیکھنے میں آتا ہے کہ لکھنے پڑھنے کا چرچا پہلے سے
بہت زیادہ ہو گیا ہے؛ جن لوگوں میں پڑھنے لکھنے کا دستور
نہ تھا ، وہ بھی اپنے بچوں کو پڑھانے لگے ہیں بلکہ اس
قسم کے لوگ بہ کثرت ہیں ۔ انگریزی کا شوق بھی بر سر ترقی
ہے اور شکر ہے کہ اگلی سی وحشت اور نفرت کا کہیں
پتا نہیں؛ صرف مسلمانوں کو احمقانہ تعصب کی وجہ سے رکاوٹ
تھی ، وہ بھی عارضی ، چند روزہ ، مگر اس تعلیم سے ملک کو
فائدے کے عوض اُلٹا نقصان پہنچ رہا ہے کیونکہ صرف
نوکری کی طمع سے لوگ پڑھتے ہیں ، نوکری ہی ان کے
نزدیک پڑھنے کی غرض و غایت ہے ، نوکری ہی کے لیے
ان کو تیار بھی کیا جاتا ہے اور اُن کا مبلغ علم بھی وہیں

تنگ ہے - مجھ کو حقیقت میں سخت حیرت ہے کہ اتنی نوکریاں کہاں سے آئیں گی - میں ایسا خیال کرتا ہوں کہ انگریزی عملداری میں لکھنے پڑھنے کی اس قدر کثرت کچھ اس وجہ سے بھی ہے کہ سرکاری نوکری بلا امتیاز شریف و رذیل ہر ایک کو حاصل ہو سکتی ہے اور یہی سبب ہے کہ کمینوں میں علم کا رواج زیادہ ہوتا جاتا ہے، شریفوں کو تنزّل ہے، رذیلوں کو بحالی ہے - عموماً شریف اقوام کے لوگ غریب ہیں، اخراجات تعلیم کے برداشت نہیں کر سکتے اور کچھ ایسے بھی شریف ہیں جن کو خدا نے دیا ہوا ہے، وہ بڑی سے بڑی تعلیم پر خرچ کر سکتے ہیں ؛ ان کی اولاد کو ایسی شیطان نے انگلی دکھائی ہے کہ خود پڑھنا بھی چھوڑ بیٹھتے ہیں -

پس اگر سچ پوچھیے تو سررشتۂ تعلیم سے جیسا کہ اب ہے، ملک کا اُلٹا علاج ہو رہا ہے - ہم کو درکار تھے وہ علوم جو صنعت اور حرفت کو ترقی دیں اور اب لوگوں کو ایسی پٹی پڑھائی جاتی ہے کہ موروثی اور آبائی پیشوں اور حرفوں سے گریز اور نفرت کرتے ہیں بلکہ اُنھوں نے اسی عار سے بچنے کے لیے پڑھنا اختیار کیا تھا -

اب مجھ کو صرف تجارت پیشہ لوگوں کی نسبت کچھ کہنا چاہیے، سو میں اس کو مانتا ہوں کہ انگریزی عملداری میں اس پیشے کے لوگوں کو کسی طرح کی شکایت نہیں ہونی چاہیے : امن میں کسی طرح کا تزلزل نہیں، مال کی آمد و شد میں یوماً فیوماً سہولت زیادہ ہوتی چلی جا رہی ہے، عدالت کی کارروائی لائق اطمینان ہے، تاجر کو اَور چاہیے کیا ؟ مگر تجارت کو چاہیے سرمایہ اور سرمائے ہی کا تو بڑا رونا ہے - پس یہ پیشہ ایک محدود پیشہ ہے جس کو

ہندوستان میں صرف معدودے چند اختیار کرسکتے ہیں۔
ایک۔ دوسرے حرفے اور صنعت کا کساد عین تجارت کا کساد
ہے اور یہ میں ابھی تھوڑی دیر ہوئی ثابت کرچکا ہوں
کہ ہمارے ملک کی صنعت پر اوس پڑتی چلی جاتی ہے؛
پس اسی نسبت سے تجارت میں بھی کمی ہے ۔سچ پوچھیے
تو ساری تجارت اہل یوروپ کی مٹھی میں ہے اور میں ہندوستانیوں
کو تاجر نہیں بلکہ تاجروں کا دلّال سمجھتا ہوں؛ ولایت سے
مال منگواتے ہیں، اس کے طفیل میں روپے پیچھے دھیلا دمڑی
آپ بھی جھاڑ کھاتے ہیں ۔

اس وقت تک میں نے رعایائے ہندوستان کو چار بڑے
پیشوں میں تقسیم کرکے ہر ایک کی خستہ حالی کو اپنے
پندار میں دلائل عقلی سے ثابت کیا، اب میں بہت نہیں
گنتی کی چند عام باتیں بیان کروں گا جو بلا تخصیص کسی
پیشے کے عام ہندوستانیوں پر موثّر ہیں اور ان کو کم و بیش
ہندوستانیوں کے افلاس میں دخل ہے ۔

ہندوستان کے لوگ عادتاً سادگی اور کفایت شعاری سے
زندگی بسر کرنے والے ہیں اور ان لوگوں نے اپنی ضرورتوں
کو اس قدر محدود کر رکھا ہے کہ ان کو بہت سا سازوسامان
درکار نہیں۔ ان کے پاس اگر روپیہ ہو تو کھانے پینے کے
ضروری مصارف کے بعد اس کا زیور اپنی عورتوں کو گھڑوا
دیتے ہیں یا یوں کہو کہ اس کو اس پیرائے میں جمع
رکھتے ہیں؛ تو جس قوم میں عموماً سادگی اور کفایت
شعاری کا دستور متوارث ہو، اس کے اکثر افراد کو علیٰ
قدر مراتب سرمایہ دار ہونا چاہیے اور انگریزی عملداری سے
پہلے ہم میں اکثر لوگ خوش حال تھے بھی ۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ ادنیٰ اور اعلیٰ سب کے خرچ بڑھتے چلے جاتے ہیں اور اس کے چند در چند اسباب ہیں۔ اول یہ کہ تکلّف اور آرائش اور نمود و نمائش کی نئی نئی چیزیں ولایت سے آ کر رواج پاتی ہیں اور زندگی کے لیے جدید ضرورتیں پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ خرچ کے لیے اس کثرت سے موجبات ترغیب جمع ہو گئے ہیں اور ہوتے جاتے ہیں کہ انسان کیسا ہی جز رس کیوں نہ ہو ہاتھ کو نہیں روک سکتا۔ مثلاً جہاں کہیں ریل جاری ہے، آمد و شد میں ریل کی وجہ سے اس قدر سہولت ہو گئی ہے کہ جو لوگ کبھی گھر سے باہر نکلنے کا نام نہیں لیتے تھے، اب ذرا ذرا سی ضرورتوں پر چل کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر ریل میں چلنا ٹھہرا تو کپڑوں کی گٹھڑی کو کون سنبھالتا پھرے؛ سب سے بھلا بیگ میں کپڑے اور ضرورت کی چھوٹی موٹی چیزیں بھر، اوپر سے قفل لگا، مزے سے ہاتھ میں لٹکا لیا۔ پھر سفر کا نام سفر، دور جانا ہو یا نزدیک، آخر روپیہ پیسہ بھی تھوڑا بہت ساتھ رکھنا ہی پڑتا ہے۔ نیفے میں رکھو تو مشکل، ازار بند میں باندھو تو بد نما، جیب کا بھروسا نہیں، بار بار بیگ کا کھولنا بند کرنا کوئی چیز گر پڑے، کیا ضرور، ہر مرتبہ خریدنا نہیں؛ لاؤ بھئی گلے میں لٹکانے کا چمڑے کا تھیلا خرید لیں، مدتوں کے لیے چھٹّی ہوئی۔ لیکن کم بخت حقّے کی کیا تدبیر کرنی ہوگی؟ سنا ہے کہ ریل میں تو پینا نہیں ملتا، چلتی گاڑی میں لوگ چوری چھپے کوئلے سلگا کر اپنا کام کر لیتے ہیں۔ پر ایسے حقّے میں مزہ کیا خاک ملتا ہوگا؛ سوکھا ہوا نیچہ، خالی حقہ، اس پر گھبراہٹ کہ ایسا نہ ہو سٹیشن آجائے۔ چرٹ سب سے

اچھا کہ خاصی طرح دندناتے ہوئے پیتے چلے جا رہے ہیں، کسی کی مجال نہیں کہ ہوں تو کہے اور ساتھ کے بیٹھنے والے بھی دیکھ کر جی میں ضرور کہتے ہوں گے کہ ہاں بھئی یہ بھی کوئی ہیں۔ پر چرٹ میں کڑک جانے کا بڑا عیب ہے اور پھر کم بخت دھواں نہیں دیتا، سارا بکس لیں تو حفاظت سے رہے، بنچ کے نیچے کہیں بھی ڈال دو کچھ پروا نہیں۔ چھوٹے سے چھوٹا دیسی چرٹوں کا بکس آٹھ آنے، دس آنے کو آئے گا؛ کیا بڑی بات ہے راستہ تو آرام سے کٹے گا، ریل میں نکمے بیٹھے ہوئے اس سے بہتر دوسرا مشغلہ نہیں۔ حقّے میں بڑا کھٹراگ ہے: نیچہ، حقہ، چلم، توا، کوئلے، خدا کی پناہ! ایک آدمی کا بوجھ تو یہی ہو گیا، آدمی اپنے تئیں سنبھالے یا اتنے بکھیڑے کو لادے لادے پھرے۔ چرٹ کے لیے صرف ایک ڈبیا دیاسلائی کی چاہیے ہوگی سو حقّے کی صورت میں بھی رکھنی پڑتی؛ سڑک کے کنارے لڑکے بیٹھے ہوئے پکار رہے ہیں «دمڑی ٹکے کے تین بکس» دمڑی تو اپنے منہ سے کہتا ہے ٹکے کے تین دے گا، ایک پیسے کا ڈیڑھ؛ یہ حساب تو ٹھیک نہیں بیٹھتا، ایک بکس لیں تو کوڑیاں باندھنی پڑیں گی، کام کی چیز ہے، سیلہ بھی جائے تو جہاں دھوپ دکھائی باروت کی طرح چھٹنے لگی، آؤ اکٹھے تین بکس لے لو، پڑے رہیں گے، پھر کام آئیں گے۔ یوں ضرورتوں کا سلسلہ ہے کہ چپکے چپکے یکے بعد دیگرے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

اسی طرح ڈاک کے انتظام نے باھمی خط و کتابت کو اس قدر بڑھا دیا ہے کہ کاتب اور مکتوب الیہ چاہے دونوں میں ایک بھی پڑھا ہوا نہ ہو اور کتنے ہی غریب کیوں نہ ہوں،

زیادہ نہیں تو خیر مہینے کے مہینے ایک دوسرے کی خیر صلاح کی خبر لینی تو ضرور ہے ۔ یہ میرے ہوش کی بات ہے کہ ہمارے ملک میں چھتری کو لازمۂ امیری سمجھا جاتا تھا ، اب یہاں تک نوبت پہنچی ہے کہ کسی بڑے بازار میں دھوپ کے وقت کھڑے ہو کر دیکھیے تو اس سرے سے اس سرے تک چھتریوں کا ایک سایہ بان تنا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔ میں کہتا ہوں کیا اب ہمارے ملک میں موم کے آدمی پیدا ہوتے ہیں کہ دھوپ لگی اور پگھلے یا مثلاً ایک کپڑے پر نظر کیجیے کہ اس کے ضروری ہونے میں کچھ کلام نہیں ؛ ولایت سے قسم قسم کے وضع دار کپڑے بن بن کر چلے آتے ہیں کہ خواہ مخواہ آدمی کا دل ان کے پہننے کو چاہتا ہے اور چونکہ کلوں کی وجہ سے سستا بہت ہے ، اکثر آدمی اس کی وضع داری پر فریفتہ ہو کر بلا ضرورت بھی بنا لیتے ہیں اور پھر اس کے استعمال میں بھی چنداں احتیاط نہیں کرتے ۔

میں ایسا خیال کرتا ہوں کہ سولزیشن (شائستگی) اور اسراف لازم و ملزوم ہیں ۔ پس جس قدر ہندوستانیوں میں سولزیشن کی ترقی ہوگی ، ضرور ہے کہ ان کا خرچ بڑھے ۔ اگر اسی نسبت سے ہندوستانی اپنی آمدنی بھی بڑھا سکتے تو کچھ پروا کی بات نہ تھی مگر آمدنی الٹی گھٹ رہی ہے تو خرچ کی زیادتی ان کو اکھرا ہی چاہے ۔ عام لوگ جن کی معلومات کا دائرہ تنگ ہے اور جن کو سوچنے اور غور کرنے کی عقل نہیں ، سب کے سب بالاتفاق کہتے ہیں کہ انگریزوں کی عملداری میں امن ہے ، انصاف ہے ، زور نہیں ، ظلم نہیں مگر خدا جانے کیا بات ہے اگلے وقتوں کی سی خیر و برکت نہیں ؟ روپیہ ہے کہ ٹھیکری کی طرح اٹھا چلا جاتا ہے اور اس پر پیٹ کو روٹی ہے تو تن کو کپڑا نہیں اور

کپڑا ہے تو روئی نہیں اور ہو تو کہاں سے ہو۔ وہ اگلے سے سمے ہی گئے گزرے ہوئے، بزرگوں کے عیش تو بزرگوں کے ساتھ گئے۔ یہ تو ہمارے ہوش کی بات ہے کہ ایک روپے کا غلّہ ایک آدمی کے اٹھائے نہیں اٹھتا تھا۔ بھلا سمے کا کچھ ٹھکانا ہے؛ روپے کے چھ دھڑی گیہوں داؤدی صاف ستھرے، ساڑھے تین سیر چار سیر کا دانہ دار خالص گھی، پانچ سیر کی سفید براق کھانڈ، بیس سیر کا گڑ تو دس من کے اپلے اور علی ھذالقیاس۔ اب جس چیز کو دیکھو آگ لگ رہی ہے، روپیہ ادھر بھنا اُدھر ندارد۔

سبب کے ٹھہرانے میں غلطی ہو مگر سمے کی شکایت بھی بے اصل نہیں۔ یہ بالکل سچ ہے کہ اگلی سی برساتیں نہیں ہوتیں، زمین ہے کہ جنگل اور باغات کٹ کٹ کر برابر مزروعہ ہوتی چلی جاتی ہے اور علم طبعی میں یہ مسئلہ حد تیقّن کو پہنچ گیا ہے کہ درخت بالخاصّہ افراط بارش کے سبب ہوتے ہیں اور جنگلی علاقوں میں بارش کا بہ کثرت ہونا اس کا شاھد ہے۔ پھر زمینداروں کو تشخیص جمع میں ایسا دھر کر کسا ہے کہ گاؤں کا سارا رقبہ ہر سال جوتا بویا نہ جائے تو سرکاری جمع گھر سے بھرنی پڑے؛ پس زمیندار بہ مجبوری زمین کو مطلق دم نہیں لینے دیتے۔ اُن کا بس چلے تو یک فصلی زمین سے دو اور دو فصلی سے چار فصلیں پیدا کریں۔ یوں زمین بے دم اور کمزور اور اُس کی قوت پیداوار گھٹتی چلی جاتی ہے جس کو عوام بے برکتی سے تعبیر کرتے ہیں۔

لوگ انگریزی عملداری کی نسبت ایسا بھی خیال کرتے ہیں کہ اس عملداری میں بے ایمانی بہت پھیلتی جاتی ہے۔ لوگوں میں اگلی سی راست معاملگی نہیں رہی؛ نیتوں میں فساد، دلوں

میں دغا ، باتوں میں جھوٹ ، جس کا ضروری نتیجہ یہ ھے کہ
بات بات میں لوگ ایک دوسرے سے لڑ پڑتے ھیں۔ جس عدالت
میں جا کر دیکھو مقدمات کی یہ کثرت ھے کہ حاکم کو سر
کھجانے تک کی فرصت نہیں اور جہاں ایک دفعہ عدالت جھانکی
اور جھگڑا سریش کی طرح چمٹا۔ اول تو ایک کے اوپر ایک
عدالتیں ھی اتنی ساری ھیں کہ ان شیرے کے کھیتوں میں سے
نکلنا مشکل ، دوسرے وکیل مختار ایسے جھانسے دیتے ھیں کہ
کیسا ھی سیانا آدمی کیوں نہ ھو، ان کے دھوکے میں آ ھی جاتا
ھے ۔ پھر عدالت کے انصاف کی نسبت لوگوں کی عام رائے ھے
کہ جو جیتا ، وہ ھارا اور جو ھارا ، سو مرا اور فی الواقع عدالتوں
کی کارروائیاں اس قدر الجھی ھوئی ھوتی ھیں کہ سٹامپ اور
طلبانوں اور محنتانوں اور شکرانوں کے خرچوں کے مارے فریقین
ادھڑ جاتے ھیں یعنی عدالت میں مقدمہ جیتنے کے معنے یہ ھیں
کہ جائداد متنازعہ فیہ نذر خرچۂ عدالت۔ حقیقت میں کچھ سمجھ
میں نہیں آتا کہ یہ سب قاعدے قانون انسداد فساد کی غرض
سے جاری کیے جاتے ھیں اور نتائج کے دیکھنے سے معلوم ھوتا
ھے گویا قانون باعث فساد ھے ۔

میرے ایک دوست ایک ھندوستانی ریاست میں نوکر ھیں۔
میں نے ان سے پوچھا تھا کہ کیوں صاحب آپ کے یہاں
عدالتوں کا چنداں اھتمام معلوم نہیں ھوتا اور قانون بھی آپ
فرماتے ھیں کہ ھمارے یہاں منضبط نہیں ، پھر لوگ کیا کرتے
ھوں گے ؟ انھوں نے جواب دیا کہ اول تو ھماری رعایا اس قدر
جھگڑالو نہیں ؛ کسی بات میں اختلاف ھوا بھی تو اکثر آپس
میں رفع دفع کر لیتے ھیں اور جو شاذ نادر ھم تک فریاد لائے
تو ذراسی کوشش میں ایک دوسرے کے حلف پر حصر

کر دیتے ہیں یا پنچایت پر راضی ہو جاتے ہیں۔ وہ اس بات کی تصدیق کرتے تھے کہ وہاں کے لوگ جھوٹ کم بولتے ہیں اور بڑے شد و مد کے ساتھ کہتے تھے کہ میں پندرہ برس سے ایک بڑے علاقے کا عامل ہوں اور صدھا مقدمے میرے ہاتھ تلے آئے ، آج تک میرے کان میں یہ بھنک نہیں پڑی کہ کسی نے جھوٹا حلف اٹھایا ۔

اگر عدالت کو لوگوں کے اخلاق کی کسوٹی نہ سمجھا جائے تو میں ایک دوسری دلیل پیش کرتا ہوں ، شراب خوری کی کثرت ۔ جو شخص اس چیز کو مذھباً ممنوع نہ سمجھے اور وہ اعتدال کے ساتھ اس کا استعمال کرے تو مجھ کو اس پر طعن کرنے کا کوئی حق نہیں اور مجھ کو اس پر طعن کرنا منظور بھی نہیں ۔ میں اس موقع پر اتنا ھی ظاھر کرنا چاھتا ھوں کہ آیا تموّل کے اعتبار سے ھندوستانیوں کی ایسی حالت ھے کہ ان کو شراب خوار بننے دیا جائے ، جس سے آخرکار جواری ، فضول خرچ ، کاھل ، عیاش ، چور ، ڈاکو اور انواع و اقسام کے امراض خبیث میں مبتلا ھو کر ایسی مصیبت مندانہ زندگی بسر کریں کہ عذاب ھوں اپنے حق میں اور سوسائٹی کے حق میں ۔ یہ ھرگز اصول نہیں ھونا چاھیے کسی عاقل گورنمنٹ کا اور خاص کر انگریزی گورنمنٹ کا جو عقل کے علاوہ ایک پاکیزہ مذھب کا فخر بھی رکھتی ھے ۔ اگر گورنمنٹ ایسی بری چیز کی جس کو ھمارے سچے پیغمبر ص نے اور آپ کے نزدیک عرب کے بڑے رفارمر نے بواجب ام الخبائث کہا ھے اور ھر ایک زمانے کے عقلاء نے اس کی برائی اور ڈاکٹروں نے اس کے نقصانات پر اجماع کیا ھے ، بندی نہیں بلکہ روک کر سکتی ھے تو گورنمنٹ بہ تقاضائے مصلحت ملکی

کیوں اپنا سارا زور سختی کے ساتھ اس کے روکنے میں صرف نہ کرے۔

اب مجھ کو آپ صاحبوں کی سامعہ خراشی کرتے ہوئے بہت دیر ہو گئی اور میں ڈرتا ہوں کہ کہیں میں نے نوبل صاحب کی لذیذ ضیافت کو تو بے مزہ نہیں کر دیا۔ بات جا پڑی اسباب غدر میں اور یہ مضمون اس قدر وسیع ہے کہ اگر ہر روز اسی طرح کہا کروں تو کہیں ہفتوں میں جا کر ختم ہو تو ہو؛ تاہم میں نے اجمالی طور پر جس قدر بیان کیا اُس سے اتنی بات تو غالب ہے، آپ صاحبوں پر ثابت ہو گئی ہوگی کہ انگریزی گورنمنٹ غدر سے پہلے تک ممدوح خلائق نہیں رہی۔ مجھ کو میرے ایمان نے اور گورنمنٹ اور رعایا دونوں کی سچی خیرخواہی نے اس کے ظاہر کرنے پر مجبور کیا۔ غدر سے پہلے تک مجھ کو انگریزی گورنمنٹ سے کسی طرح کا تعلق نہیں رہا اور سوائے اس کے کہ میں شہر میں رہتا تھا، گورنمنٹ کا کوئی حق مجھ پر نہ تھا مگر خدا کو یوں منظور تھا کہ مجھ سے اور نوبل صاحب سے ایک عجیب اور غیر متوقع طور پر معرفت ہو۔ میں نے صاحب کو اُس افسوس ناک بیہوشی کی حالت میں اگر لے جا کر اپنے گھر رکھا تو سوائے فرض انسانیت کے اور کوئی خیال باعث نہیں ہوا۔ اُس وقت کوئی دور اندیش سے دور اندیش بھی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ غدر کا انجام کیا ہوگا اور یہ اونٹ کب اور کس کروٹ بیٹھے گا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جس وقت میں نے صاحب کو مُردوں میں پڑا دیکھا، میرا دل بالکل بے قابو ہو گیا تھا۔ میں نے اُس وقت اتنا بھی تو نہیں سوچا کہ ان کو لے جا کر کہاں

چھپاؤں گا اور کیا انتظام کروں گا کہ کسی پر ان کا میرے
گھر میں ہونا ظاہر نہ ہو مگر نوبل صاحب کے بارے
میں شروع سے آخر تک خدا کی قدرت کاملہ کے ایسے ایسے
کرشمے دیکھے کہ بالکل عقل کام نہیں کرتی۔ پس اگر آپ
سچ پوچھتے ہیں تو ان کو صرف خدا نے بچایا ہے اور میری
یا کسی کی تدبیر کو اس میں کچھ دخل نہیں اور اگر ان کا
بچنا خدا کی اور خدا کی قدرت کی دلیل نہیں ہے تو میرے
نزدیک پھر دنیا میں کوئی چیز کسی چیز کی دلیل نہیں۔
مجھ کو جہاں تک نوبل صاحب کے بچانے سے تعلق ہے وہ
میری نظر میں اس قدر بے حقیقت ہے کہ مجھ کو اس کا
تذکرہ کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ یہ صرف نوبل صاحب کی
کریم النفسی تھی کہ انھوں نے ایک ذرا سی بات کو اس قدر
رونق دی اور اگر نوبل صاحب کی خاطر سے میں اس کا قابل قدر
ہونا تسلیم بھی کروں تو نوبل صاحب اپنی ذات سے اس کا
دو چند، چار چند اور اس سے بھی زیادہ معاوضہ کر چکے ہیں۔
پس گورنمنٹ نے جو مجھ کو جاگیر دی، نوکری دی،
صرف احسان ہے بلا سابقۂ استحقاق اور اگر اتنے بڑے احسان
کو میں خالی شکر گزاری کے ساتھ قبول کر لوں تو اس کے
یہ معنی ہوں گے کہ بے استحقاقی کے علاوہ نا اہلی کا الزام
بھی اپنے اوپر لوں۔

جوں ہی مجھ کو نوبل صاحب سے معلوم ہوا کہ گورنمنٹ
میرے ساتھ سلوک کرنے والی ہے، مجھ کو سوچ پیدا ہوا کہ
میں اس کے معاوضے میں گورنمنٹ کی کون سی خدمت کر سکوں
گا؛ نہ تو میرے پاس مال ہے کہ گورنمنٹ کی نذر کروں،
نہ میرا پیشہ سپہ گری ہے کہ میں اپنا سر گورنمنٹ کے لیے

کٹوا دوں ۔ تب میں نے خیال کیا کہ میرے پاس دل ہے؛ پس میں آپ سب صاحبوں کے روبرو اس بات کو ظاہر کرتا ہوں کہ میں اپنا دل گورنمنٹ کی نذر کر چکا ۔ خدا نے چاہا تو میری تمام عمر اسی میں بسر ہوگی کہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا گورنمنٹ کی فلاح میں، گورنمنٹ کے قیام و ثبات میں ، گورنمنٹ کے عام پسند ہونے میں کوشش کرتا رہوں گا ۔ اے خدا! تو میرا مددگار رہ ، میں نے اپنی کارروائی کا منصوبہ ذہن میں ٹھہرا لیا ہے اور میں آپ صاحبوں کی اجازت سے مجملاً اس کو بیان کرنا چاہتا ہوں ۔ مجھ کو ابتدائے شعور سے تاریخ اور اخبار کا بہت شوق رہا ہے۔ اگرچہ اس سے تھوڑی دیر پہلے میں نے گورنمنٹ کے انتظام پر سختی کے ساتھ نکتہ چینی کی ہے، بایں ہمہ میں اقرار کرتا ہوں کہ انصاف میں ، انسانی ہم دردی میں، رعایا کی آزادی میں ، رعایا کے مہذب بنانے میں ، ملک کی فلاح و بہبود میں ، ملک کی ترقی میں ، دنیا کی کوئی گورنمنٹ انگریزی گورنمنٹ کو نہیں پاتی۔ انگریزی گورنمنٹ میں جو نقصان ہیں عملی قسم کے ہیں ورنہ اس گورنمنٹ کے اصول ایسے عمدہ ہیں کہ اُن سے بہتر نہ کبھی ہوئے اور نہ اب روئے زمین کے کسی حصے میں ہیں؛ پس میں انگریزی گورنمنٹ کو ہندوستان کے حق میں خدا کی بڑی رحمت اور برکت سمجھتا ہوں ۔ پس میری تمام ہمت اس میں مصروف ہو گی کہ رعایائے ہندوستان اس رحمت اور برکت سے پورا پورا فائدہ اُٹھائے ۔

انگریزی گورنمنٹ میں جتنے نقصان ہیں آخر کو سب کا یہی ایک سبب جا کر ٹھہرتا ہے کہ حاکم و محکوم میں اختلاط نہیں اور ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف نہیں ۔ میں

نے اس پیرائے میں گورنمنٹ کی خیرخواہی کا بیڑا
آٹھایا ہے کہ حاکم و محکوم میں سے اجنبیت کو دور
کردوں - رعایائے ہندوستان میں سے صرف مسلمانوں کو میں اس
قابل سمجھتا ہوں کہ گورنمنٹ کو ان کی تالیف واستمالت کی
سردست بہت ضرورت ہے؛ کچھ تو اس سبب سے اور کچھ اس
وجہ سے کہ میں خود مسلمان ہوں میری کوشش مسلمانوں میں
محصور رہے گی - میں مسلمانوں کے رگ وریشے سے واقف ہوں
اور مجھ کو ہونا چاہیے کیوں کہ مجھ کو خود مسلمان ہونے
کا فخر حاصل ہے - میں بہت وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ
مذہب اسلام میں ہر گز کوئی بات ایسی نہیں جس کی وجہ سے
گورنمنٹ مسلمانوں کی طرف سے نامطمئن ہو -

ہمارے پیغمبرصا صاحب کی زندگی میں دونوں طرح کے نمونے
موجود ہیں - آن کی پیغمبری کی عمر میں سے آدھی سے زیادہ
مغلوبی کی حالت میں گذری جب کہ قریش مکہ صرف مذہبی
مخالفت کی وجہ سے آن کو اور آن کے رفقاء کو جو آن پر ایمان
لائے تھے، طرح طرح کی ایذائیں دیتے تھے اور فقط اس وجہ سے
کہ یہ لوگ ایک خدا کو مانتے اور بت پرستی کی مذمت کرتے
تھے، ان کو کعبے کے معبدگاہ عام میں آنے سے روکتے، ان کو اپنے
طور پر خدا کی عبادت نہ کرنے دیتے ، ان کے ساتھ لین دین تک
موقوف کر دیا تھا اور موقع پاتے تو ان پر دست درازیاں کرتے -
اس حالت میں جو متصل گیارہ برس رہی ، پیغمبرصا صاحب کی
اپنے معتقدین کو برابر یہی تاکید تھی کہ خدا کی راہ میں دنیوی
تکلیفات کو بہ آمید فلاح عاقبت صبر کے ساتھ برداشت کرو اور
مذہب اسلام تھا کہ ان مزاحمتوں اور مصیبتوں میں اپنی صداقت
کی وجہ سے چپکے چپکے ترقی کر رہا تھا - مسلمانوں نے ان تکلیفات

سے عاجز آ کر دوبار ترک وطن بھی کیا جس کو ھجرت کہتے ھیں، پھر بھی لوگوں نے چین سے نہ بیٹھنے دیا ۔ اس اثنا میں مسلمانوں کا گروہ اتنا بڑھ گیا تھا کہ اپنی حفاظت کر سکتے تھے۔ دوسری ھجرت کے دوسرے برس بدر کی مشہور لڑائی ھوئی جس سے اسلام کے غلبے کی ابتدا ھے۔ جزیرہ عرب میں مسلمانوں کی بہت سی فتوحات ھوئیں جن میں سب سے مشہور اور حقیقت میں جس نے تمام جزیرہ عرب کو رجس بت پرستی سے پاک کر دیا ، فتح مکہ تھی ۔ میں نے تاریخ میں صدھا فتح مند بادشاھوں اور جنرلوں کا بلاد مفتوح میں داخل ھونا پڑھا ھے—آگے آگے قتل اور پیچھے پیچھے لوٹ—اور ایک فتح مند پیغمبر کا مکے میں داخل ھونا تھا جہاں کے لوگوں نے ان کے ساتھ ایذادھی اور بے حرمتی کا کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا تھا کہ آپ کعبے میں تشریف رکھتے تھے اور شہر مکہ میں امن عام کی منادی ھورھی تھی ۔

غرض یہ ھے کہ اسلام فی نفسہ ایسا عمدہ مذھب ھے کہ ھارے درجے کی مغلوبیت اور اعلیٰ مرتبے کا غلبہ دونوں حالتوں میں اُس کے پیرو صلح کاری کے ساتھ زندگی بسر کر سکتے ھیں۔ مانا کہ انگریزی عملداری میں اسلام کو غلبہ نہیں مگر وہ اس قدر مغلوب بھی نہیں جیسا ھجرت سے پہلے مکے میں تھا ؛ بدون سلطنت کے جس قدر مذھبی آزادی ممکن ھے، مسلمانوں کو انگریزی عملداری میں پوری پوری حاصل ھے بلکہ خود مسلمانوں کی عملداری میں بھی آزادی کا یہ رنگ نہیں۔ پس من حیث المذھب کوئی مسلمان کسی فرقے اور عقیدے کا کیوں نہ ھو، انگریزی عملداری کا شاکی ھو نہیں سکتا ۔ ھاں اتنا ضرور ھے کہ ھندوستان کے مسلمان ھندوؤں کی دیکھا دیکھی کھانے میں، پینے میں، پہننے میں، نشست برخاست میں چھوت بہت ماننے لگے ھیں۔ دوسرے ملکوں کے

مسلمانوں کے تنزل کا جو کچھ سبب ہو، ہندوستان کے مسلمانوں پر تو ہندوؤں کے اختلاط نے بہت ہی برا اثر کیا ہے۔ ہندوؤں میں رہ کر یہ بھی اُنھیں کی طرح شکّی، ڈرپوک، پست حوصلہ، گھر گھسنے، آرام طلب ہوگئے۔ مسلمانوں کا یہ عیب کہ انگریزوں سے پرہیز کرتے ہیں اور اس وجہ سے انگریزی عملداری کے بہت سے فائدوں سے محروم ہیں اور یوماً فیوماً مفلس اور بے وقعت ہوتے جاتے ہیں اور گورنمنٹ کو اپنی طرف سے بدظن رکھتے ہیں یعنی مسلمانوں کی اتنی ہندویت تو انشاء اللہ میں دفع کر دوں گا۔ مسلمانوں کا مذہب جدیدالعہد ہے اور ابھی اُس کی اصلیّت دوسرے مذہبوں کی طرح معدوم نہیں ہوئی، پس مجھ کو اپنی کوشش میں ہر طرح کی کامیابی کی اُمید ہے۔

میں جانتا ہوں نصیحت کا بڑا موثر پیرایہ نمونے کا دکھا دینا ہے، سو میں نے یہ باتیں منہ سے نہیں نکالیں جب تک کہ میں نے خود اُس وضع کو اختیار نہیں کر لیا جس کو میں چاہتا ہوں کہ سب مسلمان اختیار کریں۔ میں نے آپ سب صاحبوں کے ساتھ ایک میز پر کھانا کھایا اور آپ کے روبرو میں انگریزی لباس پہنے کھڑا ہوں اور میں یقیناً ویسا ہی مسلمان ہوں جیسا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ خود مسلمان جن کے مفاد کے لیے میں نے یہ وضع اختیار کی ہے، چھیڑ چھیڑ کر اور ہنس ہنس کر میری زندگی بہ تنگ کر دیں گے مگر اُن کی چھیڑ جیسی ناچیز ہوگی ویسی ہی بے ثبات بھی ہوگی۔ تقاضائے وقت اور تعلیم دو میرے بڑے مددگار ہیں اور ان کی تائید سے مجھ کو پورا بھروسا ہے کہ بہت جلد ایک گروہ میری وضع کی تقلید کرے گا۔ اب میں اپنی تقریر کو طوالت کی معذرت پر ختم کرتا ہوں۔

فصل دوازدھم

ابن الوقت کا منصوبہ اور لوگوں کی مخالفت

دنیا میں شاید قوم کی رفارم (اصلاح) سے زیادہ مشکل کوئی اور کام نہیں ہو سکتا ، سو بھی یہاں پوری پوری رفارم کا کیا مذکور ہے؛ پوری رفارم تو وہ تھی جس کا بیڑا ہمارے پیغمبرؐ صاحب نے اٹھایا تھا ، مبعوث ہوئے عرب میں جن سے بدتر اس وقت روئے زمین پر کوئی قوم نہ تھی۔ اس رفارم کے مقابلے میں کیا بے چارہ ابن الوقت اور کیا اس کی رفارم ، وہی مثل ہے کیا «پدی اور کیا پدی کا شوربا» ۔ اس کی رفارم کی اتنی ہی بساط تھی کہ اس کو آپ سوجھی اور نوبل صاحب نے بھی سجھائی کہ انگریزی عملداری میں مسلمان بگڑتے چلے جاتے ہیں ، یہ تھا ایک واقعۂ بدیہی ۔ سبب کی تفتیش کی تو معلوم ہوا انگریزی عملداری میں مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ دریا میں رہنا اور مگرمچھ سے بیر، رعیت ہو کر بادشا سے نفرت ، محکوم رہ کر حکام سے گریز۔

یہاں تک ابن الوقت کی رائے نہایت درست تھی۔ اب اس نے قومی ہمدردی اور سرکاری خیرخواہی کے تقاضے سے چاہا کہ مسلمانوں کی وحشت اور اجنبیت کو دور کر کے حاکم و محکوم میں ارتباط و اختلاط پیدا کردوں ، بس یہ ہے خلاصہ ابن الوقت کی رفارم کا ۔ اس نے سوچا کہ معاملہ ہے قوی اور ضعیف اور غالب و مغلوب میں ، قوی غالب پر تو اثر کیا ڈال سکوں گا ، 'نزلہ بر عضو ضعیف' مسلمانوں کو ترغیب دو کہ

مماثلت سے ، مشابہت سے ، انگریزی سیکھنے سے ، انگریزی تمدّن اختیار کرنے سے، غرض جس جس ڈھب سے ممکن ہو، انگریزوں کی طرف کو جھکیں ۔ ابن الوقت کے حالات مابعد سے ظاہر ہو جائے گا کہ تدبیر جو اُس نے اختیار کی غلط تھی یا صحیح اور کہاں تک اُس کو اپنے ارادے میں کامیابی ہوئی ۔

ہم اس کو ابن الوقت کی کامیابی کی تمہید سمجھتے ہیں کہ سب سے پہلے اُس نے آپ وہ طرز اختیار کر لی جس کو وہ رواج دینا چاہتا تھا ۔ اُس نے غدر کے دنوں میں نوبل صاحب کی جان بچانے سے سرکار انگریزی کی خیرخواہی کی اور سرکار نے بھی اُس خیرخواہی کا بدلہ دینے میں ایسی جلدی کی کہ برس کے اندر ہی اندر ابن الوقت جاگیر دار بھی ہو گیا ، ایک دم سے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بھی ہو گیا ۔ اب اُس نے قوم کی خیرخواہی کا دم بھرا اور رفارمر بنا تو رفارمروں کو جو انعام ہمیشہ سے ملتا آیا ہے اُس کے لیے بھی تیار تھا یعنی اگلے ہی دن سارے شہر میں غل تھا کہ ابن الوقت کرسٹان ہو گیا ، انگریزوں کے ساتھ کھانا کھایا ، اُنھیں کی طرح کپڑے پہنے ۔ افواہ کا قاعدہ ہے کہ لوگوں کے منہ بات پڑی اور ایک ایک کی چار چار ہوئیں ، کوئی یہ بھی کہ دیتا تھا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے اُن کو انگریزوں کے ساتھ گرجا میں دیکھا ، آخر نماز ہی کو گئے ہوں گے ۔

دوسرا ۔ ارے میاں تم مسلمان ہو کر کہتے ہو ، ”گئے ہوں گے“ توبہ کرو توبہ !

تیسرا ۔ کیوں جی ! پہلے سے تو ہم نے کوئی بات دیکھی کیا سنی بھی نہ تھی ، یہ ایک دم سے ہوا تو کیا ہوا ؟

دوسرا ۔ کیا خوب ؟ یک نہ شد دو شد، تم شہر میں رہتے ہو اور اتنا معلوم نہیں (آگے کو جھک کر دبی زبان سے) کہ اس نے غدر میں ایک انگریز کو چھپایا تھا ۔

تیسرا ۔ چھپایا تھا تو چھپانے دو اور بھی بہتیروں نے خیر خواہیاں کیں ، مخبر بنے ، لوگوں کے گڑے دبے مال نکلوائے ، آپ کھڑے ہو کر گواہیاں دیں ، پھانسیاں تک دلوائیں ، خیرخواہی سے اور کرسٹان ہونے سے کیا تعلق ؟

دوسرا ۔ میاں بات یہ ہے کہ دنیا کا لالچ بہت برا ہوتا ہے اور دنیا بھی ایسی کہ بس غدر تو اس شخص کو پھلا ہے : کسی بچے کی تو نکسیر تک نہیں پھوٹی ، ایک پیسے کے مال کا نقصان نہیں ہوا ، گوڑگانوے کے ضلع میں کسی بیچارے زمیندار کا کئی ہزار کا علاقہ اسی غدر کی علّت میں ضبط ہوا تھا ، وہ ملا ، ڈپٹی کی نوکری پائی ! ایک خیرخواہی میں تو اتنی ساری کرامت نہ تھی ۔

چوتھا ۔ مگر ہوا بڑا غضب ! ایسا خاندانی آدمی کرسٹان ہو جائے ، عالم فاضل ۔ اسلام کی بڑی بے عزتی ہوئی ۔

دوسرا ۔ اسلام کو خدا نے عزت دی ہے اور انشاءاللہ تا قیامت معزز رہے گا اور علم فضل کی کچھ نہ پوچھو ، شیطان معلم الملکوت تھا یعنی تمام فرشتوں کا استاد ، پھر وہ علم اس کے کیا کام آیا ؟

ھفتوں نہیں بلکہ مہینوں جہاں دیکھو ابن الوقت ہی کا چرچا تھا ۔ عوام نے تو ایک بات پکڑ بائی تھی ، « کرسٹان ہو گیا کرسٹان ہو گیا» ۔ ان کے نزدیک انگریزوں کے ساتھ کھانا بلکہ انگریزوں کی طرح میز کرسی پر چھری کانٹے سے کھانا ،

انگریزی لباس پہننا ، سب کرسٹان ہونے ہی میں داخل تھا - ہندوستانی اخبار والوں کو مضمون کہاں نصیب ، اُن کو ایک اچھا مشغلہ ہاتھ لگا - ابن الوقت نے اگر شہر کا رہنا چھوڑ نہ دیا ہوتا تو لڑکوں کا اس کے پیچھے ہُرّو پیٹ دینا بھی کچھ تعجب نہ تھا مگر شہر کے باہر چھاؤنی میں اتنی دور جاتا ہی کون تھا اور پھر انگریزوں کے ڈر کے مارے کس کی ایسی جرأت تھی مگر ہاں کچہری میں ہر روز سو پچاس آدمی اس کو انگریزی لباس پہنے ، انگریزوں کے ساتھ ٹفن* کھاتے ، چرٹ پیتے دیکھتے ہی تھے -

شامت تو اگر سچ پوچھو ابن الوقت کے گھر والوں کی تھی کہ نا حق لوگ ان کو آ آ کر چھیڑتے تھے اور یہ بے چارے ابن الوقت کے کارن مفت میں نکّو بن رہے تھے -

قاعدہ ہے کہ جب کسی قوم پر ادبار آتا ہے تو اس کے حرکات ، سکنات ، معاملات ، خیالات ، معتقدات سبھی میں روایت آ جاتی ہے ، کیا خوب کہا ہے ع ہرچہ گیرد علتی علت شود - مسلمانوں کو خدا نے کیسا تو عمدہ مذہب دیا تھا کہ اسی کی بدولت عرب کے وحشی ، اونٹوں کے چرانے والے ، اس قدر تھوڑے عرصے میں جس کی نظیر ساری دنیا کی تاریخ میں مفقود ہے ، گویا تمام روئے زمین کے بادشاہ ہو گئے - پھر وہ مذہب سہل و سلیس ہونے کے علاوہ نظر غور سے دیکھو تو اختیاری نہیں بلکہ فطری یعنی بہ عبارت دیگر اضطراری لازمۂ انسانیت کہ کسی حال میں انسان سے منفک ہو ہی نہیں سکتا - پیغمبر ص اسلام کا خاتم النبیین اور مرسل الی کافۃ الناس ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ دائرہ اسلام بہت وسیع ہے اور

---

* تیسرے پہر کا ناشتہ -

پیغمبر صاحب کو کثیرالاتباع ہونے پر ناز بھی تھا - غرض ایک مسلمان تو قرون اولی کے مسلمان تھے جن کی تمام ہمّت تکثیر گروہ مسلمانان میں مصروف تھی یا ایک مسلمان ہمارے زمانے کے مولوی ہیں کہ بات بات پر لوگوں کو کافر یعنی اسلام سے خارج ٹھہرا دیتے ہیں -

ابن الوقت تو ان کے نزدیک نرا کافر بھی نہیں بلکہ مجموعۂ کفار تھا - حنفی ، شافعی ، سنی ، شیعہ ، وہابی ، بدعتی ، مسلمانوں کے جتنے فرقے ہندوستان میں ہیں سب کے علماء نے قرآن کی آیتوں سے ، حدیثوں سے سند پکڑ پکڑ کر بالاجماع ابن الوقت کے کفر کے فتوے لکھ دیے - ایک فتویٰ تو خود ہماری نظر سے بھی گزرا ، فتویٰ کا ہے کو تھا اچھا خاصہ اقلیدس کا پہلا مقالہ معلوم ہوتا تھا ، کیوں کہ مربع ، مستطیل ، بیضوی سب شکلوں کی تو مہریں اس میں تھیں اور پھر بعضے کف دست کے برابر چوڑے چکلے طغرے ، کیسے کیسے پیچیدہ کہ ہمایوں کی بھول بھلیاں کی کیا اصل ہے ، دلّی کا فتویٰ اور دلّی ہی کے علماء کی مہریں اور پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کون کس کی مہر ہے - آخر نہ رہا گیا ، پوچھنا ہی پڑا ، کیوں صاحب یہ خادم الشریعت الغرّاء والملۃ البیضاء المحمدیہ الحافظ الحاجّ الشیخ ابوالفضائل محمد الشہیر بمعین الدین الحنفی القادری الاویسی المازندرانی ثم البخاری کون بزرگ ہیں ؟

صاحب فتویٰ - آپ نے نہیں پہچانا ! مولوی سونا جو سوچیوں کی مسجد میں جمعے کے جمعے وعظ کہا کرتے ہیں -

ہم - بارے مولوی سونا صاحب کی مہر بھی فتووں پر ہونے لگی -

صاحب فتویٰ ۔ اجی حضرت! اگر اُن کی مہر نہ کراؤ تو
وعظ میں نام لے لے کر ایسی بے نقط سناتے ہیں کہ معاذاللہ
مگر بے چارے ہیں صُلح کُل ، اختلافی مسائل میں دونوں طرف
والی مہر کرالیے جاتے ہیں، انکار نہیں ۔

ہندوستانیوں کی یہ چھیڑ چھاڑ جو اکثر گالیوں کے قریب
قریب ہوتی تھی ابن الوقت کو بری تو کیوں لگتی نہ ہوگی
مگر ظاہر میں تو اُس نے کبھی اس کا اعتناء کیا نہیں؛
ہمیشہ استکراہ کے ساتھ ایک کان سے سنا اور حقارت کے
ساتھ دوسرے کان سے نکال دیا ۔ اگر ابن الوقت ایک دم
سے کرسٹان ہو گیا ہوتا تو لوگ ایسے اُس کے پیچھے نہ
پڑتے ۔ اس کے عزیز و قریب رو دھو کر اور ساوشا بک جَھک کر
کبھی نہ کبھی چپ کرتے پر کرتے ، مگر مشکل یہ تھی کہ
ابن الوقت کا ظاہر حال بالکل انگریزوں کا سا تھا اور پھر وہ کہتا
تھا کہ میں مسلمان ہوں ، اُس کی اسی بات سے مسلمان چڑتے تھے ۔

نوبل صاحب کے ڈنر میں ملکی فوجی جتنے انگریز اس وقت
دھلی میں تھے ، سبھی تو موجود تھے ۔ سب نے ابن الوقت کو
دیکھا ، حرف بہ حرف اُس کی تقریر کو سنا ۔ چند روز بعد
ابن الوقت نے ساری چھاؤنی کو بڑا کھانا دیا ۔ اُس میں سب
تو نہیں مگر جس جس سے نوبل صاحب کو زیادہ ربط تھا ،
چار و ناچار آیا اور دو چار صاحب لوگ اور بھی آئے ۔
بے تکلّفی ہوتے ہی ہوتے ہوتی ہے ، ایسا کہیں دیکھنے میں
نہیں آیا کہ صاحب سلامت کے بعد ہی تپاک شروع ہو
جائے اور یہاں تو رکاوٹ کی بہت سی وجوہ تھیں؛ اول تو
بالکل ایک نئی بات تھی ، شروع عملداری سے آج تک ان
اطراف میں کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ کسی ہندوستانی نے

انگریزی وضع اختیار کر کے برابری کے دعوے سے انگریزی سوسائٹی میں گھسنے کا ارادہ کیا ہو۔ راجہ ، بابو ، نواب ، بڑے بڑے عہدہ دار انگریزوں سے ملنے کی سبھی کو ضرورت واقع ہوتی رہتی تھی مگر اپنے ہندوستانی قاعدے سے ملتے تھے : سر پر پگڑی ، شملہ ، عمامہ ، گلے میں قبا ، چغہ ، جاڑا ہوا تو اوپر سے شالی رومال ، اندر کمر بندھی ہوئی ، اتوار اور کچہری کا وقت بچا کر سویرے سے جا موجود ہوئے ، سواری کو احاطے کے باہر چھوڑا ، چپڑاسی سے اطلاع کرائی ، منتظر طلب برآمدے میں بیٹھے ، بلا لیے گئے ، جوتیاں دروازے کے باہر اتاریں ، سامنا ہوا ، دور سے جھک کر سلام کیا ، آہستہ سے مختصر طور پر مطلب کی دو باتیں کیں ، رخصت چاہی ، صاحب کا سامنا کتراتے ہوئے باہر نکلے ، اردلیوں ، شاگرد پیشوں کا معمول دیا اور گھر کا رستہ لیا ۔

ابن الوقت نے ملاقات کا ایک نرالا ڈھنگ نکالا کہ جب تک کوئی دوست معرفت نہ کرا دے وہ کسی انگریز سے ملتا ہی نہ تھا اور ملتا بھی تو کس طرح کہ گھوڑا ہے تو گھوڑا اور بگھی ہے تو بگھی دھر برآمدے میں ۔ اردلی دور سے گھوڑے کی ٹاپ سن کارڈ کے لیے منتظر کھڑا ہے ، چند قدم استقبال کر ، کارڈ لے ، بھاگا ہوا اندر گیا ۔ آگے آگے اردلی ، پیچھے پیچھے ابن الوقت ، بیس بسوے تو صاحب خانہ سے برآمدے میں مٹھ بھیڑ ہوئی ورنہ خیر عین کمرے کے دروازے میں اور اگر صاحب خانہ اس میں مضایقہ کریں تو ابن الوقت سوار ہو یہ جا وہ جا ۔ پھر ادب قاعدے کی تو خبر نہیں آنکھیں چار ہوتے ہی ایک ساتھ دونوں کے منہ سے نکلا

"گڈ مارننگ ، ہؤ ڈو یو ڈو"، ایک ساتھ ہاتھ بڑھائے ، مصافحہ ہوا ، دونوں اندر داخل - معلوم نہیں کیا باتیں ہوئیں مگر زور سے ہنسنے کی آواز تو برابر چلی آتی تھی -

غرض ابن الوقت نے انگریزوں کے ساتھ برتاؤ ہی اس طرح کا شروع کیا کہ اکثر انگریز اس کے ملنے سے پہلو تہی سا کرتے تھے - پھر ابن الوقت میں زبان انگریزی کی بھی کوتاہی تھی ، علاوہ بریں اس کا تعلق انگریزوں کے ساتھ بالکل جدید تھا ؛ ان وجوہ سے اس کو انگریزوں نے اپنی سوسائٹی میں لیا تو سہی مگر کشادہ دلی کے ساتھ نہیں - تاہم اس کا تعارف انگریزوں کے ساتھ آہستہ آہستہ بڑھتا چلا جاتا تھا اور ہندوستانی بھائیوں کے حسد کے مشتعل کرنے کو اتنا کافی تھا - یہی وہ مخالفت تھی جو تمام عمر ابن الوقت کو طرح طرح کی ایذائیں دیتی اور اس کے اصل مطلب میں کھنڈت کرتی رہی - انگریزوں کو رشک و حسد کی کوئی وجہ نہ تھی مگر ان میں بھی اکثر بہ زعم حکومت ابن الوقت کے سخت مخالف تھے - اس میں شک نہیں نوبل صاحب اس کے پورے طرف دار تھے ؛ وہ شریف تھے ، معزّز عہدہ دار تھے ، انگریزوں میں ان کی بڑی وقعت تھی ، ان کی کارگزاری اور لیاقت گورنمنٹ کے نزدیک مسلّم تھی اور سب سمجھتے تھے کہ ایک نہ ایک دن ان کو کوئی بڑا کام ہونے والا ہے مگر آخر تھے تو ایک متنفس ، ان کی مدد سے سردست اتنا بھی کیا کم تھا کہ تموّل اور تعزّز کے اعتبار سے ابن الوقت کو حکّام وقت سے ملنے کا حوصلہ ہوا اور انگریزوں کے ساتھ تھوڑی بہت جو کچھ معرفت ہوئی وہ بھی انھیں کی وجہ سے ہوئی - اگر نوبل صاحب کا قدم درمیان میں نہ ہوتا تو

منه سے رفارم کا نام نکالنا بھی مشکل تھا ۔

غرض به نظر ظاهر جتنے اتفاقات مساعد کا جمع هونا ممکن تھا ، سب مہیا تھے : نوبل صاحب جیسا عالی رتبه انگریز مربّی اور سرپرست ، خود ابن الوقت خیرخواه سرکار ، جاگیر دار ، اکسٹرا اسسٹنٹ ، اپنے هی شہر میں حاکم اور کام بھی بغاوت کی تحقیقات که اُن دِنوں کوئی حکومت اُس کو لگّا نہیں کھاتی تھی ، زمینداری اور نوکری ملا کر آمدنی ایسی معقول که جس کی ایک ٹانگ انگریزوں کی طرح ولایت میں پھنسی هوئی نه هو ، جس شان سے چاهے رهے ، پھر جس وضع سے رهنا چاهتا تھا باعتبار شکل و صورت اس کے قابل اور مناسب ۔ با ایں همه ابتدا سے جو مزاحمتیں پیش آنی شروع هوئیں توآخر تک بےچارے ابن الوقت کو دم نه لینے دیا ، اور سری کا هوتا تو هجوم مخالفت سے گھبرا کراس کام کو کبھی کا چھوڑ بیٹھا هوتا مگر ابن الوقت پرلے درجے کا مستقل مزاج آدمی تھا ، مشکلات کو دیکھ کر اور دلیر هوتا ؛ وه رنجیده هوتا ، افسوس کرتا ، اُس کو غصه بھی آتا مگر کبھی ایک لمحے کے لیے بھی اُس کو یه خیال نہیں هوا که جو وضع اختیار کی هے اُس کو چھوڑ دوں یا جس رفارم کا بیڑا اُٹھا چکا هوں اُس کے رواج دینے میں کوتاهی کروں ۔

شروع میں مذهبی بحث ابن الوقت کے پروگرام* سے بالکل خارج تھی مگر مسلمانوں نے چھوٹتے هی اُس سے مذهبی چھیڑ نکالی جس سے ابن الوقت کو یه خیال هوا که مذهب هی نے مسلمانوں کو بنایا اور مذهب هی اُن کو بگاڑ رها هے ؛ بے مذهب کے یه ٹکڑا تو توڑتے هی نہیں، تاوقتے که ان کے دین کی اصلاح نه هو دنیاوی فلاح هر گز نہیں هو سکتی ۔ یه سمجھ کر اُس نے به مجبوری مسائل دین میں دست اندازی شروع کی ۔ یه بحث اگر اسی حد تک رهتی

*منصوبه ۔

جہاں تک ابن الوقت کو اپنی رفارم میں اس کی ضرورت تھی تو چنداں حرج نہ تھا مگر بحث کا نام آیا اور طرفین سے کٹھ حجّتی شروع ہوئی ۔ ہمارے ہندوستان ہی میں کُوڑیوں مذہب ہیں اور ہمیشہ ایک دوسرے کا رد کرتے رہتے ہیں۔ ہم نے تو دیکھا کیسا سنا بھی نہیں کہ کوئی مذہب مناظرے میں مغلوب ہو کر معدوم ہو گیا ہو بلکہ اختلاف مذاہب ہے کہ یوماً فیوماً بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یوں تو سنتے تھے؛ کہ مسلمانوں میں ستّر دو بہتّر فرقے ہوں گے مگر ہندوستان میں سنّی، شیعہ ، حنفی ، شافعی، صوفی گنتی کے چند فرقے دکھائی دیتے تھے۔ اب ہمارے دیکھتے دیکھتے ایک سنیوں میں وہابی ،بدعتی ، مقلّد ، غیر مقلّد ، دوالّین ، ذوالّین کتنے سارے نئے نکل کھڑے ہوئے اور یہ آفت اختلاف نہ صرف ہندوستان میں ہے اورنہ فقط مذہب میں بلکہ ہر ملک میں اور ہر بات میں۔

الغرض مذہب کے اعتبار سے ابن الوقت نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی جُدی مسجد بنا کھڑی کی ۔ انگریزی تعلیم آزادی کے خیالات دلوں میں پیدا کر چکی تھی اور مطلق العنانی کی دُھن نے ہزارہا آدمیوں کو بے چین کر رکھا تھا اور دلوں کی بھڑاس نکالنے کے لیے موقع تاک رہے تھے۔ ایسے لوگوں نے ابن الوقت کی آڑ کو بس غنیمت سمجھا اور نئے طور کے مسلمانوں کا گروہ بہت جلد کثیرالانفار ہو گیا جیسے حشرات الارض کہ برسات کا چھینٹا پڑا اور لگے رینگنے۔ اگر تبدیل وضع اور ترمیم عقائد کے ساتھ موجبات ترغیب بھی ہوں تو ہم لوگوں میں کچھ ایسی بھیڑیاچال ہے کہ آدھے سے زیادہ مسلمان نیا طریق اختیار کر لیتے مگر ادھر تو بھائی بندوں نے لتاڑا آدھر انگریزوں نے بے رخی کی اور تبدیل حالت کسی کو سزاوار نہ ہوئی تو ان لوگوں کی وہی مثل ہو گئی «ازیں سو راندہ وزاں سو درماندہ» یعنی پیدا ہوتے ہی کچھ ایسی اوس پڑی کہ ٹھٹھر کر رہ گئے ۔

فصل سیزدھم

انگریزی وضع کے ساتھ اسلام کا نبھنا مشکل ھے

مذھب نام ھے انسان کے خاص طرح کے دلی خیالات کا اور اس لفافے کو خدا نے ایسی مضبوطی کے ساتھ بند کیا ھے کہ ایک کے ضمائر پر دوسرا شخص کسی ڈھب سے مطلع ھو ھی نہیں سکتا ۔ علاوہ بریں مذھب ایک معاملہ ھے بندے میں اور خدا میں اور کسی شخص کو یہ حق نہیں اور ضرورت بھی نہیں کہ دوسروں کے مذھبی معاملات میں دخل دے۔ ان اصول کی بنا پر ھم کو ابن الوقت کے مذھب سے متعرّض ھونے کی کوئی وجہ نہ تھی مگر از بس کہ وہ مسلمانوں کی دنیا و دین دونوں کی اصلاح کا مدّعی تھا ھم کو چار و نا چار دیکھنا پڑا کہ اس کے مذھبی خیالات کیا تھے ۔ ھم ان لوگوں سے سنی ھوئی کہتے ھیں جس کو ابن الوقت کے ساتھ رات دن کی نشست برخواست ، ھمسایگی اور قرابت قریبہ کے تعلّقات تھے کہ اٹھارہ بیس برس کی عمر تک ابن الوقت کا یہ رنگ رھا کہ جیسے بڑے عابد متشرّع مسلمان ھوتے ھیں: وہ نوافل اور مستحبّات کا اس قدر اھتمام رکھتا تھا کہ ایسا اھتمام فرض واجب کا خدا ھم کو نصیب کرے، پانچوں وقت جامع مسجد کی اوّل جماعت کی تکبیر تحریمہ ناغہ نہیں ھونے پاتی تھی اور تہجّد اور اشراق کے علاوہ تحیتہ المسجد ، صلوات التسبیح منزل فیل، دلائل الخیرات ، حزب البحر اور خدا جانے اور کتنے اور وظائف ؛ جمعے کے دن کبھی اس کے گھر جانے کا اتفاق ھوا ھے تو پہر دن چڑھے سے نماز جمعہ کی تیاری ھو رھی ھے، ایّام بیض

کے روزے داخل معمولات تھے، پھر مدت تک ترک حیوانات اور چلہ کشی وغیرہ مذہبی ریاضتوں کی زحمت آٹھاتا رہا۔ آنھیں دنوں لوگ خیال کرتے تھے کہ شاید وہ شاہ حقانی صاحب سے بیعت کرنے والا ھے۔

پھر ایک زمانے میں آس کو ہندو جوگیوں اور سنیاسیوں کی طرف میلان رہا، پھر جو سنبھلا تو اہل حدیث میں جا شامل ہوا جن کو لوگ تعنّتاً وہابی کہتے ہیں۔ غدر سے چند روز پہلے وہ پادریوں کا ایسا گرویدہ تھا کہ بس کچھ پوچھو ھی نہیں - نوبل صاحب کی صحبت میں آس کے مذہبی خیالات نے دوسرا رنگ پکڑا، یہاں تک کہ انگریزوں میں جا ملا۔

اس سے تو انکار ہو ھی نہیں سکتا کہ آس کے مذہبی خیالات میں ایک طرح کا تزلزل ضرور تھا مگر تبدیل وضع تک ضروریات دین میں آس سے کمی سرزد نہیں ہوئی بلکہ تبدیل وضع کے بعد بھی لوگوں نے آس کو مسجد میں جماعت سے تو نہیں، بارھا اکیلے نماز پڑھتے دیکھا ؛ یہاں تک کہ شروع شروع جن دنوں آس کو نماز روزے کی بہت پرچول تھی، کچہری کے عملے، ہندو مسلمان، سب قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ کیسے کام میں مصروف ہوں، اویر سویر کی تو کبھی نہیں جاتی مگر نماز ابھی تک تو چھوڑی نہیں، ہم تو ہر روز پرائیوٹ روم میں ظہر کی بلکہ جس دن دیر تک کچہری رہتی ھے عصر کی بھی نماز پڑھتے دیکھتے ہیں۔

لیکن انگریزی وضع کے ساتھ نماز و روزے کا نبھنا ذرا تھا مشکل ؛ کوٹ تو خیر آتار الگ کھونٹی پر لٹکا دیا، کم بخت پتلون کی بڑی مصیبت تھی کہ کسی طرح بیٹھنے کا حکم ھی نہیں،

اُتارنا اور پھر پہننا بھی دقّت سے خالی نہ تھا ، اس سے کہیں زیادہ دقّت طہارت کی تھی جو نماز کی شرط ضروری ہے۔ پھر اکثر اتفاق پیش آ جاتا تھا کہ ابن الوقت اپنے پرائیوٹ روم میں نماز پڑھ رہا ہے اور کوئی صاحب اُس کی کچہری میں آ نکلے اور اجلاس خالی دیکھ کر واپس چلے گئے یا نماز کا وقت ہے اور انگریزوں نے آ گھیرا ہے ، اُن کو چھوڑ کر جا نہیں سکتے یا کوئی صاحب کچہری برخاست کرکے جانے لگا تو ابن الوقت کے پاس سے ہو کر نکلا ''کیوں مسٹر ابن الوقت ہوا خوری کو چلتے ہو یا چلو ذرا انٹا کھیلیں'' - یہ اور اس طرح کے دوسرے اتفاقات ہر روز پیش آتے تھے اور نماز کا التزام ممکن نہ تھا کہ باقی رہ سکے - ایک بڑی قباحت یہ تھی کہ اکثر انگریز مطلق پابندی مذہب کو حُمق اور سخافت سمجھتے تھے - غرض نماز پر تو انگریزی سوسائٹی کا اثر یہ دیکھا کہ پہلے وقت سے بے وقت ہوئی ، پھر نوافل ، پھر سنن جا کر نرے فرض رہے ، وہ بھی پانچوں وقت پہلی رکعت میں سورۂ عصر تو دوسری میں سورۂ کوثر ، پھر جمع بین العصرین والمغربین شروع ہوا ، پھر قضائے فائتہ پھر بالکل چٹ -

کھانے پینے میں احتیاط کے باقی رہنے کا کوئی محل ہی نہ تھا - ابن الوقت کو انگریزوں کے پرچانے کی پڑی تھی اور وہ بے شراب کے پرچ نہیں سکتے تھے - ابن الوقت نے کون سی بات اُٹھا رکھی تھی کہ وہ شراب خوری کے الزام سے ڈرتا مگر ہم کو تحقیق معلوم ہے کہ وہ شراب سے نہ بہ پاس مذہب اسلام محترز تھا بلکہ اس وجہ سے کہ ڈاکٹر نے اُس کو ڈرایا تھا کہ اگر تم شراب پیوگے تو کوڑھی ہو

جاؤ گے - اس پر بھی بہت سے انگریزی کھانے ہیں کہ شراب اُن کے مسالے میں داخل ہے ؛ بہتیری دوائیں ہیں کہ بدوں شراب کے نہیں بن سکتیں بلکہ ان لوگوں کی طب میں شراب خود دوا ہے - کثیرالاستعمال انگریزی تمدّن اختیار کرنا اور شراب سے پرہیز رکھنا ایسا ہے کہ کوئی شخص کوئلوں کی دوکان میں رہے اور منہ کالا نہ کرے - رہے انگریزی سوسائٹی کے بڑے معزز ممبر کتّے، کیوں کر ممکن تھا کہ جاں نثار جو ابن الوقت کی تبدیل وضع میں مشاطہ کا کام دے رہا تھا، انگریزیت کی شرط ضروری کو بھول جاتا - اُس نے پہلے ہی سے ابن الوقت کے لیے کئی قسم کے کتّے بہم پہنچا رکھے تھے، ان میں بعض ایسے بھی تھے کہ ہر وقت ہم زاد کی طرح ابن الوقت کے ساتھ لگے رہتے تھے -

غرض تبدیل وضع سے ایک ہی مہینے کے اندر اندر ظاہر اسلام کا کوئی اثر ابن الوقت اور اُس کے متعلقات میں باقی نہ تھا - اگر کوئی انجان آدمی ابن الوقت کی کوٹھی میں جا کھڑا ہوتا، ہر گز نہ پہچان سکتا کہ اس میں کوئی انگریز رہتا ہے یا ہندوستانی، بھلا آدمی جس کو انگریزی کے خبط نے گھر سے، خاندان سے، ابنائے جنس سے، شہر سے، چھڑا کر تن تنہا جنگل میں لا کر ڈال دیا ہے - کسی انسان سے کسی طرح کی غلطی ہونا کچھ تعجب کی بات نہیں مگر یہ کہ خدا نے اُس کو معصوم پیدا کیا ہو - ابن الوقت سے بھی ایک غلطی ہوئی کہ اُس نے تبدیل وضع کو مفید سمجھا یہاں تک اُس کی غلطی سے اُس کے یا کسی دوسرے کے حق میں کوئی بڑی قباحت پیدا نہیں ہو سکتی تھی مگر آدمی تھا ذہین، کم بخت لگا اپنے افعال کے جواز و استحسان کی تاویلیں گھڑنے -

اول تو اصرار خلقتاً اس کے مزاج میں داخل تھا ، دوسرے مسلمانوں نے جو اُس کی تمام حرکات و سکنات کو ارتداد کہنا شروع کیا اس سے اُس کی ضد اور بھی بڑھتی گئی اور مسلمانوں کو تو خیر اُس سے کوئی فائدہ پہنچا ہو یا نہ مگر باب تاویل مفتوح کرکے اُس نے مذہب اسلام میں تو بڑا بھاری رخنہ ڈال دیا ۔ انگریزی تعلیم کی گھُوس عمارت مذہب کے پیچھے ایسی پنجے جھاڑ کر پڑی ہے کہ کھود کھود کر سارے مذہبوں کی جڑیں کھوکھلی کر دیں حتّٰی کہ عیسائیت کی بھی ۔ اسلام کے حصے کی یہ دیمک اَور نکل پڑی ؛ قید مذہب سے طبیعتیں تھیں ملول اُونگتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ملا، کیا کریں، دل تو ہمارا بھی للچاتا ھے کہ چلیں ابن الوقت کے ھاتھ پر بیعت کر لیں ، اوامر ونواھی کی کشمکش سے نجات ملے مگر کانشنس* بھی چین لینے دے ۔

ابن الوقت اور اُس کے سارے اتباع یا یوں کہو کہ جو اُس کے ہم خیال تھے عقل کے کھونٹے کے بل بر کودتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ انگریزی خوان جو نری ٹوٹی بھوٹی انگریزی پڑھ لینے سے اپنے تئیں بڑا دانشمند سمجھنے لگے تھے جلد اُس کے مغالطے میں آجاتے تھے ۔

* نفس لوّامہ ۔

فصل چہاردہم

مذہب اور عقل

ہم کو تو اس کتاب میں ان لوگوں کے ساتھ مناظرہ کرنا منظور نہیں مگر تاہم اتنا تو خواہی نہ خواہی کہنا ہی پڑتا ہے کہ بلاشبہ مبدأ فیاض نے انسان کو ظاہری باطنی جتنی قوتیں دی ہیں سب میں عقل بڑی زبردست ہے اور وہی مدار تکلیف شرع بھی ہے لیکن بیش بریں نیست کہ عقل بھی ایک قوت ہے اور جس طرح انسان کی دوسری قوتیں محدود اور ناقص ہیں، مثلاً آنکھ کہ ایک خاص فاصلے پر دیکھ سکتی ہے اُس سے باہر نہیں، پھر بے روشنی کے کام نہیں دیتی، اجسام کثیف میں نفوذ نہیں کرتی، اگر دیکھنے والا خود متحرّک ہو مثلاً فرض کرو کہ کشتی یا ریل میں ہو تو وہ اُلٹا ٹھہری ہوئی چیزوں کو متحرّک دیکھتا ہے اور اپنے تئیں ٹھہرا ہوا، تیز حرکت متشکل معلوم ہوتی ہے جیسے لڑکے لکٹی سے کھیلتے ہیں، پیالے میں تھوڑا سا پانی بھر کر لکڑی کھڑی کریں تو لچکی ہوئی دکھائی دے گی، شفاف پانی کی تہ کی چیزیں اُوپر کو اُبھری ہوئی نظر آتی ہیں اور اس طرح کی اور بہت سی غلطیاں نظر سے ہوتی ہیں جن کی تفصیل علم مناظر میں موجود ہے؛ غرض جس طرح مثلاً ہماری قوت باصرہ محدود اور ناقص ہے اسی طرح عقل کی رسائی کی بھی ایک حد ہے، وہ بھی نقصان سے بری نہیں اور اس سے بھی غلطیاں ہوتی ہیں۔ غلطی کے لیے تو اختلاف رائے کی دلیل کافی ہے۔ ہندسہ کے علاوہ جس کے اُصول بدیہات پر مبنی ہیں اور اسی وجہ سے اس میں اختلاف ہو نہیں سکتا ڈاکٹر، فلسفی، جج، ایسٹرانومرز (ہیئت داں)

پالٹیشینز (مدبّران ملک)، اهل مذاهب وغیره وغیره سبهی کو دیکھتے هیں که ایک دوسرے سے لڑتے مرتے هیں۔ منطق کے قاعدے منضبط هوئے، مناظرے کے اصول ٹھہرائے گئے مگر اختلاف نه کم هوا اور نه تاقیامت کم هو۔ «ولا یزالون مختلفین الّا من رحم ربک و لذالک خلقهم»*۔

جب هست ونیست کا اختلاف هو تو ضرور ایک بر سر غلط هے۔ اگرچه عقل انسانی کا نقصان اختلاف رائے سے بھی مستنبط هو سکتا هے مگر هم ذرا اس کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاهتے هیں۔ دو ڈھائی سو برس کے عرصے میں اهل یوروپ کو سینکڑوں باتیں ایسی دریافت هوئیں که کسی کو کیمیا کا حکمی نسخه مل گیا هوتا اور وہ اُس کو عام بھی کر دیتا تو اتنا فائدہ نه پهنچتا جتنا که ان ماڈرن ڈسکوریز یعنی زمانۂ حال کی دریافتوں سے هوا اور جن اقبال مندوں کو خدا نے واقعات اور موجودات نفس الامری میں غوروخوض کرنے کی دُھن لگا دی هے خدا اُن کی کوششوں کو مشکور وکامیاب کرتا هے، بحر بے پایاں موجودات میں غوطے لگا رهے هیں اور معلومات جدید کے بے بہا موتی هیں که برابر نکلے چلے آتے هیں، «وانّ من شئی الّا عندنا خزائنه وما ننزّله الّا بقدر معلوم»†۔ ان ماڈرن ڈسکوریز میں سے زیادہ نہیں صرف ایک چیز عام فہم لو جس سے انگریزوں کے طفیل میں هم بھی فائدہ اُٹھا رهے هیں، ریل۔ اب هم پوچھتے هیں که دنیا میں گھر گھر آگ تھی، گھر گھر هنڈیاں پکتی تھیں، هر هر متنفس بھاپ سے بخوبی واقف تھا، سینکڑوں هزاروں برس پہلے سیٹم (بھاپ) کی طاقت کیوں معلوم نہیں هوئی اور

---

* همیشه اختلاف کرتے رهیں گے مگر جس پر خدا رحم کرے اور اسی لیے ان کو پیدا کیا هے۔

† همارے پاس هرچیز کے خزانے موجود هیں مگر هم ایک اندازے کے ساتھ اس کو اتارتے هیں۔

یہی سوال ہر ڈسکوری کی بابت ہو سکتا ہے جو اب تک ہوئی یا آئندہ کسی وقت میں ہو۔ سر اسحاق نیوٹن جس کو سب سے پہلے مسئلۂ کشش کا الہام ہوا، کہتا تھا کہ خدا کی بے انتہا قدرت کے سمندر میں بے شمار موتی بھرے پڑے ہیں اور میں تو ابھی کنارے پر بیٹھا ہوا بچوں کی طرح سیپیاں اور گھونگے جمع کر رہا ہوں۔ یہ مقولہ تھا اُس شخص کا جس نے زمین اور آسمان کے قلابے ملا کر نظام بطلیموس کی جگہ اپنا نظام قائم کیا اور آج سارا یوروپ اُس کے نام پر فخر کرتا ہے۔

جن کو خدا نے عقل دی ہے وہ تو یوں اپنی نارسائی کا اعتراف کرتے ہیں اور ایک ہمارے زمانے کے انگریزی خواں ہیں کہ سیدھی سی اوقلیدس کی نئی شکل پوچھو تو بغلیں جھانکنے لگیں اور لن ترانیاں یہ کہ «ہمچو ما دیگرے نیست»۔ پس جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جاتا ہے عقل انسانی کا قصور ہے کہ کھلتا چلا جاتا ہے۔ اب سے زیادہ نہیں صرف ڈیڑھ سو برس پہلے کسی کی عقل میں یہ بات آسکتی تھی کہ مہینوں کی مسافت ہم گھنٹوں میں طے کرسکیں گے یا ہزارہا کوس کا حال چند لمحے میں معلوم کر لیا کریں گے یا آگ سے برف جمائیں گے یا کپڑے کی کل میں کپاس بھر کر اچھے خاصے دھلے دھلائے تہ کئے ہوئے تھان نکال لیا کریں گے اور ابھی کیا معلوم کہ ہم کیا کیا کر سکیں گے مگر پھر بھی رہیں گے آدمی، عاجز، ناچیز، بے حقیقت۔

بھلا آدمی کیا عقل پر ناز کرے گا جب کہ اُس کو پاس کے پاس اتنا تو معلوم ہی نہیں کہ روح کیا چیز ہے اور اُس کو جسم کے ساتھ کس طرح کا تعلق ہے۔ وقت کے ازلی ابدی ہونے پر خیال کرتے ہیں تو انسان کی ہستی ایسی بے ثبات دکھائی دیتی ہے جیسے دن رات میں ایک

«طُرفۃ العین» بلکہ اس سے بھی کم اور اس ہستی پر انسان کے یہ ارادے اور یہ حوصلے کہ گویا زمین اور آسمان میں سمانا نہیں چاہتا ۔ پھر کیسے کیسے لوگ ہو گزرے ہیں کہ اس سرے سے اُس سرے تک ساری زمین کو ہلا مارا اور مر گئے تو کچھ بھی نہیں ، ایک تودۂ خاک! آخر وہ کیا چیز تھی جو اُن میں سے نکل گئی ۔ حیوانات ، نباتات ، لاکھوں قسم کی مخلوقات کا ایک چکّر سا بندھا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ زمین سے پیدا ہوتے اور پھر اسی میں فنا ہو جاتے ہیں ۔ کسی کی عقل کام کرتی ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور کس غرض سے ہو رہا ہے ؟

جان تو ایک قسم کی نباتات میں بھی ہے مگر جانوروں کے بہت سے افعال انسان سے ملتے ہوئے ہیں بلکہ بعض حیوانات بعض باتوں میں انسان پر بھی شرف رکھتے ہیں مگر ہم دیکھتے ہیں تو اُن کے تمام کمالات وہبی اور فطری ہیں ، پھر وہ کون سی تکمیل ہے جس کے لیے اُن کو یہ ہستی دی گئی ہے ۔ انگریزوں نے تحقیقات کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا مگر شروع سے اب تک کسی ایک جگہ یا کسی ایک چیز یا کسی ایک بات کا مسلسل پتہ نہ چل سکا ۔ زمانۂ حال سے جس قدر پیچھے کو دور ہوتے جاتے ہیں منظر تاریخ دھندلا ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ اَب سے چار پانچ ہزار برس پہلے کا کسی کو کچھ حال ہی معلوم نہیں کہ دنیا کا کیا رنگ تھا ۔

عقل انسانی کی نارسائی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گی کہ آج تک کسی پر کسی چیز کی ماہیّت ہی منکشف نہیں ہوئی؛ جانا تو کیا جانا «اعراض» وہ بھی شاید فی صد دو مثلاً پانی کہ ہم اُس کا اتنا ہی حال جانتے ہیں کہ سیّال ہے، سہل الانقیاد

ہے یعنی جو شکل چاہو آسانی کے ساتھ قبول کر لیتا ہے ، آمیزش سے پاک ہو تو شفاف ہے ، نشیب کی طرف بہتا ہے ، وزن مخصوص کے قاعدے سے ۳۳ فٹ سے زیادہ ہوا میں بلند نہیں ہو سکتا ، حرارت کے اثر سے ہوا بن جاتا ہے یا اگر علم طبعی کے کسی ماہر سے پوچھو تو شاید دو چار خواص اور بیان کر سکے گا مگر یہ سب آثار ہیں نہ ماہیّت ؛ ماہیّت کا نام آیا اور عقل گم ہوئی اگرچہ ابن الوقت یا ہمارے زمانے کے بڑے سے بڑے انگریزی خواں ہی کیوں نہ ہوں ۔

بات کیا ہے کہ دنیا ہے عالم اسباب ، یہاں واقعات کا ایک سلسلہ ہے کہ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا واقع ہوتا رہتا ہے ۔ ہم واقعۂ متقدّم کو سبب اور علّت کہتے ہیں اور واقعۂ متاخّر کو مسبّب ، معلول ، نتیجہ ۔ اگرچہ سبب کے قرار دینے میں اکثر چند در چند غلطیاں ہوتی ہیں مگر فرض کرو کہ ہم سبب کے قرار دینے میں غلطی نہ بھی کریں تاہم سبب اور مسبّب میں جو علاقہ ہے آج تک اُس کا راز کسی پر نہیں کھلا مثلاً جلانا آگ کا خاصّہ ہے ، مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے ، مگر کوئی نہیں بتا سکتا کیوں ؟ ذرا آسمان کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھو تو روئے زمین کے سارے ریگستانوں میں اتنے ذرّے نہ ہوں گے جتنے ستارے آسمان میں بھرے پڑے ہیں ؛ پھر یہ ستارے دیکھنے میں چھوٹے چھوٹے نقطے سے نظر آتے ہیں اور در حقیقت ایک ایک بجائے خود ایک جہان ہے کہ ہماری زمین کی اُس کے سامنے کچھ بھی حقیقت نہیں ۔ غرض

سوچنے سمجھنے والے کو دنیا سرتاسر طلسم حیرت ہے۔

جب دنیاوی امور میں عقل انسانی کی نارسائی کا یہ حال ہو کہ کسی بات کی کُنہ کو نہیں پہنچ سکتی تو دین میں وہ کیا ہماری راہ بری کرے گی۔

؎ تو کار زمیں را نکو ساختی که با آسمان نیز پر داختی

یہ دنیا تو پھر بھی عالم شہود ہے کہ ہم اس میں موجود ہیں اور اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور تھوڑا یا بہت اس میں تصرّف بھی کر سکتے اور کرتے ہیں۔ دین خبر دیتا ہے کہ اس دنیا کے سوائے ایک جہان اور ہے، یہ ظاہر ہے وہ غائب، یہ فانی ہے وہ باقی، یہ مجاز ہے وہ حقیقت، یہ تمہید ہے وہ نفس مطلب، یہ امتحان ہے وہ نتیجہ، یہ سفر ہے وہ منزل مقصود، یہ خواب ہے وہ تعبیر، یہ افسانہ ہے وہ حق الامر۔ ظاہر ہے کہ عقل انسانی کو اُس جہان کے متعلق کچھ بھی نہیں جاننا چاہیے کیوں کہ وہ اُس کی منتہائے رسائی سے بہت دور پرے ہے لیکن خدا کی بے انتہا مہربانی سے بعید تھا کہ انسان جو اُس کی مخلوقات میں سب سے افضل ہے اُس جہان سے بالکل بے خبر رہے اور جس طرح اُس نے اور چیزوں کو دوسرے خواص بخشے ہیں عقل انسانی کو نیک و بد کی تمیز عطا فرمائی کہ جاہل سے جاہل اور وحشی سے وحشی بھی بھلائی کی طرف راغب ہے نہ کسی دنیاوی مفاد کی طمع سے اور برائی سے ہارب ہے نہ کسی دنیاوی نقصان کے خوف سے بلکہ گویا انسان کا دل مقناطیسی سوئی ہے اور نیکی شمال کی سمت۔ بس اُس جہان کے متعلق رسائی، معلومات، واقفیت جو کچھ سمجھو یہ

انسانی فطرت ہے کہ آدمی بالطبع نیکی کو پسند اور بدی کو ناپسند کرتا ہے۔ پھر انسان کی عقل اپنی طرف سے کچھ کمی نہیں کرتی، بہیترا زور مارتی ہے کہ وہاں کی حقیقت دریافت کروں، مگر کچھ پتہ نہیں چلتا

حال عدم نہ کچھ کھلا گزرے ہے رفتگاں پہ کیا
کوئی حقیقت آں کی کہتا نہیں بری بھلی

نیکی بدی کی امتیاز کے ساتھ اس کو اتنی بات اور بھی سوجھتی ہے کہ انسان کے ہر ایک فعل کو ایک نتیجہ لازم ہے؛ اگرچہ بسا اوقات بعض افعال کے نتائج اسی دنیا میں واقع ہو جاتے ہیں مگر بعض کے نہیں بھی ہوتے اور ہم دیکھتے ہیں کہ دنیاوی نتائج کے علاوہ طبیعتیں کسی اور نتیجے کی بھی منتظر رہتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک جہان اور ہونا چاہیے اور اس کی ضرورت ہے اور نہیں معلوم کیا سبب ہے کہ دل خود بخود اندر سے گواہی دیتا ہے کہ مرنے سے تو ہمارا پیچھا چھوٹتا ہوا نظر نہیں آتا، مرے پیچھے ہم کسی حالت میں رہیں مگر رہیں گے ضرور۔ بس یہاں تک عقل کی پرواز تمام ہوئی۔

اگر یک سر موئے برتر برم فروغ تجلی بسوزد پرم۔

مگر اس سے تو کچھ بھی کشود کار نہ ہوا۔ دل جو اس جہان کے تفصیلی حالات کے مشتاق تھے بدستور جویا کے جویا رہے۔ اب دین کی سرحد میں آگے بڑھنا چاہتے ہو تو چراغ عقل گل کرو اور آفتاب جہان تاب وحی کو اپنا ہادی اور راہ نما قرار دو۔

اس بیان سے اگرچہ مختصر ہے، معلوم ہوجائے گا کہ امور دین میں عقل انسانی کو کہاں تک مدخل ہو سکتا ہے۔ ابن الوقت نے کچھ یہ تھوڑی غلطی نہیں کی کہ مذہب کو محکوم عقل

بنانا چاہا پس اُس کے مذہبی رفارم کی بسم اللہ ہی غلط تھی اور اُس کو نہ صرف اسلام سے اختلاف تھا بلکہ دنیا کے تمام مذاہب سے۔ یہ سچ ہے کہ انسان اپنی تمام قوتوں کے استعمال میں مجبور ہے اور نہیں ہو سکتا کہ وہ عقل رکھتا ہو اور اُس سے کام نہ لے مگر ہمارا مطلب یہ ہے کہ جسمانی یا عقلی جتنی قوتیں ہیں سب کے استعمال میں اعتدال شرط ہے اور علم اخلاق کا ماحصل بھی یہی ہے اگر کوئی شخص عقل کو مذہب کی کسوٹی بنانا چاہے تو اُس کو اس ارادے میں ویسی ہی کامیابی کی توقع رکھنی چاہیے جیسی کہ وہ شخص رکھ سکتا ہے جو باصرہ سے سامعہ کا یا شامہ سے ذائقہ کا کام لینے کا قصد کرے۔ دین کی دولت طبیعت کی چالاکی ، عقل کی تیزی اور ذہن کی رسائی سے ہاتھ آنے والی چیز نہیں، اُس کے مستحق ہیں بھولے بھالے سیدھے سادے (اھل الجنتہ بُلہ)، منکسر، منقاد، افسردہ ، متواضع، خاکسار۔ ایک بڑا خطریہ ہے کہ جو شخص دین کی باتوں میں عقل کو بہت دخل دیا کرتا ہے، شروع کرتا ہے جزئیات سے ، فروع سے ، متشابہات سے اور آخر کو جا پہنچتا ہے کلّیات میں ، اصول میں، محکمات میں جیسا کہ ابن الوقت کو پیش آیا۔ پس جس شخص کی افتاد مزاج اس طرح کی ہو اُس کو شروع سے احتیاط کرنی ضرور ہے؛ چاہیے کہ ایسے خدشات کو دور کر کے خدائے تعالی جلّ شانہ کی عظمت، اس کی قدرت، اُس کے جلال، دنیا کے انتظام، اس کے انقلابات اور کون و فساد میں فکر کیا کرے، اُمید ہے کہ اس کی طبیعت سنبھل جائے گی۔

فصل پانزدھم

ابن الوقت سے لوگوں کی عام نارضامندی

پھر ہم یہی کہیں گے کہ اگرچہ لوگوں نے ابتدا کی تھی مگر ابن الوقت کو مذہبی چھیڑ چھاڑ کرنی مناسب نہ تھی۔ اس چھیڑ چھاڑ نے اُس کی رفارم میں بڑی ہی کھنڈت کی؛ اختلاف معتقدات کی وجہ سے یوماً فیوماً مسلمان اُس سے متنفّر ہوتے گئے اور سچ پوچھو تو ابن الوقت نہ رفارمر رہا نہ مجدّد بلکہ مسلمانوں میں ایک نئے عقیدے کا مُوجد سمجھا جانے لگا اور ظاھر ھے کہ ایسی حالت میں وہ مسلمانوں کو زیادہ فائدہ نہیں پہنچا سکتا تھا کیوں کہ وہ کہتا تھا صبح تو مسلمان کہتے تھے شام اور اُس کی طرف سے مسلمانوں کے دل میں کچھ ایسی بدگمانی بیٹھ گئی تھی کہ اُس کی ساری تدبیریں خودغرضی پر محمول کی جاتی تھیں۔ کچھ رفارم پر موقوف نہیں، ھر نئی بات کا قاعدہ ھے کہ شروع شروع میں اگرچل نکلی تو چل نکلی، ورنہ اکھڑے پیچھے ھوا کا بندھنا بہت مشکل ھوتا ھے۔

ابن الوقت کو شروع سے آخر تک موافق و نا موافق دونوں طرح کے اتفاقات پیش آتے رھے بلکہ ناموافق زیادہ؛ تاھم اُس کے شروع کے دو برس بڑی کامیابی کے برس تھے کیونکہ نوبل صاحب اُس کے حامی و سرپرست اُس کے پاس موجود تھے۔ اُن کی مہربانی اس کے حال پر یوماً فیوماً زیادہ ھوتی جاتی تھی اور اُن کی مرّبیانہ مدارات دیکھ کر کیا انگریز، کیا ھندوستانی، کسی کو ابن الوقت کے ساتھ پرخاش کرنے کی جرات نہ ھوتی تھی۔ غدر کے بارے میں ابن الوقت اور نوبل صاحب دونوں کے خیالات پہلے ھی سے

منصفانہ تھے اور اُس وقت انصاف ھی کو لوگ بڑا رحم سمجھتے تھے ۔ غرض بغاوت کی تحقیقات میں بھی ابن الوقت کی اچھی نیک نامی ھوئی اور چوں کہ نوبل صاحب کو پرداخت منظور تھی ابن الوقت کی لیاقت اور کار گزاری نے خاصی نمود پکڑی اور حکّام بالادست اُس کو صائب الرائے، کثیر المعلومات ، بے تعصب ، منصف مزاج سمجھنے لگے ۔ اکثر ایسا ھوتا تھا کہ نوبل صاحب سے کسی بارے میں رائے طلب ھوتی تو اُس میں ایما کیا جاتا کہ اپنے اسسٹنٹ ابن الوقت سے بھی پوچھو کہ وہ کیا کہتے ھیں ۔ یہاں نوبل صاحب کا یہ حال تھا کہ بات بات میں ابن الوقت کی رائے سے استشہاد کرتے تھے ؛ ان کی ھر چٹھی میں یہ فقرہ ضرور ھوتا تھا کہ میرے اسسٹنٹ ابن الوقت بھی اس رائے سے متفّق ھیں یا ان کو اختلاف ھے اور اُن کی تحریر کو لحاظ مناسب کے لیے منسلک کرتا ھوں ۔ یہ سب کچھ ھورھا تھا لیکن حسد کی آگ بھی دلوں میں بھڑک رھی تھی اور لوگ وقت کے منتظر تھے ؛ یوں اپنی جگہ تو ھر شخص جو جس کے منہ میں آیا بک جھک لیتا تھا ، ابن الوقت نے کبھی کسی کے کہنے کی پروا نہیں کی مگر حاکموں کے روبرو جو لوگ جاکر اُلٹی سیدھی باتیں بنا آتے تھے اُن سے ابن الوقت کو اور اُس کے منصوبوں کو بہت بڑا نقصان پہنچتا تھا ۔

غدر کے مدّتوں بعد تک سرکاری کچہریوں میں کام کی یہ کثرت رھی کہ باوجودیکہ تحقیقات بغاوت کا محکمہ علاحدہ تھا ؛ اس پر بھی ، مسلمانوں کا تو اُس وقت کہاں پتہ کیوں کہ یہ تھے معتوب ، ھندو بنگالی بابو اور یوریشین ملا کر ایک دم سے پانچ ڈپٹی کلکٹر تھے ۔ اول تو اُن دنوں

کی قہرمانی حکومت ، بغاوت کی تحقیقات در پیش ، ہتیاروں
کی تنگ طلبی ، مخبری کا بازار گرم ، دوسرے جتنے ہندوستانی
حکّام پہلے کے تھے کوئی روپوش ، کوئی ماخوذ ، غرض سب
کے سب یک قلم موقوف ؛ نہ لیاقت دیکھی نہ وجاہت ، سفارشی
ٹٹوؤں کو آنکھیں بند کرکے بھرتی کر لیا گیا تھا ، ان میں
ہمت کہاں ، جرات کا کیا مذکور۔ ابن الوقت بہتیرا ٹھیل ٹھیل
کر اُن کو اپنی راہ پر لے چلنا چاہتا تھا مگر یہ پیندی کے بل
بیٹھے چلے جاتے تھے۔ ان کو اگر کوئی مجبور کرتا کہ
جیتے ہوئے سانپ کو پکڑ لو تو شاید کر بھی گزرتے مگر
کسی طرح ممکن نہ تھا کہ انگریز کے ساتھ ہاتھ ملا
سکیں ۔ ابن الوقت کے بہت سمجھانے پر ایک بابو ڈپٹی
صاحب نے یہ جواب دیا تھا ”ہم شب شمجتا پر شاب لوگ
کا شامنا ہم باش میں رہنا نہیں شکتا “* ۔ کچھ ضعف طبیعت، کچھ
خوشامد اور کچھ ابن الوقت کے ساتھ خدا واسطے کا حسد، بعض تو
اس طرح کے سوذی تھے کہ حکّام کو ابن الوقت کی طرف سے بد ظن
کرنے کے لیے معمول اور ضرورت دونوں سے زیادہ حاکموں کے
آگے جھکنے لگے تھے۔ نا چار ابن الوقت کو اپنے تئیں اپنے ہی گروہ
سے الگ رکھنا پڑتا تھا مگر کہاں تک؛ انگریزوں کے ساتھ اختلاط
پیدا کرنے کے لیے تو یہ ساری مصیبت مول لی تھی ، ان سے ملنا
اور کثرت سے ملنا تو ابن الوقت کے سب کاموں پر مقدّم تھا۔ پس یہ
تدبیر کیا کرتا تھا کہ انگریزوں سے ملتا تھا مگر ہندوستانیوں کا
اور خاص کر اپنے اقران وامثال کا وقت بچا کر۔ اس کو انگریزوں
سے ملنے کے بہتیرے مواقع تھے؛ بعض کو یہ کھانے پر بلاتا تھا اور
سارے سٹیشن میں ملکی فوجی ملا کر گنتی کے چار پانچ ایسے بھی

* ہم سب سمجھتا مگر صاحب لوگ کا سامنا ہم بس میں رہنا
نہیں سکتا ۔

تھے جو اُس کو کبھی کبھی کھانے پر بلا بھیجتے تھے۔ نوبل صاحب نے بڑی سینہ زوری سے اُس کو کلب۱ میں داخل کرا دیا تھا، بہتوں کے ساتھ وہاں ملاقات ہو جاتی تھی؛ پھر ہوا خوری، کرکٹ۲، انٹا شکار۳، کون سی پارٹی۴ تھی جس میں ابن الوقت کسی نہ کسی طرح اپنے تئیں لے نہیں گھستا تھا۔ بات یہ ہے کہ سارے کھیل روپے کے ہیں اور ابن الوقت انگریزوں کے مقابلے میں خرچ کی پرواہ مطلق کرتا نہ تھا۔

سب سے بڑے دشمن ہندو مسلمان سب کے اور خاص کر ابن الوقت کے یوریشین تھے اور یہی لوگ شراب اور سوڈا واٹر۵ اور لمنڈ۶ اور چرٹ وغیرہ کی چاٹ کے مارے اس کو ہر وقت گھیرے بھی رہتے تھے۔ تبدیل وضع کی نسبت تو خیر جو چاھو سو کہہ لو، یوں ابن الوقت بڑا متین آدمی تھا۔ وہ کہیں مدّتوں میں جا کر کُھلتا تھا، سو بھی ہر ایک سے نہیں۔ اُس کے سینکڑوں ملاقاتیوں میں گنتی کے چند آدمی تھے جن کے ساتھ ہمہ وقت نہیں بلکہ خاص خاص اوقات میں، وہ کسی قدر بے تکلفی کرتا تھا۔ ایسے مزاج کے آدمی کا قاعدہ ہوتا ہے کہ کوئی چاہے نہ چاہے مگر وہ مخالف اور موافق سب سے اپنا ادب کرا ھی لیتا ہے۔ پس ابن الوقت کے منہ پر تو کوئی نہیں رکھتا تھا اور نہ رکھ سکتا تھا مگر لوگوں کے بطُون اُس کی طرف سے صاف نہ تھے۔ چنانچہ ایک موقع پر سبھی نے تو اپنا اپنا زھر اگلا۔

امریکا کے مشن کی طرف سے ایک سکول جاری تھا۔ اُس میں پڑھنے لکھنے کے علاوہ لڑکوں کو دستکاری بھی سکھائی

---

۱ کمیٹی کے طور کا مجمع احباب۔ ۲ ایک انگریزی کھیل۔
۳ انگریزی کھیل۔ ۴ جلسہ۔
۵ سجی کا پانی۔ ۶ لیموں کا پانی۔

جاتی تھی اور چونکہ ایسے مدرسے کی بہت ضرورت تھی ، لڑکے ایسے گرتے تھے کہ جیسے شہد پر مکھیاں ۔ پادری صاحب بڑے ھی ملنسار آدمی تھے ، سکول میں برس کے برس جلسہ کرتے اور اُس میں شہر کے سارے رودار آدمیوں کو بلاتے اور اُن کے خوش کرنے کے لیے بجلی اور مقناطیس کے عجیب عجیب کرتب دکھاتے ۔ جلسے کے دن قریب تھے تو اُنھوں نے پہلے سے ابن الوقت سے کہہ رکھا تھا کہ آپ کو ضرور آنا ھوگا اور مہربانی فرما کر لکچر بھی دینا ھوگا ۔ اُنھیں دنوں ابن الوقت کے چند دوست (انگریز) متقاضی ھوئے کہ ھم کو اپنے علاقے کھیرکا پور میں لے جا کر شکار کھلاؤ ۔ ابن الوقت کو پادری صاحب کا جلسہ یاد تھا مگر ان دوستوں کو بھی ٹال نہیں سکتا تھا ، ناچار گیا مگر ایسے انتظام کے ساتھ کہ جلسہ ناغہ نہ ھو ۔ وھاں شکار میں اتفاق سے کوئی انگریز گھوڑے پر سے گرا اور اُس کی تیمارداری نے ابن الوقت کو فرصت نہ دی ۔ ناچار اُس نے پادری صاحب کو عین وقت پر معذرت لکھ بھیجی ۔ پادری صاحب نے بڑا ھی افسوس کیا اور ھر چند چاھا کہ کوئی اور ھندوستانی لکچر دے ، کسی نے ھامی نہ بھری ۔ غرض اَور سب ھوا مگر پادری صاحب کو لکچر کی بڑی خوشی تھی وہ نہ ھو سکا ۔ خیر جب تماشے وغیرہ ھو چکے تو سب لوگ آپس میں بیٹھے باتیں کر رھے تھے ۔ پادری صاحب بولے افسوس ھے کہ مسٹر ابن الوقت کے نہ ھونے سے آج ھماری خوشی ادھوری رہ گئی ، وہ ھوتے تو مجھ کو یقین ھے بڑا عمدہ لکچر دیتے اور اُس سے سامعین خوش اور طالب العلم مستفید ھوتے ۔

ایک انگریز جج ۔ بے شک مسٹر ابن الوقت بڑے گویا

اور روشن خیال آدمی ھیں اور میں نے ایسا بے تکان بولنے والا ہندوستانی نہیں دیکھا ۔ مسٹر نوبل کے ڈنر میں جو اُنھوں نے پہلی سپیچ دی تھی آج تک میرے کانوں میں گونج رہی ھے اور ھر چند آپ کے کرتب بڑے دل چسپ ھیں اور اُن کے دیکھنے سے علمی مفاد بھی بہت کچھ حاصل ہوتا ھے مگر مسٹر ابن الوقت اپنی سپیچ سے ان کرتبوں کو زیادہ شان دار اور بارونق کرسکتے تھے ۔

ایک یوریشین[1] ڈپٹی کلکٹر۔ (ایک کایتھ ڈپٹی کلکٹر سے ذرا پیچھے کو جھک کر) ۔ آپ کو معلوم ابن الوقت صاحب کیوں غیر حاضر ھے ۔

کایتھ ڈپٹی کلکٹر۔ میں نے ابھی تھوڑی دیر ہوئی یہیں آ کر سنا کہ ایک ہفتہ ھوا صاحب لوگوں کے ساتھ شکار کو گئے ھیں ۔

یوریشین۔ ابن الوقت صاحب کو شکار کا بہت شوق ھے ۔ ھم اکثر اُس کو شکار میں گیا ھوا سنتا ھے ۔

کایتھ ۔ ھاں صاحب اُن کو سب شوق زیبا ھیں ۔

ع مربّی بیار و مربّی بہ خور ۔ ایک قسمت کے ہیٹے اُسی تنخواہ اور اُنھیں اقتدارات کے ڈپٹی ھم ھیں ؛ لالہ جی بیکنٹھ باشی ھوئے ، مَوسی مری ، خاوندوں کا رخ نہ پایا ، رخصت کو منہ سے نہ نکال سکے ، بندگی و بے چارگی ۔

یوریشین ۔ کلکٹر صاحب کبھی چھٹی دینا نہیں مانگتا ؛ میم صاحب اور مسی بابا پہاڑ جانے لگا ، ھم صاحب سے بولا صاحب صاف کہا نو[2] ۔ ھم سنتا نوبل صاحب بہت جلد

---

[1] دوغلہ جس میں انگریز اور ہندوستانی کا میل ھو ۔
[2] نہیں ۔

ولایت جانا چاہتا ۔

جنٹ مجسٹریٹ۔ نہیں نہیں انھوں نے درخواست کی تھی، صاحب کمشنر نے روک دیا کہ تا اختتام تحقیقات بغاوت درخواست کرنی مناسب نہیں ۔

یوریشین۔ اگر نوبل صاحب گیا تو ابن الوقت کیا کرے گا ۔ شاید وہ بھی صاحب کے ساتھ ولایت جائے گا ۔

جنٹ ۔ عجب نہیں! دیکھیں اس وقت کلکٹری کا چارج کس کے ھاتھ میں ھوتا ھے ۔

کایتھ ۔ بھگوان کی دیا سے حضور والا کے دست مبارک میں ھوگا؛ مدت سے ھم سب نمک خوار دعائیں مانگ رھے ھیں ۔

یوریشین۔ میں آپ کو کلکٹر دیکھ کر بہت خوش ھوں گا ۔

جنٹ ۔ کیا ابن الوقت صاحب میری کوٹھی میں بھی جوتی پہن کر، ٹوپی اوڑھے ھوئے جانے کا ارادہ کریں گے؟ وہ ھندوستانی ھیں اور میں ان کو سکھاؤں گا کہ ھندوستانی کو اپنے افسروں کا ادب کس طرح سے کرنا چاھیے ۔ مجھ کو نوبل صاحب کے ساتھ ابن الوقت کے بارے میں ھرگز اتفاق نہیں ۔ میں ابن الوقت صاحب کو نوکری اور جاگیر دونوں کا مستحق سمجھتا ھوں لیکن صاحب لوگوں کو بے عزت کرنے کا ان کو کوئی حق نہیں ۔

یوریشین۔ میں آپ کی دانشمندانہ پالیسی* کو نہایت پسند کرتا ھوں ۔ آخر یہ (کایتھ کی طرف اشارہ کرکے) بھی تو ڈپٹی ھیں، ایسے گستاخانہ خیالات ان کے دماغ میں کیوں نہیں آتے ؟

---

* طریقہ انتظام ۔

کایتھ ۔ ہم جتنے ہندو ہیں ہمارا دھرم یہی ہے کہ حاکم اور بھگوان برابر۔

جنٹ ۔ ہم نہیں سمجھتا کہ اس خیال اور مزاج کا آدمی غدر میں باغی کیوں نہیں ہوا ؟

یوریشین ۔ اُس کا دل باغی ہے اور میں کبھی یقین نہیں کرتا کہ اس نے نوبل صاحب کو سچے دل سے بچایا ہوگا ۔

جنٹ ۔ مجھ کو مسٹر . . . تمھاری اس رائے سے اتفاق نہیں، اس کے بہتر جج نوبل صاحب ہیں جو غدر میں اُس کے ساتھ رہے ہیں ۔ صاحب کو پورا بھروسا ہے کہ وہ دل سے سرکار کا خیرخواہ ہے ۔

یوریشین ۔ میں آپ سے معافی مانگتا ہوں؛ حقیقت میں یہ بات سمجھ میں آنی مشکل ہے کہ ایسے خیالات ، اور خیر خواہی دو چیزیں ایک سر میں کیوں کر جمع ہو سکتی ہیں ، ان میں ایک اصلی ہوگی اور دوسری بناوٹ ۔

ایک مسلمان رئیس ۔ جس طرح آپ لوگوں کو ابن الوقت صاحب کی خیر خواہی میں حیرت ہے اُس سے زیادہ سارے مسلمانوں کو اُن کے اسلام میں ہے ۔

پادری صاحب ۔ آخر مسلمان ابن الوقت کے مذہب کی نسبت کیا خیال کرتے ہیں ؟

مسلمان ۔ عموماً عیسائی سمجھتے ہیں ۔

پادری صاحب ۔ (قہقہہ لگا کر) وہ ہرگز عیسائی نہیں اور اُنھوں نے ہر موقع پر اس بات کو ظاہر کیا ہے اور مجھ سے اُن کی اکثر ملاقات ہوتی ہے ۔ مجھ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ خداوند عیسیٰ مسیح ع کو خدا اور خدا کا بیٹا نہیں مانتے بلکہ عام مسلمانوں

کی طرح صرف ایک پیغمبر؛ لیکن ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ اگر ابن الوقت دل سے عیسائی ہوتے بلاشبہ علانیہ اقرار کرتے، وہ اپنی رائے کو چھپانے والے آدمی نہیں مگر ہمارا سارا کانگریگیشن* خاص کر ان کے حق میں ہمیشہ دعا کرتا ہے، خداوند عیسیٰ مسیح[ؑ] قبول کرے۔

مسلمان۔ اگر ابن الوقت عیسائی نہیں ہیں جیسا کہ آپ فرماتے ہیں تو آپ اُن کو اپنے ساتھ کھانا کیوں کھلاتے ہیں (اس پر جنٹ اور یُوریشین ڈپٹی کلکٹر اور دوسرے سب انگریز ہنس پڑے)

پادری صاحب۔ ہمارے مذہب میں جسمانی پاکی اور ناپاکی محض بے حقیقت چیز ہے۔ اگر ایک آدمی اپنے تئیں صاف ستھرا رکھتا ہے وہ اپنی سوسائٹی کی تن درستی کے لیے مناسب تدبیر کرتا ہے لیکن اس سے اس کی روح (ہندوؤں کی طرف مخاطب ہو کر آتما) مقدس خدا کی نظر میں پاک نہیں ہو سکتی۔ آدمی کا جسم چند روزہ اور ناپائدار ہے وہ ایک قاعدے کے مطابق پرورش پاتا اور آخر کو فنا ہو جائے گا۔ غرض روح اور جسم کا تعلّق عارضی تعلّق ہے، جس طرح جسم نجاست اور غلاظت سے ناپاک ہوتا ہے اسی طرح روح غصے اور لالچ اور حسد اور جھوٹ اور تکبّر اور ظلم اور کتنی اور خراب باتوں سے ناپاک ہوتی ہے۔ جسمانی ناپاکی بہت آسانی سے دور ہوسکتی ہے مگر روحی ناپاکی بدون اس کے کہ آدمی خداوند عیسیٰ مسیح[ؑ] کے نام سے اصطباغ† لے زائل نہیں ہو سکتی۔ سب آدمی خدا کے نزدیک یکساں اور سب ناپاک ہیں اور جو شخص اپنے تئیں پاکیزہ گردانتا ہے وہ

---

* عیسائیوں کی جماعت۔

† عیسائی جب کسی کو مذہب میں داخل کرتے ہیں پانی کا چھینٹا دیتے ہیں یہی اصطباغ ہے۔

دل کی ناپاکی کو ظاہر کرتا ہے۔ ہم نے ابن الوقت صاحب کو اپنے ساتھ کھانا کھلایا کیونکہ وہ ہماری طرح کے آدمی ہیں اور ہم ہر شخص کو اپنے ساتھ کھلانے کو تیار ہیں اور سب سے پہلے آپ کو اگر آپ پسند کریں (اس جملے پر سب ہنسے)

مسلمان۔ اگر ہم کو یقین ہو کہ آپ اُن چیزوں سے جو مذہب اسلام میں بہ تقاضائے مصالح چند در چند حرام کی گئی ہیں محترز ہیں تو ہم کو آپ کے ساتھ کھانے میں ہر گز انکار نہیں۔ ہاں تو اگر ابن الوقت صاحب عیسائی نہیں اور مسلمان تو یقیناً نہیں پھر کیا ہیں؟

پادری صاحب۔ وہ اپنے تئیں صاف صاف مسلمان کہتے ہیں اور بے شک مسلمان ہیں۔

مسلمان۔ اگر ابن الوقت صاحب مسلمان ہیں تو پھر دنیا میں کوئی کافر نہیں۔ اسی طرح ہمارے ان ڈپٹی صاحب (کایتھ کے طرف اشارہ کرکے) کو بھی اختیار ہے کہ بت پرستی کرتے جائیں اور عیسائی یا مسلمان ہونے کا دعویٰ کریں۔

کایتھ۔ بھگوان نہ کرے میں عیسائی یا مسلمان کیوں ہونے لگا۔ سب میں اوتم* اور پراچین ہمارا ہی دھرم ہے جو ہزارہا برس سے چلا آتا ہے اور ہر چند مسلمانوں نے بڑے بڑے جتن کیے کہ ہندو دھرم مٹ جائے، بھگوان کا ایسا کرنا ہوا کہ آپ ہی مٹ گئے۔

جنٹ۔ اچھا اگر کوئی ابن الوقت صاحب کو اپنے مذہب میں لینا نہیں چاہتا تو اُن کو بھی کسی مذہب کی پروا نہیں۔ وہ صرف ایک بلند نظر آدمی ہے اور دنیا میں اس

---

*عمدہ اور قدیم۔

قسم کے اور بہت آدمی ہوئے ہیں۔ وہ فقط اپنی نمود چاہتا ہے ، اس کی مسلمان اور کایتھ اور یوریشین سب نے تصدیق کی۔

پادری صاحب ۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کو مسلمانوں کی رفارم کا بھی بہت خیال ہے ۔

مسلمان ۔ بس جناب یہ اُن کے دکھانے کے دانت ہیں۔

پادری صاحب ۔ اُنھوں نے ہمیشہ انگلش سوسائٹی میں، مسلمانوں کی حالت پر افسوس ظاہر کیا ہے ، وہ دل سے مسلمانوں کا خیرخواہ ہے اور اُس کے دل میں اپنی قوم کی بڑی محبت ہے اور جب جب اس کو موقع ملتا ہے مسلمانوں کے فائدے میں کوشش کرتا ہے ۔

مسلمان ۔ خدا جانے اس میں کیا مصلحت ہوگی ورنہ میرے دیکھنے میں تو اُس شخص نے اسلام کی تفضیح میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا ۔ مسلمانوں کے ساتھ مدارات کا حال یہ ہے کہ آپ لوگ غیرمذہب حاکم وقت ہوکر تو سیدھی طرح بات بھی کر لیتے ہیں اور اُن کو مسلمانوں کی شکل سے نفرت ہے ؛ غیر تو درکنار وہ شخص اپنے رشتہ داروں سے ملنے تک کا روادار نہیں سبحان اللہ کیا حُبِّ قومی ہے ۔

جنٹ صاحب ۔ یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے مائی فرنڈز* ، مسٹر ابن الوقت کی تھاہ میرے سوائے کسی نے نہیں پائی ۔ جلسہ برخاست ۔

---

* میرے دوستو۔

فصل شانزدهم

ابن‌الوقت کا انگریزی طرز سے متاذّی ہونا

الغرض ابن‌الوقت کی نسبت لوگوں کے اس قسم کے خیالات تھے - ہندوستانی سوسائٹی میں بہ استثناء معدودے چند جنھوں نے اُس کی وضع کی تقلید کرلی تھی، کوئی اس کو پسند نہیں کرتا تھا؛ انگریزوں میں اعلیٰ درجے کے انگریز وہ بھی سب نہیں، البتہ اُس کے خیالات کی قدر و وقعت کرتے تھے - بہ ہر کیف اُس کے مخالف بہت تھے اور یہ بات خود ابن‌الوقت کو بھی معلوم تھی اور یہ خیال اُس کو اکثر رنجیدہ رکھتا تھا - اُس کے اپنے بی‌بی بچے تو سب غدر سے پہلے مر کھپ چکے تھے اور یہ بے تعلّقی اگر باعث نہیں ہوئی تو اُس کی آزادی میں موّید تو ضرور ہوئی - تاہم وہ بھائی، بھتیجوں اور دوسرے رشتہ‌داروں کی مفارقت کے خیال سے بھی متاذّی ہوتا تھا؛ رشتہ دار تو رشتہ‌دار اُس کو ہندوستانی سوسائٹی کے چھوٹ جانے کا بھی افسوس تھا اور ہم نے تحقیق سنا ھے کہ اُس نے بارہا اپنے رازداروں سے کہا کہ میرے یہاں کے کھانے کی ساری چھاؤنی میں تعریف ھے مگر میرا یہ حال ھے کہ انگریزی کھانا کھاتے ہوئے اتنی مدت ہوئی، سچ تو یہ ھے کہ ایک دن مجھے سیری نہیں ہوئی اور میں اکثر خواب میں اپنے تئیں ہندوستانی کھانا کھاتے ہوئے دیکھتا ہوں -

ابن‌الوقت کے خاص خدمت گار کی زبانی معتبر روایت ھے کہ ایک بار اُس کو سخت تپ لاحق ہوئی اور عادت کے موافق

لگا بھٹکنے تو وہ ھندوستانی کھانوں کے نام لے لے کر روتا
تھا اور کھانے بھی پلاؤ ، زردہ ، متنجن ، بریانی نہیں بلکہ
مونگ کی دال کا بھرتا ، دھوئی ماش کی پھر ھری دال ، قلمی
بڑے کباب ، امرودوں کے کچالو ؛ اس سے معلوم ھوتا ھے کہ
وہ چٹپٹی چیزوں کو ترس گیا تھا ۔

معلوم ھے کہ ابن الوقت ابتدائے تبدیل وضع سے گھر بار
چھوڑ کر باھر چھاؤنی میں جا رھا تھا ؛ اُس کے پاس اتنے
نوکر چاکر تھے کہ اُس کی کوٹھی کا احاطہ بہ جائے خود
ایک چھوٹا سا محلہ تھا لیکن اُس کی زندگی ویسی ھی اُداس
زندگی تھی جیسی ایک بیچلر* کی ھوتی ھے اور ھونی چاھیے ۔
وہ نوکروں کے حق میں بڑا سیرچشم آقا تھا ۔ اُس کے یہاں
نوکروں کی ایسی بھاری تنخواھیں تھیں کہ دلّی کی اتنی بڑی
چھاؤنی میں بس دو چار ھی جگہ اور ھوں گی ، اس لیے کہ اُس کے
تمام نوکر سلیقہ مند اور مستعد تھے اور حقیقت بات ھے کہ اُنھیں
نوکروں نے انگریزی سوسائٹی میں اس کی اتنی بات بھی بنا رکھی
تھی مگر نوکر کیسے ھی ھوشیار کیوں نہ ھوں پھر بھی مالک کی
تائید کی ضرورت باقی رھتی ھے ۔ انگریزی زندگی ایسے بکھیڑے کی
زندگی تھی کہ ابن الوقت کو جتنا وقت کچہری اور ملاقات سے بچتا
تھا ، صفائی کی نگرانی اور ھر چیز کی خبر گیری کے لیے
بہ مشکل وفا کرتا تھا ۔ یہ سچ ھے کہ اُس کے نوکر
انگریزی مذاق سے خوب واقف تھے مگر ابن الوقت سے خود
صبر نہیں ھوسکتا تھا اور وہ اپنی طرف سے ایسی خراش تراش ایجاد
کرنے لگا تھا کہ خواھی نخواھی اُس کو دیکھنا پڑتا تھا ۔

دعوت ایسے مزے کی چیز ھے کہ کھلانے والا اور
کھانے والا دونوں ھی خوش ھوتے ھیں مگر ابن الوقت کے یہاں کی

---

* مجرد ۔

دعوت اُس کے حق میں ایک مصیبت ہوتی تھی؛ کھانا تو کہیں جا کر رات کے نو دس بجے نصیب ہوتا اور اہتمام کی آندھی صبح سویرے سے چلنی شروع ہو جاتی تھی۔ ہم کو تو کوئی دعوت ایسی یاد نہیں کہ ابن الوقت تکان کی وجہ سے اُس کے بعد علیل نہ ہوا ہو؛ پھر چھٹے چھ ماہے دعوت ہو تو خیر یہاں ہر مہینے، کچھ نہ ہو تو بڑے کھانے دو تین بلکہ بعض اوقات تو ابن الوقت گھبرا کر بول بھی اُٹھتا تھا کہ یہ میں نے کہاں کا کھڑاگ اپنے پیچھے لگا لیا ہے۔

یہ تو میزبانی کی لذتیں تھیں، مہمانی کے ذائقے ان سے بھی زیادہ تلخ۔ اگر سٹیشن میں کسی انگریز کے یہاں کھانا ہے اور اُس نے ابن الوقت کی دعوت نہیں کی اور ایسا اکثر ہوتا رہتا تھا۔ تو اُس کے دل پر ایک صدمہ گزرجاتا تھا اور وہ اس کو اپنی تذلیل سمجھتا تھا، نہ صرف انگریزی سوسائٹی میں بلکہ جی ہی جی میں اپنے نوکروں تک سے کئی کئی دن شرمندہ رہتا تھا؛ اگر اس کا بھی بلاوا ہوا تو صاحب خانہ کے گھر میں قدم رکھتے ہی اُس کو ان فکروں نے آگھیرا کہ کس کی کیسی آؤ بھگت ہوئی، کون لیڈی کس صاحب کے پاس بیٹھی اور اگر یہ پھٹیل* رہ گیا یا کوئی چیز اپنے یہاں سے بہتر نظر پڑ گئی تو وہ دعوت اُس کے لیے عداوت ہو جاتی تھی۔

الغرض انگریزی سوسائٹی کے داخل ہونے کے خبط نے اس کو ایسا بے چین کر رکھا تھا کہ دن رات میں دو چار منٹ کے لیے وہ بھی شاید، اُس کو خوشی ہوتی ہو تو ہوتی ہو، ورنہ جب دیکھو منقبض، جب سنو آزردہ۔ ذرا سوچنے اور خیال کرنے کی بات ہے کہ جو شخص دنیا میں

---

* اکیلا۔

اس قدر منہمک ہو، اُس کو دین داری سے کیا سروکار؛ سچی دین داری کی بڑی شناخت ہے زھد، جتنا جس سے ہو سکے، اور کجا زھد اور کجا یہ فضول ولایعنی بکھیڑے، سو بھی ہم نے ابھی تک سب نہیں بلکہ نمونے کے طور پر بعض چھوٹی چھوٹی باتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ابن الوقت بے چارے مصیبت کے مارے کو ایک سے ایک سخت مشکل درپیش تھی کہ وہ تو وہی ھٹ کا پورا تھا کہ ان آفتوں کو بری طرح یا بھلی طرح جھیلتا رہا، دوسرا تو کبھی کا بھاگ کھڑا ہوا ہوتا اور پھر ساری عمر انگریزی سوسائٹی کا نام نہ لیتا؛ ھاتھیوں کے ساتھ گنّے کھانا ایسا کیا کچھ لڑکوں کا کھیل ہے۔

ابن الوقت غدر سے پہلے بھی اچھا خاصا خوش حال تھا۔ قلعے کی تنخواھیں تو تھوڑی تھیں مگر اوپر سے انعام اکرام وغیرہ ملا کر بہت کچھ پڑ رھتا تھا۔ ھمارے اندازے میں ابن الوقت کی آمدنی پچاس روپے ماھوار سے ھرگز کم نہ تھی اور غدر کے بعد سے تو کچھ پوچھنا ھی نہیں؛ نہ سو نہ سوا سو، ماشاء اللہ ایک دم سے پانسو۔ اس آمدنی پر اچھے سے اچھا کھانا، اچھے سے اچھا پہننا غرض امیرانہ خرچ رکھتا مگر ھندوستانیوں کا سا، تو چند سال کے عرصے میں اُس کے پاس معتدبہ سرمایا ھو جاتا لیکن اُس نے کرنی چاھی انگریزوں کی ریس۔ پورا برس بھی خیریت سے گزرنے نہیں پایا تھا کہ لگا اُدھار کھانے۔ جس وقت اس کو جاں نثار نے نہلا دھلا کر پہلے پہل انگریزی کپڑے پہنائے تو کوٹھی کا سازوسامان اور اپنی شان دیکھ کر اُس کو اس قدر خوشی ھوئی تھی کہ اپنے آپے میں نہیں سماتا تھا اور ابھی اس خوشی کا اثر طبیعت پر باقی تھا کہ ایک چپڑاسی بڑا لمبا چوڑا لفافہ لیے ھوئے برآمدے تک آیا، قاعدے کے مطابق بیرے*

---

* انگریزوں کا خدمت گار۔

نے لفافہ کشتی میں رکھ نئے صاحب کے حضور میں پیش کیا؛ کھولا تو جنرل سپلایر کا بل تھا، کتنے کا، کچھ اوپر پانچ ہزار کا۔ پانچ ہزار کی رقم دیکھ کر قریب تھا کہ حواس خمسہ مختل ہو جائیں «مگر سنگ آمد و سخت آمد» چون و چرا کرنے کا موقع نہیں «قہر درویش بر جان درویش» دینا ھی پڑا مگر کیوں کر؛ ہزار کا توڑا نوبل صاحب کا دیا ھوا سربند رکھا ھوا تھا، وہ لیا اور بہ ہزار مشکل دو ہزار گھر میں سے فراھم کیے پھر بھی سوا دو ہزار اور ھوں تو پنڈ چھوٹے۔ بارے غدر سے پہلے نواب معشوق محل بیگم صاحب کی سرکار میں ابن الوقت کی معرفت گڑ والوں کا لین دین تھا، ڈرتے ڈرتے اُن کو رقعہ لکھا۔ اسامی تھی کھری اور جان دار، اُنھوں نے بے تامل روپیہ حوالے کیا۔ یوں جنرل سپلایر کا پوت پورا ھوا۔ «رسیدہ بود بلائے ولے بہ خیر گزشت»۔

لیکن ابن الوقت نے تو خرچ کا دڑبا کھول دیا تھا۔ جس نسبت سے اُس کی آمد بڑھی تھی اگر اُسی نسبت سے خرچ بھی بڑھتا تو چنداں حرج کی بات نہ تھی، پر اُس نے لیٹتے کے ساتھ چادر کے باھر پانو پھیلا دیے؛ اوّل سرے گھر کے تیھرے، چوھرے مکان ھوتے ساتے چالیس روپے مہینے کا بنگلہ پھر فٹن، ٹمٹم (ٹینڈم)، بروم، پالکی گاڑی، چار قسم کی بگھیاں اور چار کے چار گھوڑے اور ایک زین سواری کا پانچ، دھوبی، سقا، چوکیدار، فرّاش، مشعلچی، باورچی، میٹ، سائیس، گراس کٹ، مالی، بیرا، دوڑھائی درجن کے قریب شاگرد پیشہ، ان کی تنخواھیں اور تنخواھوں کے علاوہ وردی، اُسی کی مناسبت سے دوسرے مصارف باستثناء میز کہ اُس کا کچھ اندازہ ھو ھی نہیں سکتا، مہینے میں اچھے جیّد دو کھانے بھی ھو گئے تو ساری تنخواہ پر پانی کا پھر جانا

کچھ بات نہیں۔
ابن الوقت نے شروع شروع میں شاید تین یا چار تنخواہیں وقت پر لی ہوں گی، اُس کے بعد سے تو خزانچی کے ساتھ معاملہ ہو گیا؛ ایک چھوڑ دو مہاجن دینے والے۔ جب ضرورت ہوئی جس سے جتنا چاہا منگوا لیا۔ تنخواہ تو اوپر سے اوپر خزانچی لے لیا کرتا تھا اور زمینداری کا محاصل گڑ والوں کی کوٹھی میں چلا جاتا تھا۔ ان بچہ کو انگریز بننے کی دھن میں اتنی بھی خبر نہ تھی کہ سر پر کتنا قرضہ لدتا چلا جا رہا ہے۔ یہ تو اپنے ان خیالات میں مست تھا کہ «صاحب کمشنر مجھ کو مائی ڈیر[1] ابن الوقت اور اپنے تئیں یور سنسیرلی[2] لکھتے ہیں۔ چیف کمشنر نے سالانہ رپورٹ میں میری کارگزاری کا شکریہ ادا کیا ہے۔ جوڈیشیل کمشنر نے ایک فیصلے میں میری نسبت یہ لکھا ہے۔ کہ اس کی طبیعت کو قانون سے فطری مناسبت ہے۔ فنانشل کمشنر نے فلاں سرکار کا مسودہ مجھ سے طلب کیا تھا اُن کی چٹھی موجود ہے، اب جو چھپ کر آیا تو میں دیکھتا ہوں ایک لفظ کا رد و بدل نہیں کیا۔ قانون شہادت کی فلانی دفعہ میرے اصرار سے بڑھائی گئی۔ لیجس لٹیف کونسل کے لیگل ممبر نے مجھ کو چٹھی میں اطلاع دی مگر نہیں معلوم اپنی اسپیچ میں میرا تذکرہ کیوں نہیں کیا۔ یا تو رپورٹر کی فرو گذاشت ہے یا ممبر صاحب کو اُس وقت خیال نہ رہا ہو گا۔ فلاں صاحب نے ولایت سے میرا فوٹو گراف منگوایا ہے اور لکھتے ہیں کہ میم صاحب متقاضی ہیں۔ اوہو! مس جوزفا جو ہمارے ڈائننگ روم[3] کی تصویروں کو بہت پسند کرتی تھی اور گھنٹوں ہمارے کتّوں سے کھیلا کرتی تھی۔ ابھی ولایت کی ڈاک میں اُس کی ماں کی چٹھی آئی ہے، ایک بڑے

۱۔ عزیز من۔ ۲۔ تمہارا مخلص۔ ۳۔ کھانے کا کمرہ۔

سوداگر کے ساتھ اُس کی شادی ہونے والی ہے۔ میجر صاحب نے آئیس کریم (ملائی کی برف) جمانے کے لیے ہمارے آدمی کو بلا بھیجا ہے، یہاں سے برف ہی جموا کرنہ بھیج دی جائے۔ کرنیل صاحب کا اسباب نیلام ہوگا تو دو گھوڑے ہم ضرور لیں گے کیوں کہ ہم نے خوب خیال کرکے دیکھا تو ہمارے دو گھوڑے ہمیشہ صاحب لوگوں کی سواری میں رہتے ہیں اور چڑیوں اور پھولوں کے گملوں کو تو ہم اُن سے زبانی کہہ چکے ہیں۔ پرسوں کیا اتفاق ہوا کہ میں ٹھنڈی سڑک پر جا رہا تھا کپتان صاحب اور اُن کی میم آتے ہوئے ملے، بڑے تپاک سے صاحب سلامت ہوئی۔ میم صاحب کے ہاتھ میں ایک پھول تھا اُنھوں نے میری طرف پھینک دیا۔ کپتان صاحب بولے مسٹر ابن الوقت میرے پاس کوئی پھول نہیں کہ میں تم کو دیتا، تو میں نے کہا آپ کے پاس تو نہایت خوب صورت گلدستہ ہے۔ میم صاحب نے اس کا بڑا شکریہ ادا کیا اور دونوں میاں بی بی ہنستے ہوئے برابر سے نکل گئے۔ فرنڈ آف انڈیا[1] نے ایک آرٹیکل میں مجھ کو مسلمانوں کا مشہور رفارمر لکھا ہے۔»

غرض جس طرح آدمی کو کسی بات کی زُڑ نہیں لگ جاتی، بس ابن الوقت کو انگریز بننے کی زُڑ تھی۔ شروع شروع میں تو اُس کو مسلمانوں کے حال پر بھی ایک طرح کی نظر تھی لیکن چند روز کے بعد اُس کی ساری رفارم اسی میں منحصر ہو گئی تھی کہ انگریزی اوضاع و اطوار میں سے کوئی وضع اور کوئی طور چھوٹنے نہ پائے۔ کم بخت آپ بھی برباد ہو رہا تھا اور اُس کی دیکھا دیکھی کچھ

۱۔ ایک انگریزی اخبار۔

ایسی ہوا چلی کہ مسلمانوں کے نوجوان لڑکے خصوصاً جنھوں نے ذری سی انگریزی پڑھ لی تھی یا جو گھر سے کسی قدر آسودہ تھے ، تباہی کے لچھن سیکھتے چلے جاتے تھے۔ اس کے اندرونی حالات کی تو کسی کو خبر نہ تھی ، ظاہر میں دیکھتے تھے کہ انگریزوں میں ملتا جلتا ہے ، جو بات کسی ہندوستانی عہدہ دار کو نصیب نہیں اس کو حاصل ہے اور لوگوں کی نظر میں انگریزی وضع کی ہیئت بھی ہے۔ پس احمقوں کو اتنے موجبات ترغیب کافی تھے مگر ہے یہ کہ انگریزی وضع خدا کے فضل سے جو کسی ایک کو پھلی ہو؛ سبھی نے تو اپنی اپنی جگہ تھوڑا بہت نقصان اٹھایا اور شاید نقصان نہ بھی اٹھایا ہو تو کسی کو کسی قسم کا فائدہ تو نہیں ہوا۔

کسی جگہ شروع کتاب میں لکھا جا چکا ہے کہ نوبل صاحب کو ایک طرح کا ہلکا ہلکا درد سر ہر وقت رہتا تھا اور اسی کے علاج کے لیے رخصت لے کر ولایت جارہے تھے کہ غدر کی وجہ سے دلّی میں گھر گئے۔ کیا خدا کی شان ہے کہ نہ دوا نہ درمن سارے غدر اور غدر کے بعد بھی مدتوں تک آپ ہی آپ اس درد کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ہر چند اپنے عزیزوں سے ملنے کے لیے ان کا جی ولایت جانے کو چاہتا تھا مگر دیکھتے تھے کہ سلطنت متزلزل ہو رہی ہے ، کام کی ہر جگہ کثرت ہے، ایسے وقت میں تو اگر صاحب ولایت بھی ہوتے تو ان سے ایک دن وہاں نہ ٹھہرا جاتا۔ کیسے ہو سکتا تھا کہ اس حالت میں چلے جائیں؛ چنانچہ انھوں نے اپنے گھر لکھ بھیجا تھا کہ جب تک تمام ملک میں انتظام سابق دستور نہ ہو جائے میں قصد

نہیں کر سکتا ۔ جوں جوں بغاوت فرو ہوتی گئی اس درد کی کسک ابھرتی چلی ۔ ایک بار انھوں نے ولایت جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو چیف کمشنر صاحب نے فرمایا کہ تم جا تو سکتے ہو مگر میں چاہتا تھا کہ تحقیقات بغاوت کا کام تمھارے هاتھ سے اختتام پاتا ، خیر یہ پھر چپ ہو رہے ۔

فصل سیز دہم

نوبل صاحب کا دفعۃً ولایت جانا ہوا ، ابن الوقت کو بنگلہ چھوڑنا پڑا

لیکن درد سر روز روز زور پکڑتا جاتا تھا ، یہاں تک کہ ۱۸۵۹ء کی گرمیوں میں تو یہ حال ہو گیا کہ جس روز گرمی کا اشتداد ہوتا سارے سارے دن ان سے اُٹھا نہیں جاتا تھا اور ڈاکٹر تو مدتوں سے کہہ رہا تھا : اب اُس نے بھی سختی کی کہ اگر تم برسات میں ٹھہروگے تو یقیناً ہلاک ہو جاؤگے ، میں نے تمھارے درد سر کی نسبت بہ‌خوبی تشخیص کرلی ہے کہ سمندر کی ہوا کے سوائے اس کی اور کوئی دوا نہیں ۔ مگر صاحب کا ارادہ تھا کہ آخری رپورٹ روانہ کردوں تب جاؤں ۔ کام بھی بہت سمٹ آیا تھا لیکن قاعدہ ہے کہ کام کا پیچھا ہی بھاری ہوتا ہے ۔ برسات چلی آرہی تھی اور ابھی رپورٹ کا لکھنا بھی شروع نہیں ہوا تھا مگر کیا استقلال ہے اور کس قدر کام کا درد ہے کہ ڈاکٹر بھی متقاضی تھا اور درد سر بھی برسر ترقی تھا ، نوبل صاحب کا یہ حال تھا کہ درد سر نے بہت ستایا پڑ رہے ، پھر ذرا طبیعت سنبھلی ، اُٹھ بیٹھے ، کام کرنے لگے ۔ غرض اس بندۂ خدا نے رخصت کا نام ہی لینا چھوڑ دیا ۔ صاحب کمشنر نے اپنے طور پر اس کی اطلاع چیف صاحب کو دی ، وہاں سے حکم آیا کہ باقی ماندہ کام صاحب کلکٹر کو دے دو اور

تم رپورٹ کا مواد لے کر فوراً ولایت کو روانہ ہو جاؤ؛ چیف صاحب یقین کرتے ہیں کہ جہاز میں تمھاری طبیعت درست ہو جائے گی اور تم ولایت جا کر رپورٹ تیار کرنا اور تمھارے سفر اور قیام ولایت کا زمانہ سروس میں شمار کیا جائے گا اور تم کو پوری تنخواہ دی جائے گی۔

اس حکم کے آتے ہی صاحب کمشنر نے کھڑے کھڑے صاحب کلکٹر کو جائزہ دلوا، نوبل صاحب کو تیسرے دن ولایت چلتا کیا۔ صاحب کے روانہ ہونے سے ہفتہ عشرہ پہلے ڈاکٹر نے ملاقات کی ممانعت کر دی تھی پس اس اثنا میں ابن الوقت کے ساتھ بھی صاحب کی کوئی تفصیلی ملاقات نہ ہونے پائی۔ غرض صاحب روانہ ہوئے تو ابن الوقت ھکّا بکّا سا رہ گیا، نہ اپنی کہی نہ اُن کی سنی۔ اس کو صاحب کے جانے کا سب سے زیادہ ملال تھا مگر ذاتی محبت کی وجہ سے۔ ایک لمحے کے لیے بھی اُس کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ صاحب کے جانے سے اُس کو تبدیل وضع کے برے نتیجے اس قدر دق کریں گے۔

نوبل صاحب کے جاتے جاتے برسات کی آمد آمد اور گرمی کی اشتداد کی وجہ سے ہوا میں روایت کے آثار پیدا ہو چلے تھے؛ شہر میں تو بیماری کا زور تھا، چھاؤنی میں بھی کہیں کہیں شکایت سنی جاتی تھی۔ نوبل صاحب کو روانہ ہوئے چوتھا یا پانچواں دن تھا، کمانڈنگ افسر نے حکم عام جاری کیا کہ انگریزوں کے شاگرد پیشہ کے سوائے کوئی نیٹو چھاؤنی کی حدود میں نہ رہے، شہر کا کوئی آدمی چھاؤنی میں نہ آنے پائے اور انگریزوں کے شاگرد پیشوں میں سے بھی بنگلے پیچھے ایک آدمی ضرورت کی چیزیں لینے کو ایک بار شہر میں جائے اور دن کے سات بجے کے اندر اندر واپس آ جائے اور تاریخ کم سے ایک

ہفتے بعد اس کی پوری پوری تعمیل ہو۔ سال گزشتہ میں بھی ایسا ہی اتفاق پیش آیا تھا تو نوبل صاحب نے سمجھا دیا تھا کہ مسٹر ابن الوقت نیٹو تو ہیں مگر اُن کا طرز ماندوبود بالکل ہم لوگوں کا سا ہے اور ان کے احاطے میں صفائی کے قواعد کے تعمیل پوری پوری ہوتی ہے، چنانچہ فوجی عہدہ داروں نے ابن الوقت کے حالات سے کچھ تعرّض نہیں کیا۔ اب کی بار دو مشکلیں جمع ہو گئیں؛ نوبل صاحب تو تشریف لے گئے اور کمانڈنگ افسر صاحب نئے آئے ہوئے تھے، ابن الوقت سے صاحب سلامت تو تھی مگر کھان پان کی نوبت نہیں آئی تھی۔

جنرل آرڈر دیکھ اگر ابن الوقت کو بڑا تردّد پیدا ہوا اور حقیقت میں بڑے تردّد کا مقام تھا کیونکہ اُس نے صدھا روپے خرچ کرکے احاطے کو مدتوں کی محنت سے اپنی مرضی کے مطابق درست کیا تھا، بڑی تلاش سے کمروں کی وسعت اور اُن کے مواقع کے لحاظ سے فرنیچر* جمع کیا تھا، خانہ باغ کی درستی میں بہت کچھ محنت کرنی پڑی تھی۔ ابن الوقت تمام سٹیشن کے بنگلوں اور کوٹھیوں کے چپّے چپّے سے واقف تھا۔ ہر طرف نظر دوڑائی کوئی بنگلہ ڈھب کا سمجھ میں نہ آیا اور جو دو چار تھے سو مشغول اور اگر مشغول نہ بھی ہوتے تاہم یہاں کا اکثر فرنیچر وہاں کے لیے بے جوڑ اور پھر خانہ باغ تو کسی طرح اُٹھا لے جانے کی چیز نہیں۔

سمجھنے والے کو ابن الوقت کی یہ حالت تازیانہ عبرت تھی، اسی طرح انسان ساری عمر بہ کمال اطمینان دنیا کی درستی میں لگا رہتا ہے اور اُس کو دنیا کے ساتھ دل بستگی ہو جاتی ہے؛ دفعۃً اُس کو دنیا چھوڑنی پڑتی ہے اور چوں کہ وہ دنیا سے مانوس تھا،

---

* اسباب آرائش مکان۔

اُس کو دنیا کی ابدی مفارقت کا سخت صدمہ ہوتا ہے، وہ سازو سامان دنیا میں سے کوئی چیز ساتھ نہیں لے جا سکتا اور جو ساتھ لے جا سکتا ہے یعنی اعمال وہ عاقبت میں شاید اس سے زیادہ بہ کارآمد نہ ہوں جیسے ایک گھر کا فرنیچر دوسرے گھر میں، وہ عاقبت میں اپنے لیے آسائش کی جگہ نہیں پاتا اور جگہ پاتا بھی ہے تو وہاں کے مناسب فرنیچر نہیں رکھتا۔ خدا اپنے فضل سے ہم کو توفیق دے کہ گرویدہ دنیائے چند روزہ نہ ہوں اور عاقبت کے لیے جہاں ہم کو سدا رہنا ہے سامان کرتے رہیں۔ آمین!

۱ ابن الوقت اگر چاہتا تو منّت سے خوشامد سے شاید کاربراری کرلیتا مگر وہ تھا مغرور، برخود غلط، نہ کسی سے پوچھا نہ گچھا جھٹ ایک چٹھی دھر کمانڈنگ افسر کے نام دھر گھسیٹی کہ ہم بالکل انگریزی طور پر رہتے ہیں اور اس وجہ سے پار سال بھی ہم کو مستثنیٰ کر دیا گیا تھا، امسال بھی ہمارے ساتھ اُسی قاعدہ کا برتاؤ ہونا چاہیے۔ کمانڈنگ افسر نے فوراً اُس کے جواب میں لکھ بھیجا کہ چھاؤنی میں لوگوں کا بہت اژدحام ہو گیا ہے اور سپاہیوں کی تن درستی کے لیے بھیڑ کا کم کرنا ضرور ہے؛ یہ پہلا انتظام ہے کہ جو لوگ فوج سے علاقہ نہیں رکھتے چھاؤنی کے اندر نہ رہیں۔ اس جواب کے بعد تدبیر کے سب راستے بند ہو گئے اور چار ونا چار بنگلہ خالی کر دینا پڑا۔ ایک ذری سی بات میں بے چارہ ابن الوقت پیٹھے بٹھائے ہزار بارہ سو کے پھیر میں آگیا اور کرکری ہوئی سو الگ؛ وقت پر موقع کا بنگلہ نہ ملا اور خیریوں ہی سا ملا بھی تو اپنی غرض کو ڈیوڑھا دونا کرایہ دینا پڑا، نقل وحرکت میں اسباب کا اسباب خراب ہوا اور زیرباری کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں۔

فصل شانزدہم

سررشتہ دار کے بہکانے سے صاحب کلکٹر ابن الوقت سے بدگمان ہوئے

ابن الوقت کو حقیقت میں محسوس نہیں ہوتا تھا کہ اُس کو نوبل صاحب سے کس قدر تائید پہنچ رہی ہے۔ اُن کا پیٹھ موڑنا تھا کہ ہر طرف سے مصیبتوں نے آگھیرا۔ یوں بھی نوبل صاحب تنخواہ میں عزت، میں کسی طرح کلکٹر سے کم نہ تھے اور پھر کیا انگریز کیا ہندوستانی، سب کو اس بات کا کامل اذعان تھا کہ بغاوت کا محکمہ عارضی ہے، یہ کام ختم ہوا اور نوبل صاحب ضرور کہیں نہ کہیں کے اور بیس بسوے تو قسمت دھلی کے کمشنر ہوں گے یا چیف کمشنر کے سیکرٹری ہو جائیں تو عجب نہیں کیوں کہ چیف صاحب ان کی طرف بہت ملتفت معلوم ہوتے ہیں۔ اس خیال سے لوگوں کے دلوں میں نوبل صاحب کی بڑی ہیبت تھی اور اُنھیں کی وجہ سے سارا عملہ ابن الوقت کے نام سے تھرّاتا تھا۔ اب جو میدان پایا خالی ایک دم سے سب کے سب پھر بیٹھے۔ سپردگی چارج کا روبکار جاری ہونا تھا کہ عملے لگے آپس میں اشارے کنایے کرنے؛ سب سے پہلے کلکٹری کے چپڑاسی جمع ہو کر سلام کو آئے۔ ابن الوقت اپنے کام میں مصروف تھا، جمعدار نے چند قدم آگے بڑھ کر کہا کہ کلکٹری کے چپڑاسی سلام کو حاضر ہیں۔

ابن الوقت۔ (سر اُٹھا کر) یہ کیسا سلام ہے؟

جمعدار۔ حضور سال کے حاکم ہوئے خدا حضور لاٹ کرے۔

اتنے میں ایک محرّر روبکار اطلاع یابی لکھوانے کے لیے دوڑا ہوا آیا گویا بڑی خوش خبری لایا۔ عملے کے تیور تو بدلے ہوئے تھے سو تھے، چوں کہ ابن‌الوقت میں پانی مرتا تھا، اس کا یہ حال ہو گیا تھا کہ ان کی بات بات کو چھیڑ خانی سمجھتا تھا؛ عجب مشکل آ پڑی تھی اگر کوئی اس کا ادب نہ کرتا تو گستاخ اور کرتا تو وہ سمجھتا کہ ہم کو بناتا ہے۔ جائزے کے کوئی شاید چوتھے یا پانچویں دن سررشتہ دار بج پر رپورٹ خوانی کو گیا تو صاحب کلکٹر نے فرمایا کہ چیف کمشنر صاحب محکمۂ بغاوت کی تخفیف کے لیے بہت مستعجل ہیں اور نوبل صاحب بھی ہم سے چلتے چلتے کہہ گئے ہیں کہ دیکھو اس کام پر خاص نگرانی رکھنا۔

سررشتہ دار۔ جہاں تک فدوی کو معلوم ہے، ڈیڑھ دو برس کا کام باقی ہے۔

صاحب کلکٹر۔ ڈیڑھ دو برس! ہم سے نوبل صاحب نے کہا اگر وہ ولایت جانے پر مجبور نہ ہوتے تو آخر سال تک بہ ہمہ وجوہ طے کر دیتے۔

سررشتہ دار۔ بے شک، صاحب بہادر رہتے تو ایسا ہی ہوتا۔

صاحب کلکٹر۔ نوبل صاحب نے ہم سے کہا کہ بہت تھوڑے مقدمے فیصلہ کرنے کو ہیں اور ابن‌الوقت صاحب ان میں کاروائی کر رہے ہیں اور ان کے تصفیے میں زیادہ دیر نہیں ہو گی۔ بڑا کام مثلوں کو مرتب کر کے داخل

دفتر کرنا ہے - اسی سبب سے ہم نے ایک محرر کی تخفیف کا بھی حکم نہیں دیا - اگر عملے یہ سمجھ کر کہ نوبل صاحب نہیں ہیں کام میں غفلت یا کاہلی کریں گے تو ہم اُن کی سخت سزا کرنے کو موجود ہیں مگر کام ضرور آخر سال تک تمام کرنا ہوگا -

سررشتہ دار - عملوں میں تو کسی کی مجال نہیں کہ سرمو حکم کے خلاف کر سکے بلکہ اگر حضور کا ارشاد ہوگا تو صبح سے شام تک اُن سے محنت لی جائے گی -

صاحب کلکٹر - بس تو مثلوں کی ترتیب عملے کا کام ہے -

سررشتہ دار - بغاوت کا عملہ فدوی ہی کا رکھوایا ہوا ہے - جب یہ محکمہ قائم ہونے لگا تو عملے ڈھونڈے نہیں ملتے تھے؛ جناب نوبل صاحب بہادر نے فدوی کو حکم دیا تو فدوی نے چُن چُن کر اچھے ہوشیار عملے جمع کر دیے اور فدوی کو بہ خوبی معلوم ہے کہ عملوں میں سے کسی کا کام پس ماندہ نہیں - مثلوں میں بڑی فروگزاشت دستخط کی ہے؛ حضور خیال فرمائیں کہ تاوقتے کہ حاکم متوجہ نہ ہو، دستخط کی تکمیل نہیں ہو سکتی -

صاحب کلکٹر - عملوں نے وقتاً فوقتاً احکام پر دستخط کیوں نہیں کرائے، یہ اُن کا قصور ہے - اچھا اُن سے جواب لے کر پیش کرو، ہم تمام عملۂ بغاوت کی سزا کریں گے -

سررشتہ دار - حضور مالک اور خاوند ہیں، فدوی کو جب اس کا علم ہوا تو فدوی نے عملے کو بہت دھمکایا تھا - حقیقت حال کا عرض نہ کرنا بھی نمک حرامی ہے؛ کہنے لگے کہ کیا جان غضب میں ہے کہیں تو ماں ماری جائے،

نہیں باپ، کتّا کہائے ۔ سر رشتہ دار صاحب! ہمارے ڈپٹی صاحب (ابن الوقت) سے کام پڑے تو معلوم ہو، نہ آن کے آنے کا ٹھکانا، نہ بیٹھنے کا ٹھکانا، نہ کچہری برخاست کرنے کا ٹھکانا؛ دستخط کرانا تو بڑی بات ہے، سلام کے لیے سامنے جانے کے لیے بھی بڑا حوصلہ چاہیے ۔

صاحب کلکٹر۔ کیا بات ہے، آخر ہندوستانی عملے صاحب لوگوں کی پیشی میں بھی کام کرتے ہیں یا نہیں ؟

سر رشتہ دار۔ صاحب لوگ اگر اس طرح قہر کی نظر رکھیں تو ایک دن کام نہ چلے۔ کام کے لیے کسی وقت ناخوش بھی ہوتے ہیں اور پھر دَیا* بھی کرتے ہیں ؟

صاحب کلکٹر ۔ تم بھی کبھی ابن الوقت صاحب کی ملاقات کو گئے ہو ؟

سر رشتہ دار ۔ میں بے چارہ محرّر، میری کیا اوقات، راہ میں آمنا سامنا ہوا سلام کر لیا ۔

صاحب کلکٹر۔ تم کبھی ابن الوقت صاحب کے بنگلے پر نہیں گئے ؟

سر رشتہ دار ۔ دو چار بار دل میں آیا پر سنا کہ اول تو اپنی وضع کے لوگوں کے سوائے کسی ہندوستانی سے نہیں ملتے اور ملتے بھی ہیں تو گھنٹوں انتظار کراتے ہیں۔ کچہری کے دنوں میں تو کہیں آنا جانا ہو ہی نہیں سکتا؛ رہا اتوار ایک دن اور اسی میں اپنا اور گھر کا سارا کام کاج ۔

صاحب کلکٹر ۔ اوہو! ابن الوقت صاحب نے اس قدر اپنی شان بڑھا رکھی ہے ۔

---

* رحم ۔

سررشتہ دار۔ اُن کے شاہانہ خرچ ہیں؛ ہندوستانیوں کا تو کیا مقدور ہے صاحب لوگ بھی اس طرح بے دریغ نہیں خرچ کر سکتے۔ ایک ہمارے جنٹ صاحب ہیں، ڈپٹی صاحب سے چوگنی تنخواہ پاتے ہیں، دو گھوڑوں سے زیادہ نہیں رکھ سکتے۔ ایک گھوڑا میم صاحب کی سواری میں رہتا ہے؛ آن کی اپنی سواری کا گھوڑا کچھ بیمار ہو گیا تھا تو اس گرمی میں پیدل کچہری آتے تھے۔

صاحب کلکٹر۔ کیا ابن الوقت صاحب گھر کے بڑے امیر ہیں؟

سررشتہ دار۔ ان کا خاندان تو مسلمانوں کے پادریوں کا خاندان ہے، یہ اپنی ذات سے ایک بیگم کے مختار تھے۔ بیگم صاحب قلعے کے باہر کشمیری دروازے رہتی تھیں، غدر ہوا تو حکم دیا کہ تمام مال و اسباب قلعے پہنچوا دو؛ اہتمام کرنے والے ہمارے ڈپٹی صاحب۔ سنا ہے کچھ کاٹھ کباڑ تو قلعے پہنچا، باقی اُنھوں نے سب اپنے یہاں ڈھلوا منگوایا۔ اتنے میں بیگم صاحب مر گئیں، سارا اثاثہ جہاں کا تہاں رہ گیا۔

صاحب کلکٹر۔ اگر ایسا ہوا تو بڑی نمک حرامی کی بات ہے اور میں کبھی خیال نہیں کر سکتا کہ ایسے شخص نے سچے دل سے نوبل صاحب کی جان بچائی ہو گی۔

سررشتہ دار۔ صاحب بہادر کی قسمت اچھی تھی کہ سرکار کی طرف کی کوئی لڑائی نہیں بگڑی ورنہ مسلمان کسی دوسرے مذہب کے آدمی کو دیکھ نہیں سکتے۔ انگریز تو خیر بھلا نئے آئے ہوئے ہیں ہم ہندوؤں کو ان کے ساتھ رہتے ہوئے سینکڑوں

برس ہو گئے اور اب اُن کا بس چلے تو ایک ہندو کو جیتا نہ چھوڑیں ۔

صاحب کلکٹر ۔ اگر واقع میں نوبل صاحب کی ،ان کو نیک ارادے سے بچایا تو اُس کا یہ صلہ کچھ کم نہیں تھا کہ سرکار نے اُن کی اور ان کے تمام خاندان کی جان بخشی کی اور ان کے گھروں کو لٹنے نہیں دیا یا خیر! زمینداری تک کا بھی مضایقہ نہیں لیکن ایسے شخص کو ایک حکومت کا عہدہ دینا میرے نزدیک شاید بالکل خلاف مصلحت ہوا ۔ کیوں سررشتہ دار، لوگ کیا خیال کرتے ہیں؟

سررشتہ دار ۔ ڈپٹی کلکٹری تو اُن سے ایک دن نہ چلتی مگر نوبل صاحب بہادر کی پرورش سے سارے کام سدھ ہوتے گئے؛ اب ذرا مشکل پڑے گی عملہ ناراض، اہل معاملہ شاکی ۔

صاحب کلکٹر ۔ لوگوں کی نا رضامندی کا اصل سبب کیا ہے؟

سررشتہ دار ۔ عملے تو سخت گیری اور بد زبانی سے ناراض ہیں اور کام بھی وقت پر نہیں نکلتا ۔ اہل معاملہ دیر کی وجہ سے نالاں ہیں؛ مہینوں لوگ پڑے جھولتے ہیں، تب بہ مشکل چھٹکارا ملتا ہے ۔

صاحب کلکٹر ۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابن الوقت صاحب کھیل تماشے میں بہت لگے رہتے ہیں ۔

سررشتہ دار ۔ یہ بھی ہے اور لوگ کچھ اور بھی کہتے ہیں ۔ یہاں سے جو کبھی کوئی کاغذ طلب کیا گیا تو اکثر یہی جواب آیا کہ ڈپٹی صاحب کے بنچ پر ہے، ابھی حکم اخیر شامل مثل نہیں ہوا ۔

صاحب کلکٹر۔ اب ڈپٹی صاحب کے شاهانه خرچ کے لیے کسی آمدنی کا تلاش کرنا ضرور نہیں، اُنھوں نے بہت کچھ کما لیا هو گا۔

سر رشته دار۔ اگر کمایا هے تو پھر اتنا کمایا هے که اس سے چہار چند خرچ بھی رکھیں تو اُن کو کسی طرح کی کمی نہیں۔

صاحب کلکٹر۔ تعجّب هے که کوئی نالش کیوں نہیں دائر هوئی!

سر رشته دار۔ نوبل صاحب کے ڈر سے کسی نے دم نہیں مارا، اب دیکھا چاهیے ڈپٹی صاحب بھی متردّد تو معلوم هوتے هیں۔

صاحب کلکٹر۔ خیر اب کام کا کیا انتظام کرنا هوگا۔

سر رشته دار۔ فدوی کے نزدیک تو مناسب یه هے که ڈپٹی صاحب کو تو صرف مثلوں کی تکمیل پر چھوڑ دیا جائے کیونکه یه بھی بڑا بھاری کام هے اور باقی مانده مقدمات کو حضور اپنے اجلاس میں منتقل فرما لیں یا کسی حاکم ماتحت کو دے دیں۔ منشی رام سیوک صاحب کی اجلاس میں بھی کام کی کمی هے۔ حضور کو معلوم هے که منشی صاحب کیسے زبردست کام کرنے والے هیں۔ اُن کا اهلمد کہتا تھا که همارے منشی جی مقدمے فیصله نہیں کرتے پھانکتے هیں؛ بغاوت کے مقدمات بہت هوں گے هزار هو نگے، منشی صاحب کی تو تین حد چار مہینے کی چٹنی هے۔

صاحب کلکٹر۔ اچھا ایک روبکار لکھ دو۔

سررشته دار نے وهیں کھڑے کھڑے دو سطری روبکار

لکھ، دستخط کرا چپڑاسی کے ہاتھ سررشتے میں بھیج دیا۔ صاحب کلکٹر نے روبکار پر دستخط کرتے وقت پھر فرمایا کہ تم محکمۂ بغاوت کی خوب نگرانی رکھنا۔

سررشتہ دار۔ فدوی بہ خوبی نگرانی رکھے گا اور کارگزاری کا ہفت روزہ حضور کے ملاحظے میں گزران دیا کرے گا لیکن حضور عندالملاقات ڈپٹی صاحب کو ذرا سا ایما فرمادیں گے تو اُن کو بھی خیال ہو جائے گا۔

صاحب کلکٹر۔ سرکاری کام کے لیے ہم کو زبانی کہنا کیا ضرور ہے، تحریری حکم دینا چاہیے۔

صاحب کلکٹر تو کبھی ایک بجے ڈیڑھ بجے کچہری آتے تھے۔ سررشتہ دار رپورٹ خوانی کرکے کوئی گیارہ بجتے بجتے کچہری پہنچا؛ یا تو ایک دن لکھنو کے بیلی گارڈ میں جنرل اوٹرم کا استقبال ہوا تھا یا آج سررشتہ دار کی بہلی دور سے آتی دیکھ کلکٹری فوجداری کا سارا عملہ باہر نکل پڑا۔ سررشتہ دار جو اپنی لٹّودار پگڑی سنبھالتے ہوئے اترے، دیکھا کہ ساری ذُرّیات موجود ہے؛ بہت بگڑے کہ آج کل کے لونڈوں کو جو ذرا بدھ چھو گئی ہو، کیا بندر بندریا کا ناچ ہے؟ نام بنام کیفیت پیش کرکے ایک ایک پر جرمانہ کراؤں تو سہی۔

ابن الوقت کی ہوا تو روبکار جائزہ ہی سے اُکھڑ گئی تھی، آج مقدمات متدائرہ کے چھن جانے سے لوگوں کی نظر میں اُس کی بات اور بھی دو کوڑی کی ہو گئی۔ روبکار میں لکھا تھا کہ مقدمات متدائرہ بلا کاروائی مزید سپرد اجلاس ھذا کیے جائیں۔ ابن الوقت نے اُس پر اتنا تو لکھوا دیا کہ صاحب کلکٹر بہادر کے حکم کی تعمیل کی جائے اور پھر اس سے اجلاس

پر بیٹھا نہ گیا ، اپنے پرائیویٹ روم میں جا کر چاھا کہ اخبار سے جی بہلائے مگر طبیعت کو حاضر نہ پایا ۔ نوبل صاحب کے وقت میں گھر کی حکومت تھی ؛ اس نے جانا ھی نہیں کہ نوکری کیا چیز ہے اور ماتحتی کس کو کہتے ھیں ۔ اب جو خلاف مزاج باتیں پیش آنی شروع ھوئیں تو اُس کو حیرت تھی کہ کلکٹر صاحب بر سر پرخاش ھیں یا عجلت کی غرض سے یا محکمۂ بغاوت میں اپنی کارگزاری ثابت کرنے کے لیے مقدمات کو اپنے اجلاس میں منتقل کرا لیا ہے ۔ جہاں تک خیال کرتا تھا صاحب کلکٹر کی خصومت کی کوئی وجہ اُس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی اور کیوں کر آتی ! اس معاملے میں اُس کی سمجھ بھی اوندھی تھی ۔ ھر چند اُس کا عہدہ ڈپٹی کلکٹری کا تھا مگر اُس نے ابتدائے تقرر سے محکمۂ بغاوت میں نوبل صاحب کے نیچے کام کیا ، اس کو من حیث الخدمت حکّام مال سے کسی طرح کا سروکار نہ تھا ؛ اُن کا کام الگ ، اس کا الگ ۔ غرض کچھ تو بے تعلقی اور کچھ پاس وضع (جدید) وہ اُن سب سے رہتا تھا بیگانہ وار اور یہ خبر نہ تھی کہ تقدیر یوں دفعۃً پلٹا کھا جائے گی ۔ خلاصہ یہ کہ اُس نے کلکٹر یا جنٹ یا اسسٹنٹ کسی سے رسم و راہ پیدا کرنے یا بڑھانے کا مطلق اهتمام نہیں کیا اور نہ کبھی اُس کے ذھن میں گزرا کہ حکّام وقت سے کسی صیغے کے کیوں نہ ھوں ، معرفت رکھنا معنًی داخل فرائض منصبی ہے ۔

ھندوستانی کے لیے ڈپٹی کلکٹری اور صدر الصدوری دو ھی جلیل خدمتیں ھیں ۔ ھم نے تو جتنے سر بر آوردہ ڈپٹی کلکٹر یا صدرالصدور دیکھے سب کا یہی دستور دیکھا کہ کلکٹر تو کلکٹر پادری اور ڈاکٹر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس اور انسپکٹر مدارس

اور پوسٹ ماسٹر اور مہتمم خزانہ غرض کوئی انگریز ہو بڑا یا چھوٹا متعہّد یا غیر متعہّد اور ملاقات ہو یا نہ ہو بالالتزام مہینے میں دو بار ، چار بار اُس کے بنگلے پر حاضری دے آنا ضرور ۔ ابن الوقت کو صاحب کلکٹر کی خصوصیت کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی ؛ سو ایک بڑی وجہ تو اس کی بیگانگی ھی تھی ، نہ صرف صاحب کلکٹر سے ، بلکہ نوبل صاحب کے سوائے گویا تمام حکّام ضلع سے ، یہاں تک کہ اُس وقت حکّام مال میں کوئی متنفس اُس کا اتنا بھی رفیق نہ تھا کہ صاحب کلکٹر سے ذکر آ جائے تو اُس کے حق میں کلمۃ الخیر کہہ گزرے۔ جو شخص انگریزوں سے دل میں اکڑ رکھتا ہو ، ھندوستانیوں کو وہ کیا مال موجود سمجھ سکتا ھے ۔ ابن الوقت نے اُن کی استمالت کی ذرا بھی تو پروا نہ کی ، ساری کلکٹری ، فوجداری ایک طرف تھی اور اکیلا ابن الوقت ایک طرف ؛ کسی سے کچھ چھینا نہیں ، کسی کا کچھ بگاڑا نہیں ، تبدیل وضع کی وجہ سے سب کے ساتھ خدا واسطے کا بَیر ۔

غرض ابن الوقت نے جوں توں پرائیویٹ روم میں اکیلے پڑے پڑے وہ دن تو تیر کیا ۔ اُس نے کئی بار عملے سے پوچھوایا بھی کہ اگر ھمارے کرنے کا کچھ کام ہو تو ہم اجلاس پر آئیں۔ عملے نے یہی جواب دیا کہ سررشتہ دار صاحب مقدمات متدائرہ کے لیے بہت جلدی مچا رہے ھیں ، ھم سب کے سب اُنھیں مثلوں کے چھانٹنے میں مصروف ھیں اور سرکار کے کرنے کا کام اب رہ بھی کیا گیا ھے ؟ یہ مثلیں کلکٹر صاحب کی اجلاس میں جا لیں گی تب دفتر کے داخلے کے لیے مثلوں کی ترتیب شروع ہوگی ؛ اُس وقت اگر احکام ترتیبی پر کہیں دست خط رہ گئے ہوں گے ، ایسے کاغذ علحٰدہ رکھتے جائیں گے ، بہت سے کاغذ

جمع ہو گئے دستخط کرا لیے۔

ابن الوقت کی خود داری نے اُس کے حق میں ایک خرابی یہ اَور کر رکھی تھی کہ وہ ہندوستانیوں کے ساتھ ملنے میں مضائقہ تو کرتا ہی تھا؛ اس سے ہر شخص اُس کے پاس جاتا ہوا جھجکتا تھا اورآجکل جو کارروائیاں در پردہ اُس کے خلاف ہو رہی تھیں وہ اُن سے مطلقاً بے خبر تھا۔ نوبل صاحب کے چلے جانے کا ایک اثر یہ تو ضرور اُس پر بھی منکشف ہوا کہ جو لوگ اُس سے ملتے جلتے رہتے تھے (اور وہ تھے ہی کتنے) پہلے ہی دن سے ملاقات میں کمی سی کرنے لگے اور اب جو یہ خبر منتشر ہوئی کہ تمام مقدمات متدائرہ صاحب کلکٹر نے اٹھوا منگوائے، لوگوں نے اس خیال سے کہ مبادا صاحب کلکٹر دیکھ پائیں یا اُن تک خبر پہنچ جائے، اس کی کچہری کا آنا جانا تک بالکل ترک کر دیا۔ ابن الوقت کے جی میں آیا بھی کہ چلوں صاحب کلکٹر سے زبانی کہوں یا چٹھی لکھوں، پھر سوچا اور ٹھیک سوچا کہ ابھی تک مجھ کو شکایت کرنے کی کوئی وجہ نہیں؛ مقدمات منگوا لیے، درد سر کم تر بہ! کچھ میری تنخواہ تو نہیں گھٹا دی، جاگیر تو نہیں ضبط کر لی، رہا لوگوں کا خیال سو انھوں نے تبدیل وضع پر مجھ کو کیا کچھ نہیں کہا اور اب تک کیا کچھ نہیں کہتے، میرا ذاتی تعزّز جو ہے سو ہے۔

فصل نوزدھم

صاحب کلکٹر اور ابن الوقت کا بگاڑ

ھندی کی ایک مثل ھے 'دکھتے چوٹ کٹونڈے بھینٹ'،
رپورٹ خوانی میں سررشتہ دار ابن الوقت کی طرف سے۔ صاحب
کلکٹر کے کان بھر ھی چکا تھا؛ سوء اتفاق سے آج ھی شام
کو ناگہانی گویا اسی مثل کے سچ کرنے کو ابن الوقت
کی صاحب کلکٹر سے مٹھ بھیڑ بھی ھو گئی۔ ابن الوقت کی
عادت دونوں وقت ھوا خوری کی تو تھی ھی، کوئی ساڑھے
پانچ بجتے بجتے کچہری سے سوار ھوا تو سیدھا میرٹھ کی
سڑک کو ھو لیا۔ آفتاب تھا پس پشت اور ٹھنڈی ٹھنڈی پوروا
ھوا سامنے سے آرھی تھی۔ شاہ درے سے بھی کوئی کوس
ڈیڑھ کوس آگے نکل گیا تھا کہ آفتاب نیچے لٹک آیا۔ چاندنی
رات کے خیال سے دل تو ابھی لوٹنے کو نہیں چاھتا تھا مگر
جمنا پر کشتیوں کا پل تھا؛ یہ تصور ھوا ایسا نہ ھو
تاریکی میں گھوڑے کا پاؤں کہیں کسی گڑھے میں جا رھے،
ناچار لوٹا تو جس وقت زینۃ المساجد کے برابر آیا، نمازی مغرب
کی نمازیں پڑھ پڑھ کر مسجد سے نکل رھے تھے۔ دریا گنج
کے نکڑ پر دور سے اس کو ایسا دکھائی دیا کہ بیچ
سڑک میں کوئی انگریز اکیلا پن چکیوں کی طرف کو چلا
جارھا ھے، پچیس تیس قدم کا فاصلہ ھوگا کہ وہ انگریز پیچھے
سے ٹاپ کی آواز سن کر کنارے ھو گیا۔ ابن الوقت برابر سے
نکلا تو پہچانا کہ صاحب کلکٹر ھیں۔ باگ روک کر اس

نے خود کہا ”آہا مسٹر شارپ! گڈ ایوننگ[1] ٹو یو۔ مجھے خیال نہیں تھا کہ اس وقت آپ اس سڑک پر ملیں گے۔ اگر آپ منظور کریں تو میرا گھوڑا حاضر ہے“۔

صاحب کلکٹر۔ میں پیادہ پا چلنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔

ابن الوقت۔ آپ میری اس گستاخی کو معاف فرماویں کہ آپ پیادہ پا ہیں اور میں سوار ہوں۔ یہ جانور اس قدر تیز ہے کہ اگر میں اترلوں تو یہ ضرور قابو سے باہر ہو جائے گا۔ آپ نے شاید اس کا نام سنا ہو، ایرو[2] یہی ہے جس نے میرٹھ کی گھڑ دوڑ میں بڑا نام پایا تھا۔ میں نے اس کو سو گنی[3] دے کر مول لیا ہے۔

صاحب کلکٹر۔ میں جانتا ہوں ایسا قیمتی گھوڑا سٹیشن میں شاید کسی پاس نہ ہوگا۔

ابن الوقت۔ میں بھی ایسا ہی خیال کرتا ہوں۔ میں دریا پار کچھ دور تک چلا گیا تھا۔ شام کی ہوا خوری کے لیے میں اس سمت کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔ قرب دریا کی وجہ سے خوب خنکی ہوتی ہے اور سبزہ بھی اس طرف بہ کثرت ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ آپ نے بھی دریا کے پار دور دور سیر کی ہوگی۔

صاحب کلکٹر۔ چلنے پھرنے کے لیے مجھ کو جس قدر وقت ملتا ہے اور وہ بہت تھوڑا ہے، میں اس کو اپنے ہی ضلع میں صرف کرنا چاہتا ہوں؛ اس سے میری آگہی اپنے علاقے سے بڑھتی ہے۔

۱۔ انگریزوں میں شام کا سلام۔
۲۔ ایرو انگریزی میں تیر کو کہتے ہیں۔
۳۔ گنی انگریزی اشرفی۔

ابن الوقت ـ اگر بے موقع نہ ہو تو میں آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ اب میرے پاس کچھ کام نہیں ہے ـ

ابن الوقت جواب کا منتظر رہا مگر صاحب کلکٹر نے کچھ جواب نہ دیا تو پھر اس نے کہا کہ تمام مقدمات متدائرہ قریب تکمیل ہیں ـ میں سب میں کاروائی کر چکا ہوں اگر . . . . :

صاحب کلکٹر ـ آپ کیوں سوکھے پتّوں اور کانٹوں کو یاد کرتے ہیں، جب کہ باغ کی ساری بہار آپ ہی کے حصّے میں تھی ـ

ابن الوقت نے اپنی طرف سے بہتیری کوشش کی مگر صاحب کلکٹر کسی طرح نہ کھلے، تا ہم دل کی کدورت بلکہ بد گمانی بھی اُن کی باتوں سے مترشح تھی ـ ابن الوقت تو اس مزاج کا آدمی نہ تھا کہ بات کو لٹکا رکھے مگر موقع ہی بونگا آپڑا تھا کہ صاحب کلکٹر پیدل اور یہ سوار، اُتر نہیں سکتا معذوری ہے، برابر نہیں چل سکتا بے ادبی ہے، آگے نہیں بڑھ سکتا بے تمیزی ہے، پیچھے نہیں ہٹ سکتا بے عزتی ہے، 'نہ پائے رفتن نہ روئے ماندن' ـ آخر وہ یہ کہ کر الگ ہو گیا کہ میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں، قلعے میں ایک دوست اس وقت میرے منتظر ہوں گے ـ

رات میں اور پھر صبح سے کچہری کے وقت تک ابن الوقت کو کئی دفعہ صاحب کلکٹر کی باتوں کا خیال آیا، آخر یہی رائے قرار پائی کہ جب تک صاحب کلکٹر کی طرف سے ضابطے کی چھیڑ چھاڑ نہ ہو اُن کی بد گمانی یا رنجش کو منہ سے بھی کیوں نکالو؛ نا حق کہنے کی گنجائش ہو جائے گی کہ چور کی ڈاڑھی میں تنکا ـ اُدھر

صاحب کلکٹر کے یہاں بھی مادہ تیار تھا۔ اگلے دن جوں کچہری پہنچا، میز پر صاحب کلکٹر کا روبکار رکھا ہوا تھا کہ کل شام کے وقت این جانب دریا گنج کی سڑک پر پیادہ پا چلے آتے تھے، ڈپٹی ابن الوقت صاحب گھوڑے پر سوار پیچھے سے این جانب کے برابر آ کر باتیں کرنے لگے، ڈپٹی صاحب سے اس گستاخی کا جواب طلب ہو۔

دفعہ ۲۔ ڈپٹی صاحب بلا اجازت و اطلاع این جانب دریا پار ضلع میرٹھ میں گئے اور اُن کے بیان سے معلوم ہوا کہ اکثر جاتے رہتے ہیں۔ اس فعل کے جواز کی سند اُن سے پوچھی جائے۔

دفعہ ۳۔ جتنی بار ڈپٹی صاحب کا عبور پل دریائے جمن پر سے ہوا ہے حساب کر کے محصول بھیج دیں کیوں کہ این جانب یقین نہیں کرتے کہ ڈپٹی صاحب نے کبھی محصول دیا ہو۔

آج عملوں میں بڑی کھچڑی پک رہی تھی کہ دیکھیں ڈپٹی صاحب اس روبکار پر کیا کرتے ہیں؛ بعض کہتے تھے کہ بس اب نہیں ٹھہرتے، استعفا تو کیا دیں گے مگر رخصت لے کر گھر بیٹھ رہیں، نوبل صاحب پاس ولایت چلے جائیں یا شاید دوڑ دھوپ کر کے کہیں کی بدلی کرالیں، کوئی یہ سمجھتا تھا کہ بہت انگریزوں سے ملاقات ہے، کسی کو بیچ میں ڈال کر صفائی کر لیں گے، کوئی یہ رائے بھی دیتا تھا کہ بھلے سے ہوں تو اب بھول کر بھی انگریزی وضع کا نام نہ لیں، وہ کوٹ پتلون کم بخت کس کام آرہا ہے، دین بھی گیا اور دنیا بھی برباد ہوئی، غرض جتنے منہ آتنی باتیں۔

ابن الوقت کو ایک امر کی طرف سے تو اطمینان ہوا کہ صاحب کلکٹر کا مافی الضمیر جلد منکشف ہو گیا۔ اب مقدمات کے اٹھوا منگوانے کی وجہ بھی سمجھ میں آئی اور دریا گنج کی سڑک پر جو آ کھڑی باتیں اُنھوں نے کی تھیں اُن کی بھی

بدھ مل گئی۔ ابن الوقت نے فوراً ایک چٹھی صاحب کلکٹر کو لکھی ''قبل' اس کے کہ میں ضابطے کے مطابق آپ کے روبکار کا جواب دوں اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ براہ مہربانی مجھ کو ضابطے کا جواب دینے پر مجبور نہیں کریں گے، میں بہ منت آپ سے التماس کرتا ہوں کہ مجھ کو اپنی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت دیجیے تاکہ میں بالمشافہ آپ کے تمام شبہات کو رفع کر دوں۔ آپ کو میرے معاملے میں کسی وجہ سے غلطی واقع ہوئی ھے اور اجنبیت کی حالت میں غلطی کا ہونا کچھ تعجب کی بات نہیں اور مجھ کو کامل یقین ھے کہ جب پوست کندہ حقیقت آپ پر ظاہر کی جائے گی آپ کا دل میری طرف سے ضرور صاف ہو جائے گا۔ میری بد قسمتی ھے کہ صرف انگریزی وضع کے سبب لوگ مجھ سے ناحق دشمنی رکھتے ھیں اور میرے حاسد بھی کم نہیں، پس بہت تھوڑی توقع ھے کہ لوگ بھلائی کے ساتھ میرا تذکرہ کریں۔ میں آپ سے رعایت کی درخواست نہیں رکھتا بلکہ انصاف چاھتا ہوں اور اگر از روئے انصاف میں آپ کی مہربانی کا مستحق نہ ثابت ہوں تو اس بے عزّتی سے جو حاکم بالادست کی ناخوشی کا ضروری نتیجہ ھے بہت بہتر ہوگا کہ میں خود کام سے علحدگی اختیار کروں۔ آپ خیال فرما سکتے ھیں کہ قطع نظر روحی تکلیف کے جو مجھ پر گزر رھی ھے، اس حالت سے میرا رھنا کار سرکار کے حق میں کسی طرح بھی مفید نہیں''۔

صاحب کلکٹر کا مزاج ابن الوقت کی طرف سے اس قدر برھم تھا کہ انھوں نے بہ استکراہ تمام اسی کی چٹھی کے لفافے پر پنسل سے لکھ دیا کہ میں کسی نیٹو کو اپنی کوٹھی پر انگریزی وضع سے دیکھنا نہیں چاھتا۔ اس پر بھی ابن الوقت نے دو دن تک روبکار

کو بلا جواب ڈال رکھا ۔ تیسرے دن تقاضے کا روبکار آ دھمکا به این شدّت که کچہری بر‌خاست کرنے سے پہلے جواب نہیں دیں گے تو ضابطے کی کاروائی کی جائے گی ۔ اب چار و ناچار جواب دینا ھی پڑا ۔

صاحب کلکٹر کے اعتراض اُن کی یا اُن کے سررشته دار کی نظر میں کچھ وقعت رکھتے ھوں گے ، ابن الوقت نے ایسے دندان شکن جواب دیے که اپنا سا منه لے کر رہ گئے ۔ اُس نے لکھا که صاحب کلکٹر بہادر به حیثیت منصبی مستحق ادب ھیں' جس کے یه معنے ھیں که حکّام ماتحت اُن کے احکام جائزه کی تعمیل کریں اورجس ملاقات کے صاحب کلکٹر بہادر شاکی ھیں ، حیثیت منصبی سے کچھ علاقه نہیں رکھتی ۔ مجھ کو صاحب بہادر غروب آفتاب کے بعد یکایک دریا گنج کے نکّڑ پر ملے اور میں نے جب تک برابر نہیں آگیا' صاحب بہادر کو ھرگز نہیں پہچانا ۔ پہچاننے کے بعد میں نے خلاف شیوه اھلیّت سمجھا که بدون صاحب سلامت کیے چلا جاؤں اور صاحب سلامت کے بعد دفع مظنّه اجنبیت کے لیے ایک دو بات کا کرنا بھی ضرور تھا ۔ میں اس قصور کا معترف ، اس پر نادم اور اسکی معافی کا خواستگار ھوں ۔

دفعه ۲ ۔ میرٹھ کا ضلع شہر دھلی کی فصیل سے ملحق ھے ۔ میں ھوا خوری کے لیے اکثر دریا پار گیا ھوں ۔ کوئی حکم ممانعت میری نظر سے نہیں گزرا اور نه سرکار کا اس میں کوئی مفاد ھے که عہده داروں کو نظر بند رکھے ۔ اگر فی الوقع کسی حکم میں اس طرح کی قید ھے تو وه ناممکن التعمیل اور بے فائده ھونے کی وجه سے قابل منسوخی ھے ۔

دفعه ۳ ۔ شاید صاحب کلکٹر بہادر کو خیال نہیں رھا که فری فنڈ* فوجداری سے متعلق ھے ورنه اجلاس کلکٹری سے

* محصول دریا کی آمدنی ۔

کارروائی نہ فرماتے۔ علاوہ بریں چوں کہ گھاٹ مستاجری ہے مطالبہ محصول حق مستاجر ہے''۔

قاعدہ ہے کہ غصّے میں انسان کی عقل ٹھکانے نہیں رہتی۔ اس جواب کو سن کر صاحب کلکٹر رپورٹ کرنے کو تیار ہوئے۔ بارے سر رشتہ دار نے سمجھایا ''حضور کیوں رپورٹ کریں حضور کی اتنی نارضامندی کافی ہے۔ اب ڈپٹی صاحب کا حال کیا ہے کہ کچہری کا کوئی مذکوری تک تو اُن کو سلام نہیں کرتا۔ اُن کی کچہری کی طرف کوئی جا کر نہیں پھٹکتا۔ جس شخص نے اس زلزلے کی حکومت کی ہو اُس کے حق میں یہ بے عزتی کچھ کم نہیں، صبح شام خود ڈپٹی صاحب کی طرف سے استعفٰی یا رخصت کی درخواست آنے والی ہے۔ حضور ذرا تامّل فرمائیں اور اگر رپورٹ ہی کرنی منظور ہے تو ایسی زبردست رپورٹ ہو کہ وار خالی نہ جائے، ڈپٹی صاحب کی جڑ بہت مضبوط ہے۔ نوبل صاحب بہادر نے تعریفیں لکھ کر اُن کی لیاقت اور دیانت حکّام صدر کے ذہن نشین کردی ہے۔ مثلیں داخل دفتر ہو رہی ہیں، فدوی عملوں کو اشارہ کر دے گا، ساتھ کے ساتھ بے ضابطگیاں چھانٹتے جائیں گے اور اس اثناء میں عجب نہیں ڈپٹی صاحب پر کچھ مقدمات بھی دائر ہو جائیں''۔

بارے سر رشتہ دار کے سمجھانے سے صاحب کلکٹر کا طیش فرو ہوا اور رپورٹ ملتوی رہی مگر لوگوں میں یہی مشہور تھا کہ روانہ ہو گئی۔ سر رشتہ دار سوذی اپنی طرف سے مقدمات کے دائر کرا دینے کی بہتیری کوشش کرتا تھا لیکن سچ کہا ہے ؎

تو پاک باش برادر مدار از کس باک
زنند جامۂ ناپاک گازراں بر سنگ

اس کچہری کا درودیوار تک ابن الوقت کا دشمن ہو رہا تھا مگر چوں کہ اُس کا معاملہ صاف تھا کسی کو اُس کے سامنے پڑنے کی جرات نہ ہوتی تھی اور یہ میرا شیر بدستور اُسی شان سے کچہری آتا تھا ۔ لوگ اُس سے بہ خوف کلکٹر کنیاتے تھے اور یہ بہ حقارت کسی طرف متوجہ نہیں ہوتا تھا ۔ غرض صاحب کلکٹر کی نارضا مندی کا اس کو افسوس تھا نہ ہراس، ملال تھا نہ خوف ۔ کام تو اُس سے بالکل چھین لیا گیا تھا، یہ اپنے ساتھ اخبار کا بنڈل لاتا اور فراغت سے بیٹھا پڑھتا ۔ با این همه صاحب کلکٹر کی طرف سے چھیڑ چھاڑ برابر چلی جاتی تھی ۔ اپنا ہی عملہ وقت کی ہوا دیکھ کر ایسا خود سر ہو گیا تھا کہ حکم کی تعمیل اور کام کو جاں فشانی کے ساتھ کرنا تو درکنار، پابندئی وقت تک کا لحاظ اُٹھا دیا تھا ۔ شاذ نادر کوئی دن خالی جاتا ہوگا کہ صاحب کلکٹر کے یہاں سے تاکیدی روبکار نہ آتا ہو اور تاکید بھی معمولی طور کی نہیں بلکہ اس قدر سختی اور بے تہذیبی کے ساتھ کہ کوئی جابر کوتوال کسی چوکی دار کو بھی ایسے الفاظ نہیں کہتا ۔ ادھر ابن الوقت اپنے عملے پر دباؤ ڈالتا تو کچھ موثّر نہیں ہوتا تھا اور ہو تو کیوں کر ہو؟ دوچار بار عملوں پر جرمانا کرکے دیکھا، سیدھے صاحب کلکٹر کی اجلاس پر گئے اور منسوخ کرا لائے ۔ چونکہ ہر طرح دق کرنا منظور تھا یہاں تک نوبت پہنچی کہ اجلاس کا کمرہ تک خالی کرا لیا؛ وہ جگہ شان دار اور آسائش کی تھی، اُس کے عوض میں کمرہ دیا گیا جس میں نہ دھوپ کی آڑ نہ بوچھاڑ کا بچاؤ اور عملہ ہے کہ سارے دن پتھر کی طرح چھاتی پر دھرا ہے ۔

اسی اثنا میں گم نام عرضیاں بھی گزرنی شروع ہو گئیں جن میں سخت گیری اور بے انصافی کی صراحتاً اور رشوت ستانی

کی کنایۃً شکایتیں مندرج تھیں۔ ان عرضیوں کا گزرنا صاحب کلکٹر کے لیے حجت ہو گیا ۔ سارے شہر میں ڈونڈی پٹی ، جگہ جگہ اشتہار آویزاں ہوئے کہ جس کو ڈپٹی ابن الوقت پر فریاد کرنی ہو بے تامّل صاحب کلکٹر بہادر کی اجلاس میں حاضر ہو۔ ادھر عملوں نے مثلوں کی خوب روئی دھنکی۔ غرض ابن الوقت پر دو سوا دو مہینے ہر چہار طرف سے ایسا نرغہ رہا کہ ہر روز اس کی موقوفی اور بدلی اور معطّلی اور سپردگیٔ فوجداری کی گرم خبر اڑتی تھی اور پھر آپ ھی آپ ٹھنڈی پڑ جاتی تھی ۔

جب زیادہ دن گذر گئے تو خود بہ خود لوگوں کے خیالات بدلنے سے لگے اور سمجھ گئے کہ بس کلکٹر سے اتنا ھی ہو سکتا تھا کہ کام نکال لیا، کمرہ چھین لیا دو چار اینڈے بینڈے روبکار لکھوادیے ، مگر واہ رے ڈپٹی صاحب ذرا جو آنکھ پر میل آیا ہو؛ کیوں نہ ہو مزاج میں اتنا طنطنہ رکھ لے تو حکومت کا نام لے ، کوٹ پتلون کی خوب شرم رکھی؛ پہلے تو اکثر ایک گھوڑے کی بگھی میں بھی آیا کرتے تھے جس دن سے کلکٹر کے ساتھ مورچہ لیا وہ دن اور آج کا دن جوڑی کے معمول کو ناغہ نہیں ہونے دیا ۔ انگریزوں کے سارے کام تڑ پڑ کے ہوتے ہیں؛ کلکٹر نے رپورٹ تو ضرور کی ھی ہو گی ، اب تک جو اس کا کچھ ظہور نہیں ہوا معلوم ہوتا ھے کہ صدر والوں نے مطلق لحاظ نہیں کیا ۔ ہاں صاحب نوبل صاحب کا بھی بڑا زبردست کھونٹا ھے اور چاھے مفصلات کے حکام قدر نہ کریں مگر غدر کی خیر خواھیاں سرکار کے دفتر میں چڑھ چکی ھیں، اُن کو کون میٹ سکتا ھے ۔ صاحب کلکٹر بہت بے جا اُلجھے ! یہ بھی اُنھوں نے لالہ بھائی ڈپٹی کلکٹر سمجھے ہوں گے کہ ذرا گُھورا اور سارے ڈر کے لگے گڑگڑانے بلکہ اُلٹا صاحب کلکٹر سے جواب طلب ہو تو تعجب نہیں اور ہوا ہو تو کس کو خبر ھے ؟

فصل بستم

ابن الوقت کی مالی مشکلات ۔

شروع سے سارا وبال ابن الوقت کے مال پر تھا ، کلکٹر صاحب کے بگاڑ میں بھی وہ کئی ہزار کے پھیر میں آ گیا ۔ ان کی نارضامندی کی ہوا کا پھوٹنا تھا کہ اگلے دن بلکہ شاید اسی دن خزانچی نے کہلا بھیجا کہ ایسا نہ ہو کہیں صاحب کلکٹر کے کان تک جا پہنچے ؛ ڈپٹی صاحب تو ٹھہرے برابر کی ٹکّر کے حاکم میری شامت آجائے گی حساب چکا دیں تو بڑی مہربانی کریں ۔ اگر صرف خزانچی کا دینا ہوتا تو کچھ ایسے تردّد کی بات نہ تھی ۔ ابن الوقت نے معمول یہ رکھا تھا کہ عین تقسیم تنخواہ کے وقت کچھ زیادہ درکار ہوا تو خزانچی سے منگوالیا ۔ پس ابن الوقت خیال کرتا تھا کہ خزانچی کے بہت اُڑ کر نکلیں گے تو مسا کر کے ہزار بارہ سو ، اس سے زیادہ نہیں ؛ مگر خزانچی کے تقاضے کے ساتھ اُس کے دل میں یہ خدشہ پیدا ہوا کہ اگر گڑ والے اپنے لینا مانگ بیٹھے تو بڑی مشکل ہو گی ، ان کا حساب کتاب کچھ نہ ہوگا تو بھی دس کے پیٹے میں دوچار سو اِدھر یا اُدھر ، اتنے کی سبیل سر دست کہاں سے کی جائے گی ؟ نوکری کا تو اب اتنا بھی بھروسا نہیں کہ دیکھیے مہینہ بھی پورا ہو یا نہ ہو اور مانا کہ رہی بھی تو ایسی متزلزل حالت میں تنخواہ پر مجھے کون قرض پکڑائے دیتا ہے ؛ اب رہا سازو سامان ، اس میں شک نہیں کہ عمدہ ہے ، نفیس ہے قیمتی ہے ، مگر خریدنے میں اور بیچنے میں بڑا بل پڑ جاتا ہے اور پھر بیچنا بھی میرا بیچنا ، خوش خرید کا تو کیا مذکور ہے نیلام کرنا چاہوں تو کلکٹر کے ڈر کے مارے کوئی

پاس آکر کھڑا نہ ہو۔ زمینداری کی گنجائش میں کچھ کلام نہیں؛ جنگل، باغات، درختان متفرق، سائر سوائے بہت سی رقمیں ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ دس ہزار تو جنگل اور سر درختی سے جھاڑ لوں گا مگر — ہا! انعام خیر خواہی، عطائے سرکار جس کی سند گورنمنٹ کی مہر سے مجھ کو ملی ہے، اُس کے تو ایک تنکے کا ضائع کرنا بھی بے جا اور بد نما اور نامناسب اور موجب بد نامی ہو گا۔ سب سے بہتر تدبیر یہ ہے کہ بن پڑے تو شہر کے مکانات کو الگ کرو کیوں کہ یہ مکانات اگرچہ فی نفسہٖ بہت اچھے ہیں، شاہ جہانی وقتوں کے بنے ہوئے، لداؤ کی چھتیں، چوڑے چوڑے آثار، اونچی کرسی، وسیع شان دار، مستحکم، پائدار کوئی غرض مند لینے والا ہو تو ایک خاص بازار والی بارہ دری سے گڑ والوں کا سارا قرضہ اُتر جائے؛ جب یہ مکان بنا ہو گا تو دس ہزار کا تو چونا اور پانی لگ گیا ہو گا، تہ خانوں کے روشن دانوں کی جالیاں ٹوٹ گئی تھیں تو پانچ سنگ تراشوں نے مرمر کے تین مہینے میں بنائیں اور تیس تیس روپے فی جالی لاگت آئی مگر مشکل یہ ہے کہ وہ مکان ہے مسلمان کے ڈھب کا اور مسلمانوں میں کوئی ایسا صاحب مقدور نظر نہیں آتا۔ بھائی حجّۃ الاسلام عن قریب پنشن لے کر خانہ نشین ہونے والے ہیں اور حج کے جانے سے پہلے ذکر آیا تھا تو کہتے بھی تھے کہ موروثی مکان میں میرا گذر ہونا دشوار ہے، کوئی موقع کا مکان معرض بیع میں ہو تو خیال رکھنا۔ وہ اس کو لے لیں تو سب سے بہتر بات ہے مگر اُن کے پلّے بھی دس ہزار کہاں سے آیا اور ہو بھی تو دس ہزار ایک مکان پر لگا دینا ایسا کیا آسان ہے اور پھر اُن کے ساتھ بات چیت کروں تو خدا جانے کتنے دن میں جا کر بات طے ہو، قیمت یک مشت دیں یا قسطیں ٹھہرائیں۔

آخر سوچ سمجھ کر ابن الوقت نے مولوی حجّۃ الاسلام کو لکھا مگر اس طور پر کہ مجھ کو شاید فوراً روپیہ درکار ہوا تو میں انتظار نہیں کر سکوں گا۔ ادھر اس نے کہا آؤ گڑ والوں کو ٹٹولو تو سہی۔ ایک آدمی کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ ڈپٹی صاحب نے اپنے حساب کی فرد مانگی ہے۔ آدمی کا پیغام پہنچانا تھا کہ گڑ والے تاڑ گئے۔ آدمی سے اتنا ہی کہا بہت خوب کل ہمارا مختار فرد لے کر حاضر ہو گا، اگلے دن خود لالہ تکوڑی مل* جا موجود ہوئے اور صاحب سلامت کے بعد پہلی بات انھوں نے یہی کی ''کیوں جناب ہم سے ایسا کون سا قصور سرزد ہوا کہ آپ نے فرد منگوا بھیجی، ہم کو آپ سے ایسی توقع نہ تھی۔ آپ نے ہم کو غیر بھی نہیں بلکہ دشمن سمجھا۔ ہم بھی آپ کی دیا سے بھگوان کی دی ہوئی عزّت اور ساکھ رکھتے ہیں۔ دنیا میں اونچ نیچ سبھی کے ساتھ لگی ہے ایسا لوبھ رکھیں تو ہماری بات دو کوڑی کی ہو جائے۔ ڈپٹی صاحب لوبھ سے دولت نہیں جمع ہوتی۔ ہم کو جو کچھ بھگوان نے دے رکھا ہے، بزرگوں کی نیّت کا پھل ہے۔ فرد کے عوض فارغ خطی حاضر ہے، جب بھگوان آپ کو اطمینان دے گا آپ آہستہ آہستہ ادا کر دینا لیکن اس وقت تو ہم آپ سے نہیں لے سکتے۔ بیاج بٹے کی آپ ذرا چنتا نہ کریں۔ ہم نے آپ کی بدولت قلعے سے بہت کچھ کمایا۔ ہم سے آنکھوں پر ٹھیکری نہیں دھری جاتی''۔

ابن الوقت۔ خزانچی . . . . .

تکوڑی مل۔ مجھ کو معلوم ہے کہ آپ کو خزانچی کا بھی کچھ دینا ہے اور مجھ کو یہ خبر بھی پہنچی ہے کہ انھوں نے

---

* تکوڑی اصل تین کوڑی تھا۔ ہندو جن کو اولاد کے جینے کے لالے ہوتے ہیں بچوں کے ایسے نام رکھ لیا کرتے ہیں۔ یہ شخص گڑ والوں کا گماشتہ ہو گا۔

اپنا لینا طلب کیا ہے یا طلب کرنے والے ہیں سو آپ کو تو بھگوان نے حاکم کیا ہے اپنا اپنا کرنا اپنا بھرنا ۔ اول تو وہ ٹھہرے نوکر دوسرے اُن کا جتنا بنج ہے سب سرکاری روپے سے ۔ اُن سے اتنی سہار نہیں ہو سکی آپ حکم دیں تو خزانچی کا حساب بھی چکتا کر دیا جائے ۔

ابن الوقت ۔ نہیں ، اُن کا حساب کچھ ایسا بہت نہیں ہے ۔ اُس کی سبیل یہیں سے کر دی جائے گی اور آپ سے فرد کے منگوانے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ سرکاری ملازم کو اپنے علاقے میں قرض لینے کی ممانعت ہے ۔ شروع شروع میں تو مجھ کو اس ممانعت کا علم نہ تھا ، علم ہوا تو میں نے کچھ پروا نہ کی ۔

تکوڑی مل ۔ آپ نے بھی بھلا اس کا خیال کیا ! ممانعت اگر ہے بھی تو کوئی اُس پر عمل تو کرتا کراتا نہیں ۔ صاحب کلکٹر اور جو چاہیں سو کریں ، اس بارے میں کان ہلائیں تو میرا ذمّہ ۔ وہ خود کب قرض سے بچے ہیں ۔ فوجی انگریزوں کی تو میں کہتا نہیں ، ملکی انگریز تو ایسا کوئی برلا ہی نکلے گا کہ دلّی میں اُس کو کام ملا ہو اور اُس کا نام آپ* کی کوٹھی کے بہی کھاتے میں نہ ہو اور نوکری تو آپ نے غدر کے پیچھے کی ہے ، ہمارا آپ کا لین دین بزرگوں کے وقت سے چلا آتا ہے ۔ پھر آپ کی نوکری دوسروں کے سرے کی نہیں ہے ۔ آپ ہی فرمائیں آپ کے سوائے کوئی اور بھی اپنے وطن میں حاکم ہے ۔ آپ کے ساتھ سرکار کی خاص رعایت ہے ۔ صاحب کلکٹر اگر اس کی چھیڑ نکالیں گے بھی تو کچھ ہوتا ہواتا نہیں ۔ اس بات کا تو میں بیمہ لیتا ہوں ۔

---

* مراد ہے اپنی کوٹھی ۔

فصل بست و یکم

ابن الوقت کی پھوپھی زاد بہن کے شوہر

حجۃالاسلام کی آمد آمد

۱۸۵۷ء کے غدر سے پہلے حجّۃ الاسلام حج کو گئے ہوئے تھے - غدر کی اُڑتی سی خبریں اُنھوں نے عرب میں سنیں - دلّی کو فتح ہوئے ایسے کوئی بیس بائیس دن ہوئے ہوں گے کہ یہ بمبئی واپس پہنچے ؛ یہاں غدر کے تفصیلی حالات معلوم ہوئے - رخصت میں اتنی گنجائش تھی کہ چاہتے تو دلّی ہو کر بلکہ فراغت سے مہینے سوا مہینے رہ کر اپنے کام پر جاتے مگر معلوم ہوا کہ ابھی جا بہ جا شورش ہے اور خاص کر دلّی کے مسلمانوں پر ایک طرح کا تشدّد ہو رہا ہے- یہ صلاح ٹھہری کہ سمندر سمندر مدراس ہوتے ہوئے کلکتے جائیں اور وہاں سے اپنے ضلع میں جا داخل ہوں -

غرض ابن الوقت کے حالات میں جو تبدّل واقع ہوا، حجّۃ الاسلام کی غیبت میں ہوا - دونوں میں رسم مراسلت بھی بس ایسی ہی تھی کہ کبھی اُوپر تلے کئی کئی خط آتے جاتے اور کبھی مہینوں نہ دارد - یوں تو ابن الوقت نے بڑے تپاک کے ساتھ حج سے مع الخیر واپس آنے کی مبارک باد کا خط لکھا ، اُدھر سے انعام خیرخواہی اور نوکری کی لمبی چوڑی تہنیت آئی مگر تبدیل وضع کے بارے میں ابن الوقت کی طرف سے تو کیا ابتدا ہوتی ، حجّۃ الاسلام نے بھی ایسی خاموشی اختیار کی کہ گویا خبر ہی نہیں- ابن الوقت

کی پھوپھی نے کئی بار داماد[1] کو لکھوا لکھوا بھیجا کہ لوگوں کے طعنوں مینوں نے زندگی دشوار کر دی ہے، اب محلے میں رہنے کا ذرا بھدرک نہیں؛ تم جس طرح ہو سکے تھوڑے ہی دن کے لیے آؤ اور ہم لوگوں کا کہیں ٹھکانا کرو مگر حجۃ الاسلام لطائف الحیل سے ٹالتا رہا۔

اپنوں میں اور غیروں میں اتنا ہی تو فرق ہوتا ہے کہ ابن الوقت کی تبدیل وضع سے جس کو لوگ اپنے پندار میں تبدیل مذہب سمجھتے تھے، خویش و بیگانے سبھی ناراض تھے لیکن اب جو مشہور ہوا کہ صاحب کلکٹر پیچھے پڑے ہیں تو غیر اکثر لگے شماتت کرنے اور اپنوں نے سُنا تو سب کے سب گھبرا کر ابن الوقت کی پھوپھی پاس دوڑے آئے کیوں کہ گھر میں سب سے بڑی بوڑھی وہی تھیں۔ رشتے ناتے کے علاوہ ابن الوقت کی خیرخواہی سے تھوڑے بہت فائدے بھی ان سب کو پہنچے تھے۔ غدر کے بعد کا وقت مسلمانوں پر ایسی سختی کا گزر گیا کہ کر تو ڈر اور نہ کر تو خدا کے غضب سے ڈر؛ ہزارہا ناکردہ گناہ بغاوت کی لپیٹ میں آ گئے الّا ابن الوقت کے رشتہ دار کہ اگر کسی نے جھوٹوں بھی ابن الوقت کا نام لے دیا تو کم سے کم اتنا تو ہوتا تھا کہ کوئی مخبر اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ابن الوقت اپنی ذات سے روکھا تھا، کُھرّا تھا، پھر بھی لوگوں کو اُس سے بڑی تقویت تھی۔ وہ کسی کا مقولہ بہت درست ہے «عند المصائب تذهل الاحقاد[2]» اب کسی کو اس کا مطلق خیال نہ تھا کہ ابن الوقت نے ترک اسلام کیا ہے یا وہ انگریزوں کے ساتھ کھاتا پیتا ہے یا

۱- یعنی حجۃ الاسلام۔

۲- مصیبت پڑے پر رنجشیں بھولی بسری ہو جاتی ہیں۔

قوم اور برادری اور گھر کو چھوڑ کر انگریزوں میں جا ملا ھے یا اُس نے بزرگوں کے نام کو بٹّا لگایا ھے یا اُس نے خاندان کی آبرو کو ملیا میٹ کر دیا ھے؛ سارے رنج و شکوے بھول بسر کر سب کو اسی کی پڑی تھی کہ کسی طرح ابن الوقت کو اس بلا سے نجات ھو۔ اُس کی پھوپھی تو اس طرح بین کر کر کے روتی تھیں جیسے کوئی مُردے کو روتا ھے مگر مُلّا کی دوڑ مسجد تک؛ سب نے مل کر منّتوں اور نیازوں اور چلّوں اور عملوں اور دعاؤں کی بھرمار کر دی اور ختم خواجگان[1] اور «لاالہ الاانت سبحانک انی کنت من الظالمین» اور «امن یجیب المضطر اذادعاہ و یکشف السوء» اور «فلم تقتلوھم و لکن اللہ قتلہم و مارمیت اذ رمیت و لکن اللہ رمی» اور «اللّھمّ انا نجعلک فی نحورھم و نعوذ بک من شرورھم»، حزب البحر اور دلائل الخیرات اور یٰسین اور صلواۃ الحاجۃ اور اعمال[2] حصراللسان کے حربے صاحب کلکٹر پر چلنے شروع ھوئے۔

دنیاوی تدبیروں میں سے تو اور کوئی تدبیر بن نہ پڑی مگر اس مرتبہ ابن الوقت کی پھوپھی نے داماد کو نہیں بلکہ بیٹی کو لکھوا دیا کہ دو مہینے پورے ھو کر یہ تیسرا لگا کہ دلّی کا سب سے بڑا انگریز نا ق، ناروا تمھارے بھائی ابن الوقت کے پیچھے پڑا ھے؛ تم کو معلوم ھے کنبے میں کوئی اس جوگا نہیں کہ اس مصیبت میں اُن کا ساتھ دے، میں تمھارے میاں کو لکھتے لکھتے تھک گئی، آنے کی حامی نہیں بھرے"، خدا کے لیے تم اُن کو سمجھا کر ساتھ لاؤ، کھانا وھاں کھاؤ تو پانی یہاں آ کر

۱- یہ سب دعائیں مشکل کے وقت اپنے اپنے طور پر پڑھی جاتی ھیں۔
۲- دشمن کا منہ کیلنے کی دعائیں۔

پیو، وقت نکل جائے گا اور بات رہ جائے گی ؛ بھلا اگر رشتے ناتے کا پاس نہ کرو تو اتنا ھی سمجھو، اگر خدانخواستہ اُس کے دشمنوں پر ایسی ویسی بن گئی تو ہم کو دلّی میں کون چین سے بیٹھنے دے گا ؟ ہم کو تو اُسی کے ایک دم کا سہارا ھے، خدا اُس کو جیتا رکھے اور نیک ھدایت دے اور الٰہی سدا کو اُس کا بول بالا رھے! سارے کنبے کے لوگ عذر خواھی کو آئے اور تمھارے اور تمھارے میاں کے نہ آنے پر سبھی نے تو اچنبھا کیا، میں نے ہر ایک سے یہی کہہ کہہ دیا کہ نوکری کا معاملہ ھے، صبح شام آنے ھی والے ھیں ؛ غرض جس طرح بن پڑے اپنے سو کام حرج کرو اور بہت جلد آؤ، تھوڑے لکھے پر بہت سا عمل کرو۔

خط پر خط تو پہلے ھی سے چلے جا رہے تھے اب ایک تو ادھر سے یہ تقاضا پہنچا اور اُدھر ابن الوقت نے بارہ دری کے بیچنے کی فوری ضرورت ظاہر کی۔ حجّۃ الاسلام نے سمجھا کہ ابن الوقت کے سنبھالے کچھ سنبھلتی ھوئی نظر نہیں آتی، اب دیر کرنی کچھ ٹھیک سی بات نہیں ؛ ابن الوقت کو لکھا کہ اپنی کوٹھی میں میرے ٹھہرنے کا ٹھکانا کرو اور مجھ کو پہنچا ھوا سمجھو۔

اس اثناء میں جان نثار بھی نوبل صاحب کو بمبئی پہنچا کر آ گیا بلکہ وہ صاحب سے پوچھ کر دس دن اپنے گھر بھی رہ آیا۔ اُس نے یہاں آ کر سنا کہ اتنے ھی دن میں کیا سے کیا ھو گیا ؛ چھوٹتے ھی ابن الوقت سے جا شکایت کی ''آپ نے یہ کیا غضب کیا!! اگر صاحب کو ذرا بھی معلوم ھو تو جہاز پر سوار ھونے کا نام نہ لیں''۔

ابن الوقت۔ یہ کیا مناسب تھا کہ میں اس طرح کی علالت میں اور اس پر سفر کی پریشانی، صاحب کو تکلیف دیتا اور ہر چند سر تا سر کلکٹر کی زیادتی ہے مگر جو لوگ حقیقت حال سے واقف نہیں، مجھی کو قصور وار ٹھہرائیں گے۔ اس ڈر کے مارے میں کسی سے اس کا مذکور بھی نہیں کرتا۔

جان نثار۔ جناب وہ تو کچھ صاحب کا دانہ پانی ھی زور کر رہا تھا، بمبئی پہنچتے پہنچتے صاحب اچھے خاصے تندرست تھے۔ پھر بنگلے کے چھوٹنے اور صاحب کلکٹر کے ساتھ بگاڑ پڑنے اور نام بنام صاحب لوگوں کے کھنچنے کی مفصّل کیفیت سن کر کہنے لگا کہ جناب میں تو شروع سے لوگوں کے تیور بدلے ہوئے دیکھتا تھا، وہ خدا جانے صاحب کی ایسی کیا مروّت تھی اور نری مروّت بھی نہیں بلکہ دباؤ کہ کسی نے کان تک نہیں ھلایا۔ میری بھی ساری عمر انگریزوں ھی میں گزری ھے، ایک ھمارے صاحب تو اپنی ذات سے فرشتہ آدمی ھیں، ایسا بشر بھی ھونا مشکل ھے اور دلّی کا اتنا بڑا کمپو ھے، پس دو چار ھی اس طرح کے نیک مزاج لوگ اور ھوں گے، زیادہ نہیں، ورنہ جناب بھلا کہیں یہ لوگ ھندوستانی کو پتیاتے ھیں۔ میں نے خود صاحب کے منہ سے سنا ھے کہ اب اشراف انگریز ولایت سے بہت کم اترتے ھیں؛ کوئی ذات کا بھٹیارا ھوتا ھے، کوئی موچی، کوئی درزی، کوئی بوچڑ، کوئی نائی، تو وہ ذاتی اصالت کہاں جائے۔ بڑے رنج کا مقام ھے کہ آپ نے ہزارھا روپیہ ھمارے ھی ھاتھوں ان لوگوں کو چٹا دیا اور وقت پر یہ لوگ طوطے کی طرح آنکھیں پھیر بیٹھے، «گدھے کا کھایا پاپ نہ پن»۔ صاحب کلکٹر کو تو ساری خلقت

پکارے کہتی ہے کہ کانوں کے کچّے ہیں، وہ آپ کو بُری نظروں سے تو پہلے ہی دیکھتے تھے؛ ایسا ہوا ہے کہ ہمارے ہی بھائی بندوں میں سے کسی نے موقع پا کر کچھ پھونک دیا ہے اور میں اب آیا ہوں تو اس کی ٹوہ لگاتا ہوں مگر یہ تو فرمائیے آپ نے اس کے توڑ کی کیا تدبیر کی۔

ابن الوقت ۔ میں نے تو کچھ بھی تدبیر نہیں کی اور کر بھی کیا سکتا تھا ۔ شروع شروع میں صاحب کلکٹر سے ملنا چاہا، اُنھوں نے انکار کیا، چپ ہو رہا ۔

جان نثار ۔ آپ نے کسی کو بیچ میں ڈالا ہوتا ۔

ابن الوقت۔ (ذرا تیز ہو کر) کیا تمھارا یہ مطلب ہے کہ میں جا کر کسی کی خوشامد کروں کہ صاحب کلکٹر سے میری خطا معاف کرا دو۔ یہ تو مجھ سے ہونی نہیں، زیادتی صاحب کلکٹر کی ہے اور اُن کو معذرت کرنی چاہیے، نہ اُلٹی مجھ کو۔

جان نثار۔ پھر اس سے تو یہ بہتر تھا کہ آپ رخصت لے کر بیٹھ رہے ہوتے ۔

ابن الوقت ۔ تم کیسی نادانوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ ایسے وقت اگر رخصت کی درخواست کرتا تو لوگ یہ سمجھتے کہ ضرور دال میں کچھ کالا تھا؛ دشمنوں کو موقع ملتا، صاحب کلکٹر کو حجت ہاتھ آتی اور یقیناً بھانجی مارتے اور رخصت کو منظور نہ ہونے دیتے ۔ خیر اب یہ بتاؤ کہ بھائی حجّۃ الاسلام صاحب تشریف لا رہے ہیں اور ہمارے ہی پاس ٹھہریں گے، اُن کے لیے کیا انتظام کیا جائے؟ بنگلے میں بالکل گنجائش نہیں ۔

جان نثار۔ یہ تو آپ نے بڑی خوشی خبری سنائی ۔ اب

خدا نے چاہا سب کام سُدھ ہو جائیں گے اور گنجائش کی نسبت جو آپ نے فرمایا تو وہ مولوی آدمی ہیں ، اُن کو ایک کمرہ بھی ہوا تو بس ہے ۔ ایک کمرے کا خالی کر دینا ایسا کیا مشکل ہے ۔ میں اسباب کو ٹھکانے لگا دوں گا ۔

ابن الوقت ۔ میں نہیں سمجھتا کہ میں ایک کمرہ بھی اُن کو دے سکوں گا ۔ اس وقت اس بنگلے میں آٹھ کمرے ہیں ، مگر اصل میں چھ تھے ۔ دو کمروں میں پارٹیشن وال (پردے کی دیوار) کھڑی کر کے دو کمرے اور پیدا کیے گئے ۔ ڈریسنگ روم (کپڑے پہننے کا کمرہ) بالکل نہ تھا ، باتھ روم (غسل خانے) میں سے نکالنا پڑا مگر ایک کمرے کے جو دو کیے گئے دونوں تنگ ۔ نہیں معلوم اس بنگلے کا کیسا ڈیزائن (منصوبے کا نقشہ) کیا گیا تھا کہ ایک متنفس کی بھی تو اس میں بافراغت گزر نہیں ہوسکتی ۔ لکھنے پڑھنے کے لیے کوئی جگہ ہی سمجھ میں نہیں آتی ، ناچار اُتّر والے لمبے کمرے کو لائبریری (کتاب خانہ) بنا کر اُسی کے ایک حصے کو ریڈنگ روم کرلیا ؛ غرض اب تک ایک باتھ روم ہے اُس کی بغل میں ایک ڈریسنگ روم ، اُس کے پہلو میں ایک بڈروم[1] ، سرے پر ریڈنگ روم ، اُس کے برابر لائبریری ' لائبریری سے ملا ہوا بلیرڈر روم[2] ، دکھن کے سرے والے کمرے میں پیانو[3] اگرچہ بے موقع ہے مگر کیا کیا جائے ! اس پر بھی سموکنگ[4] کا کہیں ٹھکانا نہیں ۔ اسباب ہے کہ برآمدے میں اور کچھ شاگرد پیشے کے مکانات میں بھرا پڑا ہے ؛ سجانے کا تو کیا مذکور ہے

۱۔ سونے کا کمرہ ۔
۲۔ جس میں بلیرڈ جو گیند کا ایک خاص طرح کا انگریزی کھیل ہے کھیلا جائے ۔
۳۔ انگریزی باجا ۔
۴۔ چرٹ پینے کا ۔

رکھنے تک کی جگہ نہیں۔ ھندوستانیوں میں کیا برا دستور ھے، نہ مجھ سے پوچھا، نہ گچھا، ایک دم سے پتھر سا کھینچ مارا کہ کہ ھم تمھارے پاس ٹھہریں گے۔ جس وقت سے خط آیا ھے میں حیران ھوں، کیا کروں کیا نہ کروں۔

جاں نثار۔ آپ کیوں اتنا تردّد فرماتے ھیں۔ اُن کو آنے دیجیے اور اُنھیں کی رائے پر رکھیے۔ یوں تو صاحب کا بنگلہ خالی ھے مگر یہاں سے ذرا دُور ھے۔

فصل بست و دوم

حجّة الاسلام آئے اور ابن الوقت کی کوٹھی میں انھوں نے اپنا گزر نہ دیکھا

مہینہ اور تاریخ تو یاد نہیں، پر اتنی بات کا خیال بے شک ہے کہ پانی کے برسنے میں دیر ہوئی، مسلمانوں نے صلاح کی کہ جمعے کے دن عید گاہ میں پہلے نماز استسقا پڑھیں اور وہیں جمعے کی نماز ہو۔ جمعرات کو عید گاہ میں صفائی ہوئی، شامیانے تنے، جا نمازیں بچھیں؛ یکایک رات کو اچھا زور کا پانی برسا، وہ سارا منصوبہ ملتوی رہا اور بدستور جمعے کی نماز جامع مسجد میں ہوئی۔ نماز کے بعد لوگ حجۃ الاسلام سے ملے اور پوچھا آپ کب تشریف لائے؟

حجتہ الاسلام۔ کل بین العصروالمغرب۔ یہ سن کر سب نے کہا «آھا یہ آپ ہی کے قدموں کی برکت ہے کہ خدا نے اپنے بندوں پر رحم فرمایا»۔

ڈاک گاڑی ابن الوقت کے احاطے میں داخل ہوئی تو یہ ہوا خوری کو سوار ہو گئے تھے، مگر نوکروں کو معلوم تھا، گاڑی آتی ہوئی دیکھ سب نے نکل کر سلام کیا۔ داروغہ نے قریب جا کر اطلاع کی کہ سرکار سوار ہو گئے ہیں، کئی دن سے دریا کی طرف تشریف لے جاتے تھے، آج کسی اور طرف کو نکل گئے ہوں گے۔ حجّۃ الاسلام نے اتر کر پہلے بالتفصیل اندر باہر کوٹھی کو دیکھا، خدمت گار وضو کا آفتابہ لیے ساتھ ساتھ تھا۔ آخر حجۃ الاسلام نے خدمت گار سے کہا «بھائی یہاں تو کہیں

وضو کا ٹھکانا نظر نہیں آتا برآمدے میں لوٹا رکھ دو» اور داروغہ سے پوچھا «یہاں آس پاس کہیں مسجد بھی ھے» -

داروغہ - (چاروں طرف دیکھ کر) - کہیں نظر تو نہیں آتی -

حجّۃالاسلام - تم کتنے مسلمان ڈپٹی صاحب کے ساتھ ہو؟

داروغہ - (آھستہ آھستہ انگلیوں پر گن کر) درزی ایک، سقّا دو، چوکیدار تین، باورچی کے ھاتھ تلے کے دو میٹ، کے ھوئے پانچ، دو سائیس، دو چپڑاسی، نو، ایک میں دس، (پکار کر) دس -

حجۃالاسلام - ماشاء اللہ پھر تم اور تمھارے سرکار نمازیں کہاں پڑھتے ہو؟

داروغہ نے شرما کر گردن نیچی کر لی - وضو کے بعد حجّۃ الاسلام نے اپنے خدمت گار سے پوچھا کہ تم کو وضو ھے؟

خدمت گار - جی ھاں مجھ کو تو وضو ھے -

حجّۃالاسلام - اچھا تو نیک مرد (دوسرے خدمت گار کا نام ھے) کو بھی اسی طرف کو بلالو اور کہہ دینا دونوں جانمازیں گاڑی میں سے لیتے آئیں - یہاں نماز وغیرہ کا کچھ اھتمام معلوم نہیں ھوتا - تمام کمروں میں جدھر دیکھو تصویریں ھی تصویریں دکھائی دیتی ھیں - بس یہی برآمدہ ٹھیک ھے -

یہ کہہ کر حجۃالاسلام نے خود اذان کہی - اذان کی آواز سے کسی کے کان آشنا نہ تھے، اصطبل میں گھوڑوں نے کنوتیاں کھڑی کیں اور کتّے لگے رونے اور بھونکنے - بارے حجۃالاسلام نے اپنے دونوں نوکروں کے ساتھ جماعت کی نماز تو پڑھی مگر بہ استکراہ - نماز کے بعد داروغہ سے پوچھا «تمھارے سرکار کس وقت واپس آیا کرتے ھیں» -

داروغہ ۔ ان دنوں تو اکثر دن چھپے سے ذرا پہلے چلے آتے ہیں۔

حجّۃ الاسلام ۔ پھر کیا کیا کرتے ہیں؟ اُن کے سارے معمول بیان کرو۔

داروغہ ۔ پہلے تو کوئی نہ کوئی صاحب لوگ ضرور ان کے ساتھ آتا تھا اور کوٹھی پر بھی ایک دو صاحب آ موجود ہوتے تھے۔ آجکل صاحب لوگوں کا آنا جانا بہت کم ہو گیا ہے اور سرکار بھی کہیں نہیں جاتے ۔ دس بجے کھانا کھاتے ہیں، اُس وقت تک کتاب یا اخبار پڑھتے رہتے ہیں۔ کھانے کے بعد آدھ گھنٹے تک انٹا کھیلتے ہیں، پھر چائے پی کر سونے کے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ صبح کے آٹھ بجے بیدار ہوتے ہیں، غسل کیا کپڑے بدلے، کھانا کھایا، کچہری چلے گئے ۔

حجّۃالاسلام ۔ اوھو! صبح کے آٹھ بجے اُٹھتے ہیں۔

داروغہ ۔ پھر جناب رات کے بارہ بجے سے ادھر تو سوتے بھی نہ ہوں گے ۔ ان دنوں کا ٹھیک حال معلوم نہیں، صاحب لوگوں کی آمدورفت کثرت سے تھی تو رات کے دو دو بجے تک جمگٹھا رہتا تھا ۔

حجّۃ الاسلام ۔ کھانا کس قسم کا پکتا ہے اور کون پکاتا ہے؟

داروغہ ۔ انگریزی کھانا ہوتا ہے اور مدراس کی طرف کا کشٹیا نامی ایک باورچی ہے، وہی پکاتا ہے۔

حجّۃالاسلام ۔ کون ذات ہے؟

داروغہ ۔ ہندو مسلمان انگریز سب کا جھوٹا کھا لیتا ہے ، اُس سے پوچھو تو اپنے تئیں یرّاوڑو بتاتا ہے ۔ نہیں معلوم یرّاوڑو کون ہوتے ہیں مگر اُس کے کھانے کی بڑی تعریف ہے ۔ صاحب کمشنر کے یہاں جب کبھی بڑا کھانا ہوتا ہے ، اُسی کو بلوا بھیجتے ہیں ۔

غرض اچھے سوا ڈیڑھ گھنٹے حجۃ الاسلام نے داروغہ سے باتیں کیں ۔ اسی اثناء میں اس کے خدمت گار نے گاڑی سے اسباب اُتارنے کے لیے پوچھا بھی مگر اُس نے کہا «ابھی ٹھہرو ۔ تھوڑی دیر بعد کہوں گا» ۔ اب نماز مغرب کا وقت قریب آیا تو خدمت گار نے کہا «حضور کو چوان بہت جلدی مچا رہا ہے» ۔

حجّۃالاسلام ۔ اُس کو سمجھا دو کہ صبر کرو ، مغرب کی نماز پڑھ لیں ، ڈپٹی صاحب بھی آنے ہی والے ہیں ، اُن سے ملنے کے بعد چلیں گے ۔ گھوڑے کو کھول دو ، گھاس ڈال دو اور تقاضا مت کرو ۔ عصر کے وقت تو کتّے صرف اذان پر کھورو لائے تھے ، اب اذان کے علاوہ نماز بھی جہری تھی ، ایک ، دوسرے کتّے مغرب سے ذرا پہلے دستور کے مطابق کھول بھی دیے گئے تھے ؛ بہتیرا ہی داروغہ اور کتّوں پر جو بھنگی تھا ، وہ اَور دوسرے لوگ سبھی تو ڈانٹتے اور دھمکاتے تھے مگر کتّے سرکار کے منہ لگے ہوئے ، ایک نہ مانی اور سب کے سب نرغہ کرکے چڑھ آئے ۔ ہر چند حجۃالاسلام کو ہر حالت کے مناسب نماز کا قاعدہ معلوم تھا مگر یہ حالت ہی انوکھی تھی ۔ اللہ اکبر تو وہ

کہ گزرا ، اگر کہیں ایک لفظ بھی اُس کے منہ سے اَور نکلے تو کتّے ضرور اُس کا ٹینٹوا لیں ۔ بارے اتنے میں ابن الوقت آ پہنچا ۔ گھوڑے کی ٹاپ کی آہٹ پا کر کتّے اُس کی طرف لپکے اور ادھر حجّۃ الاسلام نے کڑک کر اپنی اذان اور نماز تمام کی ۔ نماز کے بعد دونوں بھائی ملے تو ابن الوقت نے کہا «بنگلے کو تو آپ دیکھ چکے ہیں اب اپنی آسائش کے موافق اسباب کے جہاں تہاں رکھنے کا حکم دیجیے اور تمام بنگلے پر تصرّف کیجیے ۔ افسوس ہے کہ کمرے کم ہیں اور چھوٹے ہیں لیکن میں نوبل صاحب کی کوٹھی میں بھی چلا جا سکتا ہوں» ۔

فصل بست و سوم

حجۃالاسلام اور ابن‌الوقت کی ملاقات اور مذہبی گفتگو کی ابتدا ، بحث اسباب

حجّۃ الاسلام ۔ میں نے جس وقت دھلی آنے کا ارادہ کیا ، اسی وقت یہ بات بھی دل میں ٹھہرا لی تھی کہ تمھارے ھی پاس ٹھہروں گا ، چنانچہ تم کو لکھ بھی بھیجا تھا ۔ اب اگر تم دوسری کوٹھی میں چلے گئے تو میرا یہاں ٹھہرنا بھی بے لطف ہے ۔

ابن‌الوقت ۔ لیکن تنگی کے ساتھ رھنے میں اس سے زیادہ بے لطفی ہو گی ۔ میں بھی بہ مجبوری اس بنگلے میں پڑا ھوں ۔ اس کی ساخت سے معلوم ھوتا ہے کہ یہ بنگلہ رھنے کے لیے نہیں بنایا گیا بلکہ شاید کسی خاص طرح کا آفس یا گودام رہا ہوگا ۔ میں شروع سے چھاؤنی میں رھتا تھا ۔ وہ بنگلہ اس قدر وسیع تھا کہ کبھی کبھی چار چار صاحب لوگ بھی میرے یہاں مہمان رہے ھیں ، اتنا بھی تو نہیں معلوم ھوا کہ کدھر پڑے ھیں ۔ مدت کے قیام میں اس کو میں نے اپنی مرضی کے مطابق درست کر لیا تھا ، کمروں کی وسعت کے مناسب فرنیچر بہم پہنچایا تھا ۔ بڑی محنت سے خانہ باغ آراستہ کیا تھا ، گرمی کی وجہ سے کچھ یوں ھی سی ردائت ھوا میں ھوئی ، کمانڈنگ افسر نے ڈر کے مارے فوجی عہدہ داروں کے علاوہ جتنے لوگ چھاؤنی میں تھے دفعۃً سب کو اٹھا دیا ۔ ھر چند تلاش کیا کوئی بنگلہ

ڈھب کا نہ ملا۔ ہار کر یہ بنگلہ لیا تو اس میں بھی دو کمرے میں نے اپنی تجویز سے زیادہ کیے ہیں۔ اس پر بھی مطلق گنجائش نہیں۔ اسباب برآمدے میں پڑا پڑا خراب ہو رہا ہے۔ لوکیلٹی[1] چنداں بری نہیں مگر خوف ہے کہ کہیں تنگی کی وجہ سے تن درستی میں خلل نہ آجائے۔"

حجّۃالاسلام۔ سچ ہے انسان بھی عجیب قسم کا مخلوق ہے؛ پھیلنا چاہے تو یہاں تک کہ «دو بادشاہ در اقلیمے نہ گنجند» اور سکڑنے پر آئے تو اتنا کہ «دہ درویش در گلیمے بہ خسپند»۔ مجھے تو صرف ایک کمرہ کافی ہے اور میں اپنے گھر بھی ایسے ہی مختصر طور پر رہتا ہوں۔ یوں تو مکان بہتیرا وسیع ہے مگر میرے ذاتی استعمال میں صرف ایک دالان اور ایک حجرہ ہے جن دونوں کا مجموعہ تمھارے اس بڑے کمرے کے شاید برابر ہو مگر میں تو سمجھتا ہوں کچھ چھوٹا ہی ہوگا۔ سو دالان اور حجرہ بھی میرے استعمال میں اس طرح پر ہے کہ جاڑے کے دنوں میں تو میں دالان میں کبھی پاؤں بھی نہیں رکھتا، حجرے میں میری چار پائی بچھی رہتی ہے، چار پائی کے آگے اتنی جگہ ہے کہ فراغت سے پانچ چھ اور ذرا تنگی سے سات آٹھ آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔ لوگوں سے ملنا جلنا، لکھنا پڑھنا، کھانا کھانا، نماز پڑھنا غرض میری اکثر ضرورتوں کے لیے وہی ایک حجرہ کفایت کرتا ہے اور جب یہ خیال کرتا ہوں کہ اتنی بڑی زمین میں سے آخرکار مجھے چند روز کے لیے ایک قبر کی جگہ ملے گی، نہیں معلوم کہاں اور اس کا بھی پورا یقین نہیں تو بے اختیار حضرت لقمان کا مقولہ یاد آتا ہے ع ان ھذا لمن یموت کثیرا[2]۔

۱۔ موقع۔ ۲۔ مرنے والے کو اتنا بھی بہت ہے۔

ابن الوقت ۔ مجھ کو حیرت ہے کہ اس طرح کی زندگی میں آپ کی تن درستی کیوں کر باقی رہتی ہے !

حجّۃالاسلام ۔ اسی طرح باقی رہتی ہے جس طرح اور لاکھوں کڑوڑوں بندگان خدا کی باقی رہتی ہے اور جس طرح اب سے ڈھائی تین برس پہلے خود تمھاری باقی رہتی تھی ۔

ابن الوقت ۔ کیا خاک باقی رہتی ہے ۔ ابھی پورے دو مہینے بھی نہیں ہوئے کہ صدھا آدمی شہر میں ہیضہ کرکے مر چکے ہیں ۔ لگّا تو ہمارے یہاں بھی لگ چلا تھا ؛ شروع شروع میں کچھ آدمی بازار میں مرے ، پھر بعض صاحب لوگوں کے شاگرد پیشوں میں ہیضہ تو کئی نے کیا مگر شاید صرف دو آدمی ہلاک ہوئے ۔ خیر ان لوگوں میں اگر ہیضہ پھیلا تو کچھ تعجب کی بات نہیں کیوں کہ کتنی ہی تاکید کی جائے ، یہ لوگ صفائی کا اہتمام جیسا چاہیے نہیں رکھتے پر نہیں رکھتے مگر بارک ماسٹر کے بنگلے میں تین صاحب لوگ اور ٹھہرے ہوئے تھے ۔ چار گھنٹے میں آگے پیچھے سب نے ہیضہ کیا ؛ ایک انجینیر تو مرا ، باقی بچ گئے ۔ چھاؤنی میں اس کا بڑا غل ہوا اور کمانڈنگ افسر نے ڈاکٹر سے کیفیت طلب کی ۔ ڈاکٹر صاحب نے بہتیری ہی تحقیقات کی کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ بارک ماسٹر کے بنگلے میں ہیضہ کہاں سے آ کودا ؛ بنگلہ بڑے اونچے ٹیلے پر واقع ، اطراف و جوانب میں بنگلے کے شاگرد پیشوں میں کہیں بیماری کا نام نہیں ، بنگلے کے آس پاس کیا بلکہ سو سو ڈیڑھ ڈیڑھ سو قدم کے فاصلے تک تالاب نہیں ، نالی نہیں ، خندق نہیں ، کھیتی نہیں ، جھاڑ جھنکاڑ نہیں ، قبرستان

نہیں ، چاروں طرف کف دست میدان پڑا ھے ، صاف ستھرا۔ آخر سراغ لگاتے لگاتے کیا معلوم ھوا کہ چائے کے لیے جس گھوسی کے یہاں سے دودھ آتا ھے بھینسوں کو موضع دُکھیاری کے تالاب میں لے جا کر پانی پلاتا ھے اور دکھیاری میں اس بیماری کا بڑا ھی زور تھا۔

حجّۃالاسلام یہ سن کر بے اختیار ھنس پڑا اور کہنے لگا کہ واقع میں ڈاکٹر صاحب نے سبب تو خوب گھڑا۔ ھیضہ گاؤں سے تالاب میں آیا، تالاب سے بھینس میں، بھینس سے دودھ میں، دودھ سے چائے میں، چائے سے صاحب لوگوں میں، مگر انھیں ڈاکٹر صاحب سے یہ بھی پوچھنا چاھیے تھا کہ دُکھیاری میں کہاں سے آیا۔

ابن الوقت ۔ عموماً ھندوستانیوں کا اور خصوصاً دیہاتیوں کا اور غرباء کا طرز تمدّن اس طرح کا واقع ھوا ھے کہ ھندوستان کی سر زمین میں ھر جگہ ھیضے کا بیج موجود ھے، گرمی پڑی اور بیج پھوٹا۔ دُکھیاری میرا دیکھا ھوا ھے ، ھوا خوری کی تقریب سے میں کئی بار اس گاؤں میں ھو کر نکلا ھوں ، کوئی دو پونے دو سو گھر کی بستی ھے اور ابھی حال میں دس برس کے اندر اندر آباد ھوا ھے۔ معلوم ھوا کہ جس کسی کو گھر بنانا منظور ھوتا ھے ، ایک جگہ مقرر کر کے وھیں سے مٹی کھود کھود دیواریں کھڑی کر لیتا ھے اوریہی سبب ھے کہ کوئی گھر نہیں جس کے پاس گڑھا نہیں؛ گھر کا کوڑا کرکٹ ، گوبر ، اَلا ، بَلا ، انھیں گڑھوں میں ڈالتے رھتے ھیں ۔ ھر گڑھا

کھاد کا کھتّا ہے ، برسات کے دنوں میں پانی بھر کر سارے برس پڑا سڑتا ہے ، یہ تو بستی کی کیفیت ہے - گاؤں کے قریب ایک تالاب ہے ؛ اسی میں عورت مرد نہاتے ور مویشی پانی پیتے ہیں ، بیچ میں سنگھاڑے بوئے ہیں ، ایک طرف کو بہت دور تک سن کے انبار پڑے ہیں اور وہیں دھوبی کپڑے دھو رہے ہیں -

حجّۃالاسلام - کیا اسی تالاب نے انجینیر صاحب کو مارا ہے ؟

ابن‌الوقت - نہیں جناب! وہ تو سوانے پر کا دوسرا تالاب ہے اور گاؤں کے تالاب سے کسی قدر صاف بھی ہے -

حجّۃالاسلام - جو کیفیت تم نے دُکھیاری کی بیان کی حقیقت نفس‌الامری ہے اور دُکھیاری پر کیا موقوف ہے تمام دیہات کا یہی بلکہ صفائی کے اعتبار سے اس سے بدتر حال ہے مگر یہ تو کہو اسی حالت میں بعض جو مبتلائے ہیضہ ہوئے ، اُن میں سے بھی بعض مرے اور بعض جیتے رہے بلکہ یوں کہو کہ کم مبتلائے ہیضہ ہوئے اور ان میں سے بھی کم مرے تو اگر بارک‌ماسٹر اور کون اور کون چار انگریزوں کے ہیضہ کرنے کا اور اگر ان میں سے ایک انجینیر کے مرنے کا موضع دُکھیاری بہ وسائط چند در چند باعث ہوا ہے تو جو لوگ بالکل ہیضے سے محفوظ رہے اُن کے محفوظ رہنے کا اور جو مبتلائے ہیضہ ہو کر جاں بر ہوئے اُن کے جاں بر ہونے کا بھی کچھ نہ کچھ سبب تو ضرور ہوگا یعنی اگر مرض اور موت کے لیے سبب درکار ہے تو تن درستی اور زندگی کے لیے بدرجۂ اولٰی

کیوں کہ مرض اور موت کے واقعات کم ھیں اور تن درستی اور زندگی کے کہیں زیادہ ۔

ابن الوقت ۔ میں ایسا سمجھتا ھوں کہ لوگوں کے مزاج ھیں متفاوت ؛ بعض طبائع میں متاثّر اور مغلوب بہ مرض ھونے کی استعداد قوی ھوتی ھوگی، بعض میں ضعیف ۔

حجّۃالاسلام ۔ تفاوت امزجہ سے تمھاری مراد صفراوی ، بلغمی، دموی ، سوداوی کا اختلاف ھے کیا ؟

ابن الوقت ۔ نہیں نہیں ، ان تمام مزاجوں کے آدمیوں کو یکساں طور پر مبتلا ھوتے بھی دیکھا اور مرتے بھی دیکھا بلکہ وہ کسی خاص قسم کی کیفیت ھوتی ھوگی جو طبیعت کو قبول مرض کے لیے پہلے سے آمادہ کر رکھتی ھوگی ۔

حجّۃاسلام ۔ تو جس کو تم سبب سمجھتے تھے سبب نہ رھا کیوں کہ بدون استعداد طبیعت کے اس کا عمل معطّل ھے ۔ اس کے علاوہ بعض اوقات یورپ کے ایسے مقامات بھی مبتلائے ھیضہ ھوئے ھیں جن میں صفائی کے بڑے اھتمام ھیں، پس تمھارے اصول کے مطابق اُن مقامات میں ھیضے کے پیدا ھونے کا کوئی محل ھو نہیں سکتا ۔ مدّتوں تک ڈاکٹر اس مرض کو متعدّی مانتے رھے بہ این شدّت کہ جو شخص بد قسمتی سے اس مرض کی چپیٹ میں آجاتا کوئی اس کی تیمارداری تک کو کھڑا نہ ھوتا ، مرے پیچھے اُس کے کپڑے لتّے سب جلا ڈالتے ، مکان میں دُھونیاں سلگاتے ، قلعی پھرواتے ، مٹی تک کھود کر پھنکوادیتے اور ابھی تک اکثر بندرگاھوں میں کوارنٹائن (قرنطینہ) کے قواعد کی پابندی بڑی سختی کے ساتھ مرعی ھے ؛ بہ ھر کیف مرض کے متعدّی ھونے کی

صورت میں ممکن ہے کہ ہیضے کا وطن اصلی اور اس کی پیدائش کی جگہ ہمارا ہی ملک ہو اور لوگوں کے اختلاط کی وجہ سے یورپ میں جا نکلتا ہو مگر اب تو بڑے بڑے ڈاکٹروں کا اجماع اس پر ہے کہ تعدیّہ کی کچھ اصل نہیں۔ بات یہ ہے کہ ہر چند فی زماننا ھذا جہاں بہت سے جدید علوم ایجاد ہوئے ہیں فن طبابت میں بھی بڑی نمایاں ترقی ہوئی ہے مگر تاہم ظنی ہے اور انتظام الٰہی مقتضی ہے کہ ظنی رہے؛ جب لوگ ہیضے کے متعدّی ہونے کے معتقد تھے وہ بھی ایک امر مظنون تھا، اب اگر عدم تعدیّہ کے قائل ہیں تو یہ بھی امر مظنون ہے۔ ڈاکٹر اپنی طرف سے بہتیرے ٹامک ٹوئیے مارتے پھرتے ہیں مگر اس وقت تک کہیں سے کچھ پتا نہیں چلا کہ ہیضہ ہے کیا چیز، کیوں کر پیدا ہوتا اور ترقی کرتا اور کیوں کر معدوم ہو جاتا ہے اور جس طرح سانپ کے کاٹے کا کوئی تریاق محقّق نہیں، اسی طرح ہیضے کا کوئی حکمی علاج معلوم نہیں۔ پس بھائی! ہم تو اپنے ایمان کو ڈانوڈول نہیں ہونے دیتے دل میں یہ بات ٹھن گئی ہے کہ اپنی خوشی دنیا میں آ نہیں گئے، خدا نے پیدا کیا ہے، اسی نے ہر فرد بشر کی حیات کی ایک مدّت مقرر کر دی ہے اور اس مدّت کی خبر بھی اپنے ہی تک رکھی ہے، کسی کو اس سے آگہی نہیں۔ وقت سے پہلے کوئی مر نہیں سکتا؛ پھر کیوں گھبرائیں اور وعدہ پورا ہوئے پیچھے کوئی رک نہیں سکتا تو کس برتے پر اترائیں؟ اذا جاء اجلہم لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون[1]۔

ابن الوقت ـ آہا! معلوم ہوتا ہے کہ آپ دنیا کو عالم اسباب نہیں جانتے بلکہ شاید عقل وتدبیر کو بھی نہیں مانتے۔

۱۔ جب اجل آموجود ہوگی تو ایک گھڑی کی تقدیم و تاخیر نہیں کر سکتے۔

حجّۃالاسلام - بس ایسا ہی عالم اسباب مانتا ہوں کہ متصرّف فی الامور وہ خود ہے اور کسی مصلحت سے اُس نے اسباب کا جال پھیلا رکھا ہے - اسباب اور نتائج میں جو تعلق ہے اُس کو میں اسرار الٰہی میں سے سمجھتا ہوں - فہم بشر سے خارج اسباب کو ایجاد اور تکوین میں اتنا بھی تو مدخل نہیں جتنا ایک کاری گر کے اوزار کو اُس کے عمل میں ہوتا ہے - کاریگر اوزار کا محتاج ہے اور خدا جل و علا شانہ کو کوئی سبب درکار نہیں ؛ مگر ہاں عادت الٰہی یوں ہی جاری ہے ، الّا ماشاءاللہ کہ ہر واقعے کے لیے کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے - اسباب نامتناہی ہیں اور ان پر بتما مہا احاطہ کرنا مقدور بشر نہیں مگر خدا نے جب جب جتنا مناسب سمجھا انسان پر منکشف کیا «وماأوتیتم من العلم الاقلیلا»[1] - اگرچہ عقل انسانی کسی حالت میں خطا سے محفوظ نہیں مگر اسباب کے بارے میں تو لوگ ایسی ایسی مکروہ غلطیاں کرتے ہیں کہ معاذاللہ - عالم اسباب میں پیدا ہوئے ، عالم اسباب میں رہے ، کوئی واقعہ نہیں جس کے لیے ان کو سبب کی تفتیش نہ ہو اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اصلی سبب کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا تو ادّعائے اسباب ٹھہرا لیتے ہیں - نجوم اور جفر اور رمل اور قیافہ وغیرہ بہت سے لغویات ہیں جن کا ماخذ سوائے اسباب ادّعائی کے اَور کچھ نہیں اور کبھی سبب تو ہوتا ہے ٹھیک مگر اُس کے شرائط کا خیال نہیں رہتا مثلاً فرض کرو کہ سیسے کی ایک گولی ہو اور اُسی قد و قامت کی دوسری کوئی روئی کی ہو ہلکی پھلکی اور قطب صاحب کی لاٹ پر جا کر دونوں گولیوں کو ایک ساتھ چھوڑ دیں تو ضرور

۱- تم کو بہت ہی تھوڑا سا علم دیا گیا ہے-

سیسے کی گولی پہلے گرے گی۔ اب یہ ایک واقعہ ہے اور اس کا سبب ہے ثقل مگر اس کے ساتھ ایک شرط بھی ہے کہ لاٹ کی چوٹی سے زمین تک گولیوں کے رستے میں خلا نہ ہو کیوں کہ خلا ہوگی تو گرنے میں ہلکی بھاری دونوں برابر۔ پھر انسان سبب بھی اپنی مرضی کا ڈھونڈتا ہے یعنی جس قسم کے اسباب سے خوگر ہے مثلاً اگر کوئی مریض کیسی ہی ردّی حالت اس کی کیوں نہ ہو اگر کسی دوا سے دفعۃً اچھا ہو جائے اگرچہ وہ دوا چولھے کی راکھ ہی کیوں نہ ہو تو کسی کو بھی استعجاب نہ ہو کیوں کہ دوا درمن سے اچھا ہونا ایک معمولی بات ہے؛ لیکن فرض کرو کہ بجائے دوا کے کوئی شخص دم کر دینے سے یا نظر بھر کر دیکھ لینے سے سلب مرض کر دے تو سننے والوں میں سے تو شاید سو میں ایک کو بھی یقین نہ آئے اور دیکھنے والے بھی اکثر جادو اور نظر بندی اور مغالطہ دہی پر محمول کریں اور اس بنا پر فلاسفہ اور دہری[1] معجزات انبیا پر (علی نبینا و علیہم السلام) بڑے شدّومد کے ساتھ اعتراضات کرتے چلے آئے ہیں۔ میں نے کسی دہری کی تحریر دیکھی ہے جس میں اس نے لکھا تھا کہ قانون فطرت یا عادت اللہ شہادت کے لیے کسوٹی ہے، شہادت وہیں تک معتبر ہو سکتی ہے کہ قانون فطرت کے مطابق ہو یعنی اس کا مقولہ یہ تھا کہ قانون فطرت کے خلاف ہم کسی شہادت کو نہیں مان سکتے یا بہ عبارت دیگر مخالفت قانون فطرت شہادت کے متّہم بالکذب بلکہ مردود کرنے کو کافی ہے، یہ صاف مصادرہ علی المطلوب[2] ہے۔ جب ایک شخص کہتا کہ فلاں واقعہ خلاف معمول مستمر

۱۔ یعنی لا مذہب جو خدا کو نہیں مانتے۔
۲۔ بے دلیل دعوے کو تسلیم کر لینا۔

واقع ہوا مثلاً یہ کہ ایک شخص نے ایک ڈول پانی سے ایک لشکر کو سیراب کر دیا تو اب صرف اس وجہ سے کہ یہ واقعہ عجیب و غریب ہے وقوع واقعہ سے انکار کرنا ہیکڑی اور ہٹ دھرمی اور کٹھ حجتی نہیں تو کیا ہے؟ «بل کذبوا بمالم یحیطوا لعلمه ولما یاتہم تاویله کذلک کذب الذین من قبلهم فانظر کیف کان عاقبة الظالمین[1]»۔ اسباب کے بارے میں ایک کثیرالوقوع اور خطرناک غلطی یہ ہے کہ نتائج کو اسباب کی طرف اس طرح منسوب کیا جاتا ہے گویا اسباب ہی فاعل اور مکوّن اور متصرّف ہیں: پانی غلہ اگاتا ہے، کونین دافع تپ ہے، سنکھیا سم قاتل ہے اور یہی ہے مظنۂ شرک خفی، اعاذنا اللہ منہ[2] اور میرے پندار میں «وما یومن اکثرهم باللہ الّا و هم مشرکون[3]» میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے۔ غرض اسباب کا مسئلہ بڑا نازک اور مشکل اور مزلۃ الاقدام[4] ہے۔

ابن الوقت ۔ یہ تو کوئی بھی نہیں کہتا کہ طب کے احکام مسائل ہندسی کی طرح یقینی ہیں مگر اس فن میں اس قدر ترقی ضرور ہوئی ہے کہ یورپ میں عمروں کا اوسط بڑھا ہوا ہے، مردم شماری کی افزائش کا پرتہ زیادہ ہے، خاص خاص امراض کے ایسے حکمی علاج دریافت ہوئے ہیں کہ سارے ملک میں کہیں ان بیماریوں کا نام نہیں، بہت سے روگ جو درمان پذیر نہ تھے اب ڈاکٹر دعوے کے ساتھ ان کا علاج

---

۱ ۔ جس چیز کے علم پر احاطہ نہ کر سکے اور اس کی تاویل سمجھ میں نہ آئے اس کو جھٹلانے لگے، اسی طرح ان کے اگلوں نے جھٹلایا، تو دیکھ ظالموں کا انجام کیا ہوا۔

۲ ۔ خدا ہم کو اس سے پناہ دے۔ ۳ ۔ اکثروں کا یہ حال ہے کہ جب تک خدا کا شریک نہ ٹھہرا لیں ایمان ہی نہیں لاتے۔
۴۔ پاؤں کے پھسلنے کی جگہ۔

کرتے ہیں، حفظان صحت کے قواعد اگرچہ ظنی ہیں مگر یقینیات کے لگ بھگ؛ غرض واقعات سے، نتائج سے یہ بات بہ خوبی ثابت ہو چکی ہے کہ انسان کی تدبیر کو اُس کی تن درستی اور زندگی میں بڑا دخل ہے اور اس سے انکار کرنا گویا بداہت سے انکار کرنا ہے۔

حجّۃالاسلام ۔ کیوں! کیا ہمارے ملک میں لوگوں کی بڑی عمریں نہیں ہوتیں؟ ہمارے یہاں بھی لوگ کثیرالاولاد ہوتے ہیں اور ایسے لوگ بہت نکلیں گے جو ہمیشہ یا اکثر تن درست رہتے ہیں اور اُن کو علاج کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ میرا تو یہ خیال ہے کہ جو زیادہ احتیاط کرتے ہیں وہی زیادہ بیمار ہوتے ہیں۔

ابن الوقت ۔ میں خلاف قاعدہ کو داخل اتفاقیات سمجھتا ہوں۔

حجّۃالاسلام ۔ تم نے اچھی طرح غور نہیں کیا۔ اول تو سرے سے علم طب ہی فی حد ذاتہ مکمل نہیں پھر ناقص و نا تمام و مظنون جیسا کچھ ہے، اگر ساری دنیا کی مردم شماری پر نظر کی جائے تو سو میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں ٹھہرے گا جو احکام طب کی پوری پوری پابندی رکھتا ہو۔ بات یہ ہے کہ خداوند کریم نے ہر انسان کا طبیب اُسی کے ساتھ پیدا کیا ہے، وہ کیا ہے؟ اُس کی طبیعت۔ انسان کی تندرستی پر داخلی اور خارجی بے شمار خطرات ہیں اور اُن میں سے خدا جانے کتنے ہیں جو اس وقت تک مخفی ہیں اور کتنے ہیں جو معلوم ہیں مگر انسان کے بس کے نہیں تو اُن کا جاننا نہ جاننا برابر۔ الغرض کسی کو خبر نہیں کہ کل بلکہ اب سے چند لمحے بعد کون سی آفت اُس کی تن درستی پر آنے والی ہے کہ اُس کی روک تھام کرے۔ نزول آفت پر فوراً اُس کی طبیعت مرض کی مقاومت پر آمادہ ہو جاتی ہے؛ طبیعت صرف مدبّر و معالج

نہیں بلکہ اسی طبیعت میں سب طرح کے امراض کی دوا بھی ہے ؛ اگر حیات باقی ہوتی ہے طبیعت مرض پر غالب آ جاتی ہے ورنہ مغلوب مرض ہو کر آدمی ہلاک ہو جاتا ہے۔ رہ گئی دوا ، وہ صرف طبیعت کی تقویت ہے ، بلکہ مجھ سے پوچھو تو صرف طبیعت ہی کی نہیں بلکہ بیشتر اوپر والوں کی ۔ بڑے بڑے حاذق طبیبوں کو دیکھا کہ اُن کے ہاتھوں سے مریض مرتے بھی ہیں اور شفا بھی پاتے ہیں ؛ مرے تو کہتے ہیں خدا نے اتنی ہی حیات لکھی تھی ، حکیم جی نے اپنی سی بہتیری کی ، زندگی ہی نہ ہو تو کیا کریں اور اچھے ہوئے تو نہ خدا ہے ، نہ تقدیر ہے ، حکیم صاحب ہیں اور اُن کی تشخیص و تدبیر ہے۔

ابن الوقت۔ آپ تو کچھ جُبریوں کی سی باتیں کرتے ہیں ۔ آپ کی تقریر کا ماحصل یہی معلوم ہوتا ہے کہ تدبیر لا حاصل ہے اور انسان کی تن درستی اور زندگی محض ایک امر تقدیری ہے، من جانب اللہ ، انسان کو اس میں کسی طرح کا مدخل نہیں مگر یہ آپ ہی کی منفرد رائے ہے۔ ایک عالم طب کا معتقد ہے، طب سے میری مراد ہومیوپیتھی[1] یا ایلو پیتھی یا یونانی یا وید[2] کی کسی خاص طرح کی طبابت نہیں بلکہ میری غرض اسی قدر ہے کہ ساری دنیا سدا سے اس امر کی معتقد چلی آئی ہے کہ حفظ صحت دفع مرض یا ابقائے حیات جن لفظوں سے چاہیے تعبیر کر لیجیے ، تدبیر پذیر ہے؛ اس سے بحث نہیں کہ وہ تدبیر فی نفسہ صحیح ہو یا غلط ، جادو اور منتر اور ٹونے اور ٹوٹکے اور تعویذ اور گنڈے اور ہر طرح کی دوا درمن سب داخل تدبیر ہیں۔

۱- انگریزی طبابت کی دو قسمیں ہیں۔ جن کے اصول مختلف ہیں۔
۲- ہنود کی طب ۔

الغرض ہر زمانے میں اس بات پر تمام عالم کا اجماع رہا ہے کہ زندگی اور تن درستی میں انسان کی تدبیر کو دخل ہے اور یہ میرا پہلا دعویٰ ہے اور ہر زمانے کے عقلاء اور جہلاء اور حضری[1] اور بدوی سب کا اجماع اس دعوے کا ایسا قوی ثبوت ہے کہ اس سے زیادہ قوی کوئی ثبوت ہو نہیں سکتا ، آپ پیچ دار باتیں کر کے اصل مطلب کو کہاں گم کیے دیتے ہیں۔ میرا دوسرا دعویٰ جو پہلے دعوے پر متفرّع ہے، یہ ہے کہ جتنی تدبیریں حفظان صحت کی لوگ عمل میں لاتے ہیں سب میں رو بہ صواب طب انگریزی اور اس کی متعلقات ہیں۔ اس دعوے کے ثبوت کے لیے میں واقعات پیش کرتا ہوں جن کو مردم شماری کے کاغذات سے استنباط کیا گیا ہے۔

حجۃالاسلام ۔ ہاں جی ہاں! میں تمھارے مطلب کو خوب سمجھتا ہوں ۔ تم کو اگر میرے مدعا کے سمجھنے میں کچھ تزلزل واقع ہوا ہے تو لو اب پھر سنو! صرف اتنی بات سے کہ ہر زمانے میں لوگ حفظان صحت کی تدبیریں عمل میں لاتے رہے ہیں، لازم نہیں آتا کہ انسان کو اپنی تندرستی میں مدخل ہے۔ تم نے اتنی ہی بات ثابت کی کہ لوگوں کو حفظ صحت کی حاجت ہے اور ہر شخص فی زعمہ اس کی کچھ تدبیر کرتا ہے ، صحیح یا غلط ، درست یا نادرست: اسی طرح ہر شخص کو علم مستقبلات کی حاجت ہے اور ہر زمانے میں لوگ اس کے بھی درپے رہے ہیں: نجوم اور رمل اور جفر اور فال اور شگون اور تعبیر خواب اور قیافہ اور سعد و نحس اور ہاتھ کی لکیریں اور سانس اور کیا اور کیا سارے پاکھنڈ اسی غرض سے ہیں اور یہ نہ سمجھنا کہ صرف ایشیا کی وحشی

۱۔ اہل شہر و اہل دیہات۔

قومیں اس خبط میں گرفتار ہیں، جہاں تک مجھ کو معلوم ہے
اہل یورپ بھی اس الزام سے بری نہیں - غرض فکر مستقبل
سے کوئی فردبشر فارغ نہیں، تو کیا اس سے یہ نتیجہ
نکال سکتے ہیں کہ انسان کو علم غیب میں دخل ہے - پھر
دخل ایک مشتبہ لفظ ہے - اگر اس سے ملابست مراد ہے
اگرچہ ادنیٰ درجے ہی کیوں نہ ہو یعنی تعلق تو دنیا کا سارا
کارخانہ انسان کے لیے ہے اور اُس کو کل موجودات عالم سے کسی
نہ کسی طرح کا تعلق ہے یا ہو سکتا ہے - موجودات عالم
میں سے بعض چیزیں ایسی ہیں جن میں اُس کو تصرّف کا
اختیار ہے اگرچہ اُس کا اختیار محدود ہے مگر اسی اختیار کی
وجہ سے اس کو «خلیفۃاللہ فی الارض[1]» کہا جاتا ہے - جسمانی
توانائی کے اعتبار سے وہ چنداں زبردست مخلوق نہیں مگر عقل کے
بل پر وہ آسمان تک اُچک جانے کا ارادہ رکھتا ہے - کسی شاعر
نے کیا عمدہ طور پر انسان کا حال بیان کیا ہے - ؎

خاک کے پتلے نے دیکھ کیا ہی مچایا ہے شور
فرش سے لے عرش تک کر رہا ہے اپنا زور
سینے میں قلزم کو لیے قطرے کا قطرہ رہا
بل بے سمائی تری اُف رے سمندر کے چور

وہ زمین پر بیٹھا بیٹھا اجرام فلکی پر اور زیادہ دست رس نہیں
تو ان کی رفتار سے اپنے اوقات کو منضبط کرتا ہے - «ھوالذی
جعل الشمس ضیاءاً و القمر نوراً و قدرہ منازل لتعلموا عددالسنین
والحساب[2]» روئے زمین پر اس نے اپنا ایسا تسلّط بٹھا رکھا ہے

۱- زمین پر خدا کا نائب - ۲- اُس خدا نے سورج کو روشنی بنایا
اور چاند کو نور اور اُس کی منزلیں ٹھہرادیں تاکہ تم کو برسوں کی
گنتی اور حساب معلوم ہو -

کہ نہ صرف جمادات اور نباتات میں تصرّفات اور عناصر پر حکم رانی کرتا ہے بلکہ بڑے سے بڑے قوی اور خوں خوار جانور اس سے ڈرتے اور اس کی خدمت کرتے ہیں۔ بااین ہمہ انسان کسی کام کا فاعل مستقل اور کسی چیز میں حقیقی موثّر نہیں۔ اس مطلب کو سورۂ واقعہ میں بڑی ہی عمدگی سے بیان کیا ہے۔

«افرءیتم ما تمنون○ ءانتم تخلقونه ام نحن الخالقون○ نحن قدرنا بینکم الموت وما نحن بمسبوقین علی ان نبدل امثالکم وننشئکم فی ما لا تعلمون○ ولقد علمتم النشاۃ الاولی فلولا تذکرون○ افرایتم ما تحرثون○ ءانتم تزرعونه ام نحن الزارعون○ لو نشاء لجعلناه حطاماً فظلتم تفکّھون○ انا لمغرمون○ بل نحن محرومون○ افرءیتم الماء الذی تشربون○ ءانتم انزلتموه من المزن ام نحن المنزلون○ لو نشا جعلناه اجاجا فلو لا تشکرون○ افرءیتم النار التی تورون○ ءانتم انشاتم شجرتها ام نحن المنشئون○ نحن جعلنا ها تذکرۃ و متاعاً للمقوین○ فسبح باسم ربک العظیم○»

ان آیتوں میں اللہ تعالی جل شانہ نے چار چیزوں کو بیان فرمایا ہے، اولاد اور کھیتی اور پانی اور آگ اور ان چاروں میں سے ہر ایک میں جہاں تک انسان کو دخل ہے اس کی بھی صراحت کی اور پھر تبکیت[1] کے لیے پوچھا کہ بھلا پھر اولاد کو تم نے پیدا کیا یا ہم نے اور کھیتی کو تم نے اگایا یا ہم نے اور پانی بادل سے تم نے برسایا یا ہم نے اور آگ کا ایندھن تم نے بنایا یا ہم نے، ہم نے تمھارے لیے موت کا ٹھہراو کر دیا ہے اور کسی کی مجال نہیں کہ ہماری پکڑ سے نکل بھاگے، ہم چاہیں تو کھیتی کو ڈانٹ[2] بنادیں کہ اس میں

۱۔ قائل کرنا کہ پھر بات کرنے کا منہ نہ رہے۔
۲۔ ڈنٹھل جس میں دانہ نہ ہو۔

پھل کا کہیں نام نہ ہو ، ہم چاہیں تو پانی کو کھاری کر دیں ؛ غرض انسان کا اختیار اور اُس کی بےاختیاری دونوں حالتیں دکھا دی گئی ہیں جس کا خلاصہ ہے۔ «امر بین الجبر والاختیار»[1]۔

ابن الوقت۔ ہمارے آپ کے درمیان لفظی اختلاف ہے، انسان کا اختیار آپ بھی مانتے ہیں مگر محدود اور ہم بھی کہتے ہیں کہ انسان کا اختیار ابھی تک محدود رہا ہے مگر اُس کا اختیار اُس کی جہالت کی وجہ سے محدود ہے ۔ اب جو نئی نئی چیزیں ایجاد ہوتی چلی جاتی ہیں تو انسان سمجھتا جاتا ہے کہ اس کو بڑی قدرت ہے۔ کتنی مدت کے بعد اب اُس نے جانا کہ مثلاً سٹیم اور الکٹریسٹی کیا چیز ہے اور میں اُس پر کیا اختیار رکھتا ہوں ۔ اسی طرح اُس نے اپنی تن درستی اور زندگی پر بھی اپنا اختیار معلوم کرنا شروع کیا ہے ؛ بہت سے امراض کو اُس نے اپنے بس میں کر لیا ہے کہ چاہے تو اُن کو پیدا ہی نہ ہونے دے یا اگر پیدا ہوں بھی تو اُن کو جس وقت چاہے معدوم کر دے اور اگر علوم طب اور کیمیا اور طبیعیات وغیرہ اسی نسبت سے ترقی کرتے رہے جیسے کہ پچھلے سو برس میں تو وہ دن کچھ دور نہیں کہ انسان اپنی تن درستی پر آپ حاکم ہوگا اور کیا عجب ہے کہ رفتہ رفتہ اپنی زندگی پر بھی ۔

حجۃالاسلام ۔ نعوذ باللہ من ذلک ۔ کیا تمہارے برے عقائد ہیں! تو تم حقیقت میں اس بات کے منتظر ہو کہ انسان کچھ دنوں میں معاذاللہ خدا ہونے والا ہے ۔

ابن الوقت ۔ دھریے تو کہتے ہیں خدا کو کس نے دیکھا ہے ۔ یہ بھی لوگوں کا ایک خیال ہے ۔

حجۃالاسلام ۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ ۔ خدا کو دیکھا نہیں تو اس سے لازم آ گیا کہ خدا ہی نہیں ۔ ہم نے روح کو بھی نہیں دیکھا اور نہیں دیکھ سکتے تو روح کے ہونے سے بھی انکار کرو۔

---

۱ ۔ انسان نہ مجبور مطلق ہے نہ مختار مطلق بلکہ ایک اعتبار سے مجبور اور دوسرے اعتبار سے مختار۔

ابن الوقت ـ واہ واہ تعریف المجہول بالمجہول ! وہ روح ھی کو کب مانتے ھیں ـ

حجۃ الاسلام ـ تمام فلاسفہ کا اجماع ھے کہ آدمی کو اپنی ذات کا علم حضوری اور بدیہیات اوّلیں میں سے ھے ـ ھر شخص اپنے تئیں لفظ «میں» سے تعبیر کرتا ھے اور کہتا ھے میرا دل، میرا دماغ، میرا جسم یعنی ھر شخص کو جسم کے علاوہ اپنی ھستی کا اذعان ھے ـ میں نہیں سمجھتا کہ کسی اور ثبوت کی بھی ضرورت ھے اور اگر تمھارے نزدیک ھے تو تم کو خبط ھے اور تم قابل خطاب نہیں مگر مسلمان ھونے کا دعویٰ کر کے اسلام کو کیوں بد نام کرتے ھو اور لوگوں کو کیوں دھوکے میں ڈالتے ھو؟ یہ سچ ھے کہ مجامع میں، تحریرات میں تم اسلام کے نام سے فخر اور اُس کی مدح و حمایت کرتے ھو مگر وہ اسلام ادّعائے اسلام ھے جس کو صرف امتیاز قومی کہنا چاھیے ـ تم جیسے ڈھل مل یقین چند مسلمان میں نے اور بھی دیکھے ھیں اُن کو بھی اسی طرح کے شکوک عارض ھوئے ، لامذھبوں اور دھریوں اور عیسائیوں غرض اسلام کے مخالفوں سے کچھ اعتراض سن پائے، جواب سوجھے نہیں یا سوجھے اور تسکین نہیں ھوئی ـ آھون[1] سمجھ کر یہ شیوہ اختیار کر لیا کہ لگے اسلام ھی کے اصول میں تاویلات کرنے ; وہ اپنے پندار میں اسلام کی تائید کرتے ھیں مگر حقیقت میں اسلام کو کسی مخالف سے اتنا نقصان نہیں پہنچتا جتنا اُن کی تاویلات سے ـ اُنھوں نے حدیث کو تو یہ کہہ کر الگ کیا کہ پیغمبرؐ صاحب کے ڈیڑھ سو برس بعد اُس کی تدوین شروع ھوئی ، رہ گیا قرآن اس کو سارے تاویلات کے مسخ کر دیا ـ

اتنے میں اطلاع ھوئی «حاضری میز پر» ـ

---

۱ ـ آسان تر ـ

فصل بست و چهارم

حجّۃالاسلام شہر میں جا رہے ہیں

حجّۃالاسلام ۔ لو صاحب مجھ کو اجازت دو، مجھے شہر جانا ہے ۔

ابن الوقت ۔ کیا آپ میرے ساتھ کھانا کھانا یا میرے بنگلے میں رہنا خلاف اسلام سمجھتے ہیں ؟

حجۃالاسلام ۔ بس مذہبی چھیڑ چھاڑ رہنے دو ۔ مذہب ایسی چیز نہیں ہے کہ مباحثے اور مناظرے سے کسی کے دل میں اُتار دیا جائے بلکہ «ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء[1]» خداوند تعالیٰ خاص طبعیتں پیدا کرتا ہے جو مذہبی باتوں سے متاثر اور اُس کو قبول کر لیتی ہیں ۔

ابن الوقت ۔ پھر آپ جبریوں کی سی باتیں لائے ۔ اگر خدا خاص طبائع مناسب مذہب پیدا کرتا ہے تو پھر مواخذہ کیوں ہے ؟

حجۃالاسلام ۔ مواخذہ بقدر مناسبت «لا یکلف اللہ نفسا الا ماآتہا[2]» یہ کہ کر حجۃالاسلام اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ ابن الوقت بھی اُٹھا اور کہنے لگا "کیا واقع میں آپ میرے پاس نہیں رہنا چاہتے ؟"

حجۃالاسلام ۔ نہیں بھائی نہیں ۔

۱۔ یہ خدا کی مہربانی ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے ۔
۲۔ اللہ کسی شخص کو تکلیف نہیں دیتا مگر وہیں تک کہ جتنی کی اُس کو سہار دی ہے ۔

ابن الوقت ـ آخر کچھ سبب تو بتائیے ۔

حجۃ الاسلام ۔ بات یہ ہے کہ میرے یہاں ٹھہرنے سے تم کو بھی تکلیف ہوگی اور مجھ کو آسائش نہیں ملے گی ۔

ابن الوقت ـ آپ میری تکلیف کا تو خیال کیجیے نہیں اور آپ اپنی آسائش کے لیے بے تکلف جس طرح کہیے انتظام کر دیا جائے ۔

حجۃ الاسلام ۔ تم کس کس بات کا انتظام کرو گے ۔ اول تو میری نماز ہی کا ٹھکانا نہیں ، جس کمرے میں جاؤ تصویر، بنگلہ کیا ہے خاصہ بت خانہ ہے ۔ پھر تم نے کتّے اس کثرت سے پال رکھے ہیں کہ اذان تک کے دینے کا حکم نہیں اور جب تک مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز نہ پڑھوں ، میرا جی نہیں خوش ہوتا ۔ میں نے اترتے کے ساتھ ہی پہلے تمام بنگلے کو اندر باہر سے بالتفصیل دیکھ لیا ہے ۔ تم سمجھو تو میں ایک دن بھی ایسے مکان میں گزر نہیں کر سکتا ، مجھے کسی طرح کا سبیتا دکھائی نہیں دیتا ۔

ابن الوقت ـ اچھا تو کھانا کھا کر جائیے ۔

حجۃ الاسلام ۔ بس کھانے سے بھی معاف ہی رکھو ۔ میں آپ کے باورچی اور کھانے کا سب حال سن چکا ہوں ۔

ابن الوقت ۔ کیا ہمارا باورچی میلے، کچیلے ، غچلے ، بھٹیاروں سے بھی گیا گزرا ہوا ؟ آپ کھانے کی میز کو ایک نظر دیکھیے تو سہی ۔

حجۃ الاسلام ۔ بھائی جان ! ظاہری صفائی تو بلا شبہ تمہارے کھانے میں بہت ہوگی ۔ میں نے تم کو نہیں دیکھا تو بارہا انگریزوں کو کھاتے ہوئے دیکھا ہے مگر مجھ کو تمہارے

باورچی کی نسبت شبہ ہے ۔

ابن الوقت ۔ بے شک مجھ کو معلوم ہے کہ وہ سب کچھ کھاتا پیتا ہے مگر ہمارے کھانے میں کوئی چیز ایسی نہیں ہوتی کہ آپ اس سے احتراز کریں ۔

حجۃ الاسلام ۔ ارے میاں کیا کہتے ہو ۔ میں نے خود تمھارے یہاں ایک الماری میں شراب رکھی ہوئی دیکھی ہے ۔

ابن الوقت ۔ وہ صاحب لوگوں کے واسطے ہے ۔ میں کبھی شراب نہیں پیتا اور اگر پیوں تو ہلاک ہو جاؤں ۔ میرا پھیپھڑا اس قابل نہیں ۔

حجۃ الاسلام ۔ جب خود تمھارے شراب کا ذخیرہ ہے اور صاحب لوگوں کو پلاتے ہو اور تمھارا باورچی بھی کسی چیز سے احتراز نہیں رکھتا تو مجھ کو تمھارے کھانے کی طرف سے اطمینان نہیں ۔

ابن الوقت ۔ بوائے[1] !

ملازم ۔ یس سر[2] ۔

ابن الوقت ۔ کک[3] کو بلاؤ ۔

کک حاضر ہوا تو ابن الوقت نے پوچھا ''آج کھانے میں کیا کیا ہے ۔''

باورچی ۔ سوپ[4] ۔ مٹن چاپ[5] ۔ کٹ لس[6] ۔ آسٹن[7] (آکس ٹنگ) ۔ بیل ریس[8] (بوائل ریس) ۔ پڈنگ[9] ۔

ابن الوقت ۔ ان چیزوں میں کسی میں شراب پڑتی ہے؟

۱۔ لفظی معنی لڑکا مرادی معنی خدمتگار ۔ ۲۔ جی حضور ۔
۳۔ باورچی ۔ ۴۔ شوربا ۔ ۵۔ انگریزی پسندے ۔ ۶۔ انگریزی قیمہ ۔
۷۔ بیل کی زبان ۔ ۸۔ خشکہ ۔ ۹۔ انگریزی فیرینی ۔

باورچی۔ کسی میں نہیں مگر پڈنگ میں خمیر کے لیے شراب کا بھپارا دینا ہوتا ہے۔

ابن الوقت ۔ پڈنگ نشہ لاتا ہے ؟

باورچی - ذرّہ نہیں۔ باورچی رخصت۔

حجۃالاسلام ۔ آپ نے دیکھا ؟

ابن الوقت۔ کیا دیکھا ؟ آپ کے سامنے باورچی کہ نہیں گیا کہ پڈنگ نشہ نہیں لاتا ۔ اسلام میں شراب کے حرام ہونے کی اصل وجہ نشہ ہے ۔ جب نشہ نہیں تو پھر کیا حرج ہے اور اگر آپ کے نزدیک حرج ہے تو آپ پڈنگ نہ کھائیے ۔

حجۃالاسلام ۔ مجھ پر خدا نہ خواستہ ایسی کیا مصیبت پڑی ہے کہ اپنے گھرکا رزق طیب ، لذیذ چھوڑ کر تمہارا پھیکا ، مشتبہ بساھندا کھانا کھاؤں ۔

ابن الوقت۔ یہ بلا کی تو گرمی پڑرھی ہے ، آپ شہر میں جا کر بے فائدہ اپنی تن درستی کو خطرے میں ڈالتے ھیں۔

حجۃالاسلام۔ میری زندگی ایسی کونسی انوکھی زندگی ہے۔ آخر اتنا بڑا غدار شہر بستا ہے، جو اور سب کا حال وہ میرا حال۔

ابن الوقت ۔ آخر پھر ملاقات کی کیا صورت ہوگی ؟

حجۃالاسلام ۔ تم تو میرے پاس آنے کا قصد کرنا مت کیوں کہ تمھارے دل میں آب وھوائے شہر کا پہلے ھی سے ڈر بیٹھا ہوا ہے۔ کل ہے جمعہ مجھ کو فرصت ہونے کی نہیں ، پرسوں لوگوں سے ملنا ملانا ہوگا ۔ انشاءاللہ اتوار کو دس بجے ، ساڑھے دس بجے میں خود آؤں گا ۔ اگر کوئی وجہ مانع نہ ہو ، ذری اپنے داروغہ کو کل بعد مغرب میرے پاس بھیجنا ، میں اس سے یہاں کے انگریزوں کے کچھ حالات دریافت کروں گا اور تمھارے بھی -

فصل بست و پنجم

حجّۃ الاسلام ساس سے ابن الوقت کے پاس ٹھہرنے کا عذر کرتے ہیں

حجّۃ الاسلام کے بے وقت گھر پہنچنے سے سب کو حیرت ہوئی۔ لوگ اس خیال سے کہ ابن الوقت پاس ٹھہریں گے کھا پی کر سو سلا رہے تھے۔ جوں اُس نے گھر میں قدم رکھا ساس کو کہتے سنا کہ اے ہے اگر کھانا بھی کھا کر نہیں آئے تو اتنی رات گئے اب کیا ہوگا؟ خاگینہ بن سکتا ہے لیکن اس بلا کی گرمی پڑ رہی ہے اور راستے کی حرارت الگ انڈے گرم آگ، نوج کوئی کھائے؛ سویاں بھنی ہوئی تیار ہیں رومالی ہیں اور بُھننے میں بھی کسر نہیں رہی مگر آخر ہے تو میدا حاشاللہ میں تو نہیں دوں گی؛ کھچڑی پیاس بہت لگائے گی۔ اتنے میں تو داماد نے سامنے آکر سلام کے بعد چھوٹتے کے ساتھ ہی کہا کہ اماں جان بڑی زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ بارے کچھ شامی کباب فیرینی کے خونچے بچوں کے لیے لگا رکھے تھے، ٹوکری میں کچھ نان خطائیاں بچ گئی تھیں، سیب کا مربا اچار گھر میں تھا، جلدی سے ماما نے توا رکھ پتلے پتلے دو تین پراٹھے پکا دیے؛ غرض ایسے نا وقت بھی بات کی بات میں جو کھانا سہیا ہو گیا ابن الوقت کے یہاں اہتمام سے بھی میسر نہ ہوتا۔ جتنی دیر داماد کھانا کھاتا رہا ساس پاس بیٹھی باتیں کیا کیں «کیوں بیٹا راستے میں ایسی کہاں دیر لگی کہ تم کو یہ وقت ہو گیا۔ میں تو سمجھی تھی کہ تم کچھ دن رہے سے بھائی کے پاس پہنچ گئے ہو گے»۔

داماد ۔ واقع میں میں نے عصر کی نماز بھائی کی کوٹھی پر پڑھی اور میرا ارادہ اُن ھی پاس ٹھہرنے کا تھا ۔

ساس ۔ پھر ایسی کیا بات ھوئی کہ تم اتنی رات گئے چل کھڑے ھوئے ؟

داماد ۔ اگر مجھ کو بھائی کے پاس ذری سی بھی آسائش کی توقع ھوتی تو میں ھر گز نہ آتا اور یوں سمجھتا کہ سرائے میں نہ ٹھہرا اُن ھی کے یہاں ٹھہرا سہی مگر وھاں تو مسلمان کے کھڑے ھونے تک کا ٹھکانا نہیں ، ٹھہرنا اور رھنا تو درکنار ۔ عصر اور مغرب دو وقت کی نماز میں نے وھاں پڑھی ، میرے دل کو تسلی نہیں کہ نماز ھوئی ھو ۔ اب عشاء کے ساتھ دونوں کا اعادہ کروں گا ۔ آدھ کوس کے گردے میں تو وھاں کہیں مسجد کا پتا نہیں ۔ جماعت تو یوں گئی گزری ھوئی ۔ بنگلے میں مارے تصویروں کے کہیں اتنی جگہ نہیں کہ ایک کونے میں کوئی شخص کھڑا ھو کر دو رکعت پڑھ لے ۔ ناچار برآمدے میں نماز پڑھی تو کس مصیبت سے کہ کتّے اوپر چلے آتے ھیں ۔ دو تین کتّے تو ایسے خوں خوار اور ھیبت ناک تھے کہ اگر بھائی عین وقت پر نہ آ پہنچیں تو ضرور لپک کر میرا ٹینٹوا لیں ۔

ساس ۔ دور پار ، تمھارے دشمنوں کا ۔ پھر یہ لوگ مجھ سے کیا آ آ کر کہتے تھے کہ دشمنوں نے مارے جلن کے بدنام کر رکھا ھے ، جو اُن کو بے دین کہے وہ خود بے دین ۔

داماد ۔ شرع میں نام لے کر تو کسی کے بھی کافر کہنے کا حکم نہیں اور بھائی ابن الوقت تو اپنے تئیں چوری چھپے بھی نہیں کھلے خزانے بکار پکار کر مسلمان کہتے ھیں اور مسلمان ھیں بھی مگر اُن کا رھنا سہنا ، کھانا پینا ، سب کچھ انگریزوں کا سا ھے ، سر مو فرق نہیں ۔

ساس ۔ اے ہے غدر کے دنوں میں کچھ ایسی گھڑی کا پیرا اُس سوئے فرنگی کا آیا تھا کہ بچے کی ست پھیر دی ۔ ہم سے تو ایسا چھپایا ایسا چھپایا کہ دن کو گورے شہر میں گھسے اور رات کو ہم نے جانا کہ سارے غدر ہمارے گھر میں فرنگی چھپا رہا۔ جس وقت فرنگی کو لائے تھے اگر ذرا بھی مجھ کو معلوم ہو تو میں اُس کو کھڑا پانی نہ پینے دوں ۔ خدا جانے کم بخت کہاں سے ہمارے گھر آ مرا تھا، نہ آتا نہ بچہ ہاتھ سے جاتا ۔ آخر میرا صبر پڑا پر پڑا ۔ کسی کی آہ کا لینا اچھا نہیں ہوتا ۔ خدا نے اُس کے پیچھے ایسا روگ لگایا کہ سارے سارے دن اٹوانٹی کھٹوانٹی لیے پڑا رہتا تھا ، آخر کو جاتے ہی بن پڑی ، کالا منہ خدا کرے پھر آنا نصیب نہ ہو۔

داماد ۔ آپ اُس انگریز کو نا حق کوستی ہیں۔ اُس نے تو اتنا بڑا بھاری سلوک اس خاندان کے ساتھ کیا ہے کہ جس کی انتہا نہیں ۔ وہ اگر اس گھر میں آ کر نہ رہا ہوتا تو آج ساری عورتیں رانڈ ہوتیں، تمام بچے یتیم، محلے میں گدھوں کا ہل پھر گیا ہوتا ، مال و اسباب کے نام کسی کو ایک پھوٹی کوڑی نہ ملتی۔ بھائی ابن الوقت کیا دودھ پیتے بچے تھے کہ بہکائے میں آگئے ۔ پڑھے لکھے ، لائق ، ہوشیار، ایک دم سے ڈپٹی کلکٹر کر دیے گئے اور ڈپٹی کلکٹری کو ایسا سنبھالا کہ آج ڈپٹی کلکٹروں میں کوئی اُن کا مدمقابل نہیں ۔ ایسے شخص کو کون بہکا سکتا ہے اور وہ کیوں کسی بہکائے میں آنے لگا ۔ وہ چاہے تو آپ ہزاروں کو بہکا کر چھوڑ دے اور پھر کیا بہکائے میں آ گئے کرستان ہو گئے ؟ انگریزوں کے مذہب کو تو ایسا ایسا لتاڑتے اور لتھیڑتے ہیں کہ اُن ہی کا جی جانتا

ہوگا ۔ انگریز اُن کو کیا بہکاتے وہ تو اُلٹے اُن کی اس وضع سے جلتے اور خار کھاتے ہیں اور سارا جھگڑا تو اسی بات کا ہے ۔ آج وہ ہندوستانی بن کر رہیں، صاحب کلکٹر سے صفائی کرا دینے کا میرا ذمہ ۔

ساس ۔ پھر بیٹا تم ہی کچھ بھائی کو سمجھاؤ ۔

داماد ۔ میں تو ہزار دفعہ سمجھاؤں مگر کوئی سمجھنے والا بھی بنے ۔ یہ جو صورت پیش آئی اس کا تو کسی کو خیال بھی نہ تھا مگر ہاں بھائی ابن الوقت کی غیر معمولی ذہانت اور بلند نظری دیکھ کر مجھے اچھی طرح سے یاد ہے بڑے حضرت[1] فرمایا کرتے تھے کہ اس لڑکے کی حالت خطرناک ہے ، یہ بڑا ہو کر نہیں معلوم کیا کرے گا !

ساس ۔ ابنّ صاحب[2] مجھ سے کہ گئے ہیں کہ وہ فرنگی اُن کی ہوشیاری دیکھ کر لٹو ہو گیا تھا اور وہی اُن کو اکسا کر لے گیا ۔ اگر یہ ساتھ نہ دیں تو فرنگیوں کے لیے دلّی کبھی نہ لی جائے ۔ پھر میں بھی کہوں گی اُس فرنگی نے میرے بچے کو کچھ کر دیا ۔ خدا اُس کو کھووے ۔

داماد ۔ کر کیا دیا! ایک دم سے ڈپٹی کلکٹر کر دیا ، جاگیردار کردیا ۔

ساس ۔ نہیں بیٹا کچھ جادو کر دیا ۔

یہ سن کر حجّۃ الاسلام ہنسنے لگا ۔ ”آپ کو یہ بھی معلوم ہے انگریز بالکل جادو کے قائل نہیں ۔“

ساس ۔ کیا جانیں بھائی سنتے ہیں کہ فرنگی بڑے

---

۱ ۔ حجۃ الاسلام کے خسر یا ابن الوقت کے پھپا ۔
۲ ۔ ابن الوقت کے کوئی قریب کے رشتہ دار ہیں ۔

جادوگیرے ہوتے ہیں ، جادو کے زور سے سارے ملک لیتے چلے جاتے ہیں اور اُن کو ایسا جادو آتا ہے کہ ایک پل میں ہزاروں کوس کی خبر منگوالیں۔

داماد ۔ وہ عقل کا جادو ہے ۔

ساس ۔ اچھا تم اُن کی بادشاہ زادی کو لکھو۔

داماد ۔ کیا ؟

ساس ۔ یہی کہ تمھارے فرنگیوں نے ایسا ظلم کر رکھا کہ ہمارے آدمی کو بہکا کر فرنگی بنا لیا ہے ۔ اگر وہ سچ مچ کی بادشاہ زادی ہے تو ضرور ہماری فریاد لے گی لیکن بعضے آدمی کہتے ہیں بادشاہ زادی کو مت لکھواؤ ، کمپنی کو لکھواؤ ؛ کمپنی اُس کی بیٹی ہے اور بادشاہ زادی نے یہ ملک بیٹی کے جہیز میں دے ڈالا ہے ۔ اب کمپنی کا حکم چلتا ہے سو تم کو تو اصل حال معلوم ہوگا۔ کسی ایسے کو لکھو کہ بس دیکھتے کے ساتھ ہی حکم کر دے۔ بھلا کہیں خدا کی خدائی میں ایسا بھی اندھیر ہوا ہے کہ آپ ہی تو فرنگیوں نے بلایا اپنے میں ملایا اور دوسرا فرنگی ایسا ظالم آیا کہ آتے کے ساتھ لگا دشمنی کرنے ۔ دیکھنا تم بادشاہ زادی کو یہ ساری باتیں لکھوانا' بھولنا مت ۔ ذرا یہاں کے فرنگیوں کی بھی تو حقیقت کھلے کہ کسی بھلے آدمی کو دھوکا دینا ایسا ہوتا ہے ؛ بادشاہی کیا گئی سارے فرنگی بے سرے ہو گئے ۔

داماد ۔ جو تدبیر کرنے کی ہو گی بھائی ابن الوقت کب اُس سے غافل ہوں گے اور اُن سے بہتر سوجھے گی بھی کس کو۔ آپ تو صرف خدا کی بارگاہ میں دعا کرتی رہیے ، ہزار تدبیروں کی ایک تدبیر تو یہ ہے ۔ بھائی کے ذمّے کوئی الزام نہیں۔

رشوت وہ نہیں لیتے ، کام چور وہ نہیں ، نالائق نہیں ، کلکٹر نہیں، کلکٹر کا باوا بھی ہو تو اُن کا کچھ نہیں کر سکتا ۔ سارا فساد صرف انگریزی وضع کا ہے ۔ خدا مقلب القلوب ہے ، وہی اُن کے دل کو پھیرے تو پھیرے ۔

فصل بست و ششم

حجّۃ الاسلام نے صاحب کلکٹر مسٹر شارپ سے ابن الوقت کی صفائی کرا دی

حجّۃ الاسلام جب اپنے ضلع سے چلنے لگا تو اُس کو اس بات کا خیال آیا تھا کہ ایسے وقت میرے جانے سے خواھی نہ خواھی لوگ سمجھیں گے کہ بھائی کی مدد کو آئے ھیں مگر میں کس قابل ھوں اور اُن کی کیا مدد کر سکوں گا۔ بارہ دری کے لیے اُنھوں نے لکھا ھے سو نہ تو اُس کے خریدنے کا مجھ کو مقدور ھے اور نہ میں اتنے بڑے مکان میں رہ سکتا ھوں۔ اس مکان میں رھنے کو چاھییں امیری ٹھاٹ۔ ساری عمر رھا پردیس، ادھر کے حکّام میں کسی سے معرفت نہیں، ملاقات نہیں، جاتا ھوں تو میرے جانے سے اُن کا کچھ مطلب نہیں نکلتا اور نہیں جاتا تو مروّت تقاضا نہیں کرتی۔ خیر خداھی آبرو رکھنے والا ھے، وہ بڑا مسبب الاسباب ھے، عجب نہیں غیب سے کوئی سامان ھو اور خدا مجھ کو بھائی ابن الوقت کی کاربراری کا ذریعہ ٹھہرائے۔ اپنے صاحب کلکٹر سے رخصت ھونے گیا تو اُنھوں نے پوچھا آپ ساری رخصت دلّی میں صرف کریں گے یا کہیں اور بھی جانے کا ارادہ ھے۔

حجۃالاسلام۔ آپ کو معلوم ھے کہ میں حج کے بعد بمبئی سے کلکتے ھو کر یہیں چلا آیا تھا اُس وقت دلّی جانا نہیں ھوا۔ اب تو سیدھا دلّی جاؤں گا اور غالب ھے کہ رخصت بھر وھیں رھنا ھو گا۔ انشاءاللہ تعالیٰ دسویں پندرھویں عریضہ خدمت

میں بھیجتا رہوں گا۔

صاحب کلکٹر۔ نہیں معلوم ان دنوں دلّی میں حاکم ضلع کون ہے؟

حجۃ الاسلام۔ شارپ صاحب نامی کوئی صاحب ہیں۔

صاحب کلکٹر۔ ولیم تھیاڈور شارپ؟

حجۃ الاسلام۔ ڈبلیو۔ ٹی تو اُن کے نام کے ساتھ لکھا جاتا ہے، وہی ہوں گے۔

صاحب کلکٹر۔ وہ تو ڈیرہ اسمعیل خان کی طرف تھے۔

حجۃ الاسلام۔ کہیں اسی طرف سے بدل کر آئے بھی ہیں۔

صاحب کلکٹر۔ اگر ولیم تھیاڈور شارپ صاحب ہیں تو میرے رشتہ دار ہیں۔ میری خالہ زاد بہن اُن کو بیاہی ہے مگر میم صاحب ان دنوں ولایت میں ہیں۔ اگر آپ صاحب سے ملنا چاہیں تو میں اُن کے نام خط لکھ دوں۔

حجۃ الاسلام۔ میں صاحب کی خدمت میں ضرور حاضر ہوں گا۔ اول تو ہمارے شہر کے حاکم دوسرے آپ کے رشتہ دار۔

صاحب کلکٹر نے شارپ صاحب کے نام کی چٹھی اور اپنی ایک تصویر حجۃ الاسلام کو دی کہ چٹھی کے ساتھ یہ تصویر بھی صاحب کو دیجیے گا۔ چٹھی میں حجۃ الاسلام کے متعلق یہ مضمون تھا کہ میں اس علاقے کے تمام ڈپٹی کلکٹروں میں ان کو دل سے پسند کرتا ہوں، اس طرف تمام سرکاری محکموں میں جھڑا بنگالی بابو ہیں، گویا سرکاری خدمتوں کے ٹھیکہ دار ہیں۔ مجھ کو اس قوم سے دلی نفرت ہے۔ انگریزی پڑھ کر یہ لوگ ایسے زبان دراز اور گستاخ اور بے ادب اور شوخ

ھوگئے ھیں کہ سرکاری انتظام پر بڑی سختی کے ساتھ نکتہ چینیاں کرتے ھیں۔ اگر کہیں ان لوگوں میں ھندوستان کے بلند حصے کے باشندوں کی طرح دلی جرات اور دلیری بھی ھوتی تو انھوں نے انگریزی حکومت کا جُوا اپنی گردنوں پر سے کبھی کا اُتار کر پھینک دیا ھوتا مگر شکر ھے کہ ان کی ساری بہادری زبانی ھے۔ تا ھم اُن کا بڑبڑانا سخت ناگوار ھوتا ھے اور میں ھمیشہ افسوس کیا کرتا ھوں کہ میں نے ایسے خود سر نا احسان‌مند اور بد دل علاقے کو کیوں اختیار کیا تھا۔

حجۃ الاسلام کی وضع کے آدمی یہاں بہت کم دکھائی دیتے ھیں۔ یہ اپنی پرانی وضع کو بہت مضبوطی کے ساتھ پکڑے ھوئے ھیں اور اس کو دل سے پسند کرتے ھیں اور بندر کی طرح نقل کرنے کو ذلیل کام جانتے ھیں اور میں ان کو اس رائے کی وجہ سے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتا ھوں۔ غدر کے دنوں میں یہ عرب میں تھے لیکن نہایت بے باکی کے ساتھ جو ھر ایک سچے مسلمان میں ھوتی ھے، غدر کی نسبت اپنی یہ رائے ظاھر کیا کرتے ھیں کہ گورنمنٹ انگریزی نے مسلمانوں کی بڑی دل شکنی کی، اُس نے ھندو مسلمانوں کو ایک نگاہ سے دیکھا اور دونوں قوموں کی حالتوں کے اختلاف پر نظر نہ کی۔ وہ کیا عمدہ ایک مثال دیتے ھیں کہ حکومت یعنی سلطنت بمنزلہ ماں کے دودھ کے ھے، مسلمان بجائے اُس بچے کے ھیں جس کا دودھ حال میں چھڑایا گیا۔ اُس کو دودھ کا مزہ بہ خوبی یاد ھے اور وہ اُس کے لیے پھڑکتا ھے۔ مسلمانوں کے مقابلے میں ھندو ایسے ھیں جیسے دو ڈھائی برس کے بچے کے آگے سو برس کا بڈھا۔ اُس نے بھی کبھی قرن گزرے ماں کا دودھ پیا تھا مگر اب کیا مدت ھائے دراز سے اُس کو یہ بھی خبر نہیں کہ پھیکا تھا یا میٹھا۔ کیا اگر ایک

دودھ چھٹا ہوا بچہ کھچڑی کھانے میں منہ بناتا ہے تو اس پر سختی کی جائے گی کہ تو بڑے آدمیوں کی طرح چاؤ سے کیوں نہیں کھاتا ؟

سینکڑوں برس سے ہندوؤں کے پاس نہ لٹریچر[1] ہے اور نہ علم اُن کو انگریزی کا اختیار کر لینا کیا مشکل تھا ، جیسے ایک برہنہ آدمی ایک لنگوٹی کی بھی بڑی قدر کرتا ہے لیکن مسلمان اپنی کلاسیکل لینگوئج (ام الالسنہ) عربی پر واجب فخر کرتے ہیں جس کے بدون اردو اور فارسی زبانیں بالکل پھیکی معلوم ہوتی ہیں ۔ لاکھوں مسلمان قرآن کی بلاغت پر سر دُھنتے اور اس کو زبانی یاد رکھتے ہیں ، مسلمانوں کا لٹریچر زندہ لٹریچر ہے نہ سنسکرت اور لیٹن کی طرح کتابوں میں مدفون ۔ اُن کے علوم زمانے کے انقلاب کی وجہ سے مرجھا گئے ہیں مگر مرے نہیں؛ پس اگر مسلمان انگریزی سے کنارہ کشی کرتے رہے تو اُن کے پاس کنارہ کشی کرنے کی وجہ تھی ۔

حجۃ الاسلام اس بات پر بڑا زور دیتے ہیں کہ ظاہر میں انصاف اسی کا متقاضی ہے کہ ہندو مسلمانوں کے جملہ حقوق برابر سمجھے جائیں لیکن نظر غور سے دیکھا جاتا ہے تو یہ انصاف اس راجا کے انصاف سے زیادہ تعریف کا مستحق نہیں جس نے اپنے علاقے میں تمام دھان پانچ پنسیری کے حساب بکوائے تھے ۔ مسلمان اس ملک کے اصلی باشندے نہیں ، وہ ملک کو فتح کرنے آئے اور رہ پڑے ۔ اُنھوں نے زمینداریوں پر قبضہ کرنے کا ایک لمحے کے لیے بھی خیال نہیں کیا اور نہ ان کو خیال کرنے کی ضرورت تھی ۔ ذرائع معاش میں سے اُن دنوں نوکری زیادہ معزز سمجھی جاتی تھی اور وہ ان کی

---

۱ ۔ علم ادب یعنی زبان دانی ۔

مٹھی میں تھی۔ زوال سلطنت سے معاش کا وہ ایک ذریعہ بھی اُن کے ھاتھ سے جاتا رھا جب کہ ھندو دوسرے تمام ذرائع پر بدستور قابض ھیں اور پھر نوکری میں آدھے کے دعوی دار، وہ بھی کہنے کو کیوں کہ نفس الامر میں ھندو تین چوتھائی سے زیادہ زیادہ نوکریوں پر مسلّط ھیں۔

یہ جو کچھ میں نے لکھا اگر میں نے سمجھنے میں غلطی نہ کی ھو حجۃ الاسلام صاحب کی شخصی رائے ھے۔ مجھ کو ان سے کسی کسی بات میں اختلاف بھی ھے لیکن اگر آپ ان کو بات کرنے کا موقع دیں گے تو آپ کوئی مضمون ایسا نہ پائیں گے کہ اُس پر وہ معقول رائے نہ دے سکیں۔ وہ بڑے خوش تقریر آدمی ھیں سننے والوں کو بہت جلد اپنی طرف متوجہ کر لیتے ھیں۔

ایک بات حجّۃ الاسلام صاحب نے اسی قسم کی مجھ سے اور بھی کہی تھی اور وہ بھی دل کو لگتی ھوئی سی ھے۔ وہ ھندوؤں پر اپنی قوم کو اس وجہ سے بھی ترجیح دیتے ھیں کہ مذھب اسلام سلف رسپکٹ سکھاتا ھے یعنی انسان کو اُس کی نظر میں معزز کرتا ھے؛ مسلمان اس میں انسانیت کی توھین سمجھتا ھے کہ اگر کوئی شخص اُس کے ایک کلّے پر طاچہ مارے تو عیسائی کی طرح وہ دوسرا کلّہ بھی اُس کے سامنے کر دے کہ لے اور مار۔ اسلام نے خدا کی توحید کو بالکل نتھار دیا ھے اور کسی طرح کا شائبہ اس میں باقی نہیں رکھا۔ مسلمان سوائے ایک خدا کے جس کو کوئی انسان دیکھ نہیں سکتا موجودات عالم میں سے ارضی ھوں یا سماوی کسی چیز کی عبادت یعنی اعلیٰ درجے کی تعظیم نہیں کرتا۔ حجّۃ الاسلام صاحب کے بیان کے مطابق اسلام خود داری اور بے تکلفی اور سادگی اور توکّل اور صبر کا مجموعہ ھے لیکن ھندو بندر اور سانپ اور گائے اور پیپل اور تلسی اور

آگ اور پانی اور پتھر اور چاند اور سورج ہر چیز کے آگے ماتھا ٹیکنے کو موجود ہے جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہیں کہ آدمی سب میں ادنیٰ درجے کا مخلوق ہے اور اُس کو دنیا میں ادنیٰ بن کر رہنا چاہیے۔ حجۃ الاسلام صاحب اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ مسلمان کار فرمائی اور حکومت کے لیے بنایا گیا ہے جس طرح ہندو کار کنی اور اطاعت کے لیے۔ وہ کہتے ہیں خوشامد اور ابتذال اور دناءت کی باتیں مسلمان سے ہو نہیں سکتیں اور اگر کوئی مسلمان کرتا ہو تو جان لینا کہ مذہب میں پکّا نہیں اور سرکاری خدمتوں میں مسلمانوں کی کمی کا ان کے نزدیک ایک سبب یہ بھی ہے۔ میں تو ان کو ایسی باتوں میں اکثر چھیڑا کرتا ہوں اس غرض سے کہ کچھ کہیں، تو ایک دن گرم ہو کر بولے کہ مسلمان چاہیں مٹ ہی کیوں نہ جائیں مگر اُن کے دل پر سے یہ بات تو نہیں مٹے گی کہ انھوں نے چھ سو برس اس ملک میں حکم رانی کی ہے۔

با ایں ہمہ حجّۃالاسلام صاحب کے خیالات گورنمنٹ انگریزی کے ساتھ نہایت درجے خیرخواہانہ ہیں اور مجھ کو کامل یقین ہے کہ اگر وہ ۱۸۵۷ء کے غدر میں اُن اضلاع کی طرف ہوتے تو اپنے بھائی ابن الوقت کے برابر یا اُن سے بھی بڑھ کر سرکار کی خیرخواہی کا کوئی کار نمایاں کرتے۔ اُنھوں نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے عرب میں اسلامی سلطنت کا نمونہ دیکھا ہے۔ ملک نہایت تباہی کی حالت میں ہے اور افسوس ہے کہ جس جگہ مسلمانوں کی قوم پیدا ہوئی اور جہاں اُن کی سلطنت کی بنیاد پڑی اُس کا یہ حال ہو کہ باوجود کہ ہر سال بلاناغہ لاکھوں مسلمان جاتے ہیں مگر نہ امن ہے اور نہ آسائش، صرف دوسرے ملکوں کے صدقات پر وہاں کے لوگوں کی گزران

ہے ، وہ لوگ تنزل کے ایسے درجے میں پہنچ گئے ہیں کہ نہ صرف بدترین نمونے مسلمانوں کے ہیں بلکہ بدترین نمونے انسانوں کے ۔

یہ چٹھی" مسٹر شارپ پاس جمعے کی شام کو پہنچی ۔ اُنھوں نے سمجھا کہ خود حجّۃ الاسلام لے کر آئے ہیں اور اسی خیال سے پڑھنے کے ساتھ باھر نکل آئے۔ مگر معلوم ہوا کہ ملاقات کے لیے وقت فرصت دریافت کیا ہے ۔ جواب میں کہلا بھیجا کہ اوقات کچہری کے علاوہ جس وقت جی چاہے ۔ اگلے دن ایسے کوئی پونے سات بجے ہوں گے، حجۃ الاسلام پالکی میں سے اُترتے ہی تھے کہ شارپ صاحب ہوا خوری سے واپس آئے ۔ دونوں نے ایک دوسرے کو اٹکل سے جان لیا ۔ یوں تو شارپ صاحب کا معمول تھا کہ ہوا خوری سے آئے پیچھے اچھے کامل ایک گھنٹے بعد ملاقاتیوں کی نوبت پہنچتی تھی یا گھوڑے سے اُترنے کے ساتھ ہی اردلی کو حکم دیا کہ جو صاحب پالکی میں آئے ہیں اُن کو اندر بھیج دو ۔ صاحب سلامت ہوئی۔ غور سے دیکھا، مہربانی سے بٹھایا اور کہا کہ وکٹر صاحب نے چٹھی میں آپ کے ایسے تفصیلی حالات لکھے ہیں کہ میں آپ سے اجنبی محض ہو کر نہیں ملتا ۔ صاحب کی رائے آپ کی نسبت بڑی عمدہ ہے اور آپ اُس کے مستحق ہیں ۔

حجۃ الاسلام ۔ اُن کی قدر دانی اور آپ کی بندہ نوازی ہے ۔ وکٹر صاحب جتنی میری قدر کرتے ہیں میں اُن کی خوشنودی کی اس سے بہت زیادہ قدر کرتا ہوں ۔

شارپ ۔ ڈپٹی ابن الوقت آپ کے کیسے بھائی ہیں۔

حجۃ الاسلام ۔ میرے تو وہ کسی طرح کے بھی بھائی نہیں

مگر ہاں میری بی بی اُن کی پھوپی زاد بہن ہے ۔ اس رشتے سے چاہے مجھ کو بھی اُن کا بھائی سمجھ لیجیے ۔

شارپ ۔ وہی تو کہوں نہ تو آپ کی اُن کی صورت ملتی ہے اور اُن کی وضع تو بالکل صاحب لوگوں کی سی ہے ۔ آپ ٹھہرے تو ابن الوقت صاحب ہی کے پاس ہوں گے ؟

حجۃ الاسلام ۔ نہیں میں تو شہر میں ٹھہرا ہوں ۔

شارپ کیوں صاحب آپ کو تو سب خبر ہوگی؟ ابن الوقت صاحب نے اس وضع کے اختیار کرنے میں کیا مفاد سمجھا ۔

حجۃ الاسلام ۔ بات یہ ہے کہ جن دنوں ابن الوقت کالج میں پڑھتے تھے تبھی سے اُن کو انگریزیت کی طرف میلان سا تھا بلکہ ہم لوگ اُن کو چھیڑا بھی کرتے تھے مگر اُن کی یہ کیفیت تھی کہ ہر بات میں اَد بَدا کر انگریزی کی جانب داری کیا کرتے ۔ اُن دنوں مجھ کو خوب یاد ہے نیچرل فلاسفی[1] ، ایسٹرانمی کی کتابیں[2] انگریزی سے ترجمہ ہو کر اورینٹل کلاسوں[3] میں نئی نئی جاری ہوئی تھیں تو زمین کی کرویت ، اُس کی گردش ، کشش ثقل ، نظام شمسی وغیرہ مسائل سے ہم سب کو شروع شروع میں اچنبھا سا ہوتا تھا اور اکثر ابن الوقت کو ہم لڑکے لڑکے باتوں باتوں میں بند کر کر دیتے مگر یہ شخص قائل نہ ہوتا اور ہار کر کہتا تو یہ کہتا کہ اگرچہ میں تم کو سمجھا نہیں سکتا لیکن انگریزی اصول غلط ہو ہی نہیں سکتے ؛ الغرض طفولیت سے اس شخص کے مزاج کی اُفتاد اسی طرح کی واقع ہوئی ہے ۔ اب غدر میں اور اس کے بعد نوبل

---

۱ ۔ علم طبعی ۔ ۲ ۔ علم ہیئت ۔ ۳ ۔ وہ جماعتیں جن میں مشرقی زبانیں عربی فارسی اردو سنسکرت پڑھائی جاتی ہوں ۔

صاحب سے اختلاط ہوا زیادہ، میرے نزدیک تو اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہو گیا؛ مفاد و مطلب پر نہ پہلے نظر تھی نہ اب ہے۔

شارپ۔ آپ کی رائے بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے اور بدھ بھی ملتی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ بڑائی کے مارے اس وضع کو اختیار کیا ہے۔

حجۃ الاسلام۔ بڑائی تو خدا کی ہے مگر خدا نے آپ لوگوں کو دنیاوی بڑائی دی ہے تو آپ کی سبھی چیزوں میں بڑائی کی شان ہے یہاں تک کہ لباس میں تو بلاشبہ؛ جو اُس لباس کو پہنے گا لوگوں کی نظروں میں بڑا دکھائی دے گا مگر میں نہایت وثوق کے ساتھ آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ شیخی، غرور و تکبر، خود پسندی یہ باتیں تو بھائی ابن الوقت کو چھو نہیں گئیں، جس نے کہا جھک مارا۔ میں اُن کے ساتھ بچپن سے کھیلا ہوں، پڑھا ہوں، رہا ہوں، مجھ سے بہتر کوئی اُن کی خصلت اور عادت کو جان نہیں سکتا۔ غدر سے اُن کے مزاج میں کچھ شیخی سا گئی ہو تو خبر نہیں، ورنہ غدر سے پہلے تک تو اُن میں شیخی کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ اگر یہ خیال کیا جائے کہ نوکری اور زمینداری کے برتے پر شیخی میں آ گئے تو غدر سے پہلے بھی وہ کچھ گرے پڑے نہ تھے۔ نواب معشوق محل بیگم کی سرکار میں تمام سیاہ و سفید کے مختار کل تھے اور خاندانی تعزّز اور مقدرت دونوں کے لحاظ سے اُس وقت بھی عمائد شہر میں سمجھے جاتے تھے۔ کیا اُن کے پاس متعدّد نوکر نہ تھے، متعدّد سواریاں نہ تھیں، متعدد حویلیاں نہ تھیں؟ چار پانچ بنگلوں کا مول تو اُن کی ایک بارہ دری ہی کھڑی ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ تنخواہ بھاری نہ تھی،

سو بادشاهی سرکاروں میں اُن کی کیا تخصیص ہے ، سبھی کی تنخواهیں تھوڑی هوتی تھیں مگر انعام اکرام ملا کر دس روپے کا نوکر ایسی اچھی شان سے رهتا تھا کہ همارے یہاں سو کے تنخواہ دار کو بھی وہ بات نصیب نہیں؛ غرض شیخی کا الزام تو نرا ڈھکوسلا ہے، خود داری کہیئے تو ایک بات بھی ہے لیکن خود داری میرے نزدیک لازمۂ شرافت طبیعت ہے ۔ آدمی آدمی سب برابر، تاهم انتظام الٰہی اس کا مقتضی ہے کہ ان میں مراتب کا تفرقہ هو؛ کوئی باپ ہے کوئی بیٹا ہے، کوئی حاکم ہے کوئی محکوم، کوئی آقا ہے کوئی نوکر، کوئی امیر ہے کوئی غریب ۔ اگر خود داری نہ هو تو دنیا کا انتظام درهم برهم هو جائے؛ خود داری کے معنی یہ هیں کہ آدمی جس درجے کا هو اپنے تئیں اسی درجے کے مناسب رکھے، کسی کو خدا نے سواری کا مقدور دیا ہے تو ضرور ہے کہ وہ ضرورت کے وقت سواری سے کام لے ۔ پھر ایک بات اور ہے کہ انگریز اور هندوستانی دونوں قسم کے حاکم هیں مگر آپ لوگوں کی اور هماری حکومت میں بڑا فرق ہے۔ آپ لوگ ساری عمر هندوستان میں رهیں پھر بھی اجنبی کے اجنبی، برخلاف هم لوگوں کے کہ هم ٹھہرے اس ملک کے باشندے؛ رشتہ داری، قرابت مندی، دوستی، قوم، مذهب، راہ و رسم، طرح طرح کے تعلقات همارے رعایا کے ساتھ هیں ۔ پس کام کرنے میں جو آزادی آپ لوگوں کو حاصل ہے هم کو خواب میں بھی میسر نہیں ۔ هم لوگوں کی حالت بڑی نازک ہے اور بھائی ابن الوقت پر تو ایک سختی اور ہے کہ اپنے هی شہر میں اُن کو کام کرنا پڑا اور کام بھی تحقیقات بغاوت کا کہ بہ حساب کوئی متنفس اس سے بری نہیں ۔ اُنھوں نے اپنی

صفائی کی حفاظت کے لیے یا خود داری کے طور پر ملنے جلنے میں کمی سی کی ہو گی ، اس کو لوگوں نے شیخی سے تعبیر کر لیا مگر یہ تو فرمائیے آپ نے بھی اُن کی کوئی شیخی کی بات دیکھی ؟

شارپ صاحب نے وہ دریا گنج کا قصہ بیان کیا ۔

حجۃالاسلام ۔ ہر چند وکٹر صاحب میرے حال پر حد سے زیادہ مہربانی فرماتے ہیں مگر میں اُن کا ادب بھی کرتا ہوں اور نہ صرف اُن کا بلکہ کل حکّام انگریزی کا کیوں کہ میں نے سمجھ لیا ہے کہ یہ برتری اُن کو خدا نے دی ہے اور خدا کے کلام پاک میں حاکم وقت کی اطاعت کا حکم صریح موجود ہے ۔ لیکن گستاخی معاف اگر دریا گنج کے نکّڑ پر بھائی ابن الوقت کی جگہ آپ یا وکٹر صاحب مجھ کو اچانک مل گئے ہوتے تو میں بھی وہی کرتا جو بھائی ابن الوقت نے کیا اور میں یقین کرتا ہوں کہ وکٹر صاحب کے ذہن میں ایک لمحے کے لیے بھی شبہ نہ گزرتا کہ میں نے گستاخی کی ۔

شارپ ۔ ہم بھی آپ کی نسبت ایسا شبہ نہ کرتے کیوں کہ آپ ہندوستانی ہیں اور ہندوستانی وضع رکھتے ہیں لیکن آپ کے بھائی ہندوستانی ہو کر صاحب لوگ بننا چاہتے ہیں اور چاہے گستاخی کے ارادے سے نہ ہو مگر ہم لوگوں کو اُن کی تمام باتوں پر گستاخی کا احتمال ہوتا ہے ۔ اُن کی وجہ سے ہم کو دوسرے ہندوستانیوں سے ملنے میں بڑی مشکل پیش آتی ہے ۔ یہ لباس ہمارا قومی شعار ہے اور اگر کوئی ہندوستانی ہمارے جیسے کپڑے پہنے تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری نقل کرتا ہے یا ہم کو چھیڑتا اور چڑاتا ہے ۔ کوئی ہندوستانی ہمارے لباس کو جس میں اُس کو کسی طرح کی آسائش نہیں ، بے وجہ

نہیں اختیار کرے گا اور سوائے اس کے کہ اُس کے دل میں ہمارے ساتھ برابری کا داعیہ ہو اور کیا وجہ ہو سکتی ہے - یہ ساری تدبیر انگریزوں کو ذلیل اور اُن کی حکومت کو ضعیف اور اُن کے رعب کو بے قدر کرنے کی ہے - آپ لوگ بھی اپنے سے کم درجے والے کو برابری کی حالت میں نہیں دیکھنا چاہتے تو ہم اپنی رعیت کو جسے ہم نے بہ زور شمشیر زیر کیا ہے کیوں اپنی برابری کرنے دیں گے ؟ آج کو تو ابن الوقت صاحب ہیں ، کل کو ایک محرّر ، پھر ایک چپڑاسی ، پھر ایک قلی ، سب ہماری نقل کریں گے - اس کے یہ معنی کہ ہم سلطنت سے دست بردار ہو کر ولایت کا راستہ لیں - نہیں نہیں ! ایسا نہ ہوا ہے نہ ہوگا اور چوں کہ میں حاکم ضلع ہوں میرا فرض ہے کہ حکومت انگریزی کے مقابلے میں کسی کو سر نہ اُٹھانے دوں ! صدر والے اندھے ہیں ، اُن کو لوگوں سے واسطہ نہیں پڑتا لیکن اُن کو سمجھایا جائے گا - صرف نوبل صاحب کے خیال سے میں نے اب تک درگزر کی لیکن اب میں دیکھتا ہوں تو سخت رپورٹ کرنے کی ضرورت ہے - آپ اگر اپنے بھائی کو سمجھا سکیں تو شاید اُن کے حق میں بہتر ہوگا -

حجۃالاسلام - میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ اس گھڑی تک مجھ سے اور بھائی ابن الوقت سے تبدیل وضع کے بارے میں تحریراً یا تقریراً کوئی بات نہیں ہوئی - جب اوّل اوّل اُنھوں نے اپنی وضع بدلی ، میرے پاس دلّی سے خط پر خط جانے شروع ہوئے مگر مجھ کو ابن الوقت کی طبیعت کا ابتدا سے حال معلوم تھا اور میں خوب جانتا تھا کہ یہ شخص کسی کے سمجھانے سے سمجھنے والا نہیں - میں نے ایک کان تو کیا بہرا اور دوسرا

کیا گونگا ۔اور خبر نہ ہوا کہ کس کو بلاتے ہیں۔ تبدیل وضع کے پیچھے ساری دنیا نے تو اس شخص کو ملامت کی ؛ کرسٹان کہا ، بے دین کہا اور اب تک کہے جاتے ہیں ، برادری سے نکال دیا ، کوئی اُس کے ہاتھ کا چُھوا پانی تھوڑا ہی پیتا ہے ، کنبہ چُھوٹا ، رشتہ دار چُھوٹے ، دوست آشنا چُھوٹے ، غرض رسوائی اور فضیحت کا کوئی درجہ باقی نہیں رہا لیکن یہ عزیز نہ سمجھا پر نہ سمجھا ۔ اب فرمائیے کہ کہنے کا کیا محل اور سمجھانے کا کون سا موقع ہے؟ وہ تو وہ ، لوگ تو ہم لوگوں کے ساتھ ملنے میں بھی مضایقہ کرتے ہیں ۔ میرے لڑکے کی نسبت کا ایک جگہ پیام تھا ، بہت دنوں بات لگی رہی ، طرف ثانی کو بھی دل سے منظور تھا مگر آخر جواب دیا کہ ہمارے یہاں چار لڑکیاں بیاہنے کو بیٹھی ہیں ، چاروں کی تمہارے یہاں کھپت ہوسکتی تو مضایقہ نہ تھا ، ایک کی تمہارے یہاں کرکے ہم کو سارے شہر میں نکّو بننا پڑے گا ۔ اسی سے آپ قیاس کرسکتے ہیں کہ ہندوستانیوں کی سوسائٹی میں ہم لوگوں کی کس قدر بے عزتی ہو رہی ہے مگر کیا کریں کچھ اپنے اختیار کی بات نہیں ۔ میں تو اسی غصّے کے مارے دلّی آتا نہ تھا لیکن بھائی ابن الوقت کی طرح وطن اور رشتہ داروں کو چھوڑا نہیں جاتا ۔ بھائی ابن الوقت کی والدہ تو اُن کو چھوٹے سے چھوڑ کر مر گئی تھیں ، اُن کو پُھوپھی نے یعنی میری ساس نے پالا ۔ اُن کی تبدیل وضع سے پھوپھی کے دل پر جو صدمہ ہوا ہے بس عرض کرنے کے قابل نہیں ۔ دو برس سے وہ مجھ کو بلا رہی تھیں پر میں نے ہی آنے کی ہاسی نہ بھری ۔ اب جو سنا کہ بھائی ابن الوقت پر قرض خواہوں کا نرغہ ہے اور بارہ دری بیچنے کو ہیں تو میں نے زیادہ بے رخی کرنا خلاف شیوۂ انسانیت

سمجھا ، چلا آیا ۔

شارپ ۔ ابن الوقت صاحب اور قرض دار!

حجۃ الاسلام ۔ قرض دار بھی ہزار دو ہزار کے نہیں، دس ہزار سے کچھ زیادہ ہی زیادہ تو گڑ والوں کا ہے ۔

شارپ ۔ ہم تو سنتے تھے کہ ابن الوقت صاحب پاس بڑا سرمایہ ہے، ساری دولت تو بیگم صاحب کی اُنھوں نے سمیٹی اور تحقیقات بغاوت میں بھی بہت کچھ پیدا کیا ۔

حجۃ الاسلام ۔ بھلا آپ کی عقل قبول کرتی ہے کہ انسان کے پاس سرمایہ ہو اور وہ مہاجن کا بیاج بھرے اور ایسے مکان کو بیچنا چاہے جو اُس کے بزرگوں کی حشمت اور ثروت کی یادگار ہے اور نوکری میں کچھ پیدا کیا ہوتا تو آپ کی ناخوشی اعلیٰ ادنیٰ سب کو معلوم ہے، دینے والے کبھی کے آمڈ پڑے ہوتے ۔ غرض بھائی ابن الوقت کے بارے میں آپ کو جتنی خبریں پہنچی ہیں اُن میں رتّی برابر بھی تو سچ نہیں؛ شیخی باز کہ دیا بالکل بے جوڑ، مال دار بنا دیا سر تا سر غلط، مُرتشی بنا دیا تمام تر بہتان ۔ بھلا اور زیادہ نہیں تو گڑ والوں ہی کا بہی کھاتہ منگوا کر ایک نظر دیکھیے ، جھوٹ سچ سب آپ پر منکشف ہو جائے گا ۔

شارپ ۔ بھلا پھر ابن الوقت صاحب اس قدر بدنام کیوں ہیں ؟ ہم نے تو کسی کے منہ سے اُن کی بھلائی نہیں سنی ۔

حجۃ الاسلام ۔ آپ کو ہندوستانیوں کے خصائص مزاجی سے بہ خوبی آگاہی نہیں ۔ ہم لوگوں میں اس طرح کا حسد ہے کہ ایک کو ایک کھائے جاتا ہے اور قاعدہ ہے کہ جب کسی قوم میں ادبار آتا ہے تو حالت کے بگڑنے سے پہلے قوم کی طبائع

بگڑ جاتی ہیں۔ بھائی ابن الوقت کی حالت محسود ہونے کی ہے؛ غدر لوگوں کے حق میں عذاب تھا اور اُن کے حق میں رحمت، اوروں کے لیے مصیبت تھا اُن کے لیے موجب فلاح و برکت۔ ہندوستانیوں کے نزدیک اس سے بڑھ کر اور کیا قصور ہوگا کہ اُن میں کا ایک شخص غدر کی تمام آفتوں سے محفوظ رہا، سرکار نے اُس کی خیرخواہی کی قدر کی، بڑی سے بڑی خدمت دی، جاگیر دی اور حکّام لگے اُس کی خاطر اور مدارات کرنے۔

شارپ۔ خیر کچھ ہی ہو میں تو اس کا متحمّل نہیں ہو سکتا کہ کوئی ہندوستانی انگریزوں کی نقل کرے۔

حجۃ الاسلام۔ مجھ کو بھی بہت ہی زبوں معلوم ہوتا ہے۔ بھلا ہوا کہ آپ اُدھر بنگالے کی طرف نہ ہوئے، وہاں کے لوگ تو نقل کے علاوہ چھیڑتے بلکہ چڑاتے بھی ہیں۔

شارپ۔ وکٹر صاحب بھی وہاں سے بہت ناراض ہیں اور وہاں کے لوگوں کی بہت شکایت لکھتے ہیں۔

حجۃ الاسلام۔ انگریزی پڑھ پڑھ کر وہ لوگ ایسے بےباک ہو گئے ہیں کہ کسی حاکم کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے، کتنا ہی پھونک پھونک کر پاؤں رکھیے مگر وہ بدون گرفت کیے نہیں رہتے۔ قانون کی تو پوری پوری اطاعت کرتے ہیں لیکن کوئی حاکم چاہے کہ بے ضابطہ کوئی کارروائی کرے کیا مجال، ولایت تک اُس کے دھوئیں بکھیر کر بھی بس نہ کریں۔ اُن اضلاع میں دیسی اخبار ایسے پھیل پڑے ہیں جن کا شمار نہیں؛ جس اخبار کو کھول کر دیکھیے شروع سے آخر تک گورنمنٹ کی مذمّت، حکام کی ہجو اور اُس پر بھی بند نہیں، ناولوں کے ذریعے سے فضیحت کریں، تھیٹروں میں نقلیں نکالیں، سوانگ

بنا بنا کر سر بازار پھرائیں۔ یہاں تو کل ہی میں جامع مسجد سے نماز پڑھ کر آ رہا تھا ، دیکھتا کیا ہوں کہ ایک انگریز گھوڑے پر سوار چلا جا رہا ہے اور لوگ ہیں کہ دو طرفہ اُس کو کھڑے ہو ہو کر سلام کرتے جاتے ہیں۔ میرے ساتھ اُسی طرف کا ایک خدمتگار ہے ، وہ میرے پیچھے پیچھے تھا۔ یہ کیفیت دیکھ کر اُس کو سخت حیرت ہوئی اور کسی سے پوچھا کیوں جی یہ کون صاحب ہیں جن کو لوگ اس طرح پر سلام کر رہے ہیں اور جب اُس نے سنا کہ یہ کوئی سڑک کا ٹھیکہ دار ہے تو اُس کو اور بھی تعجب ہوا مگر پھر لوگوں نے اس کو سمجھا دیا کہ اس طرف انگریزوں کی حکومت کا یہی رنگ ہے ، کوئی انگریز ہو اُس کو سلام کرنا چاہیے اور نہ کرو تو بعضے تو ٹوک دیتے ہیں اور بعضے ٹھوک بھی دیتے ہیں۔

شارپ۔ پھر اُن اضلاع میں حکومت کس چیز کا نام ہے ؟

حجۃالاسلام ۔ ہمارے یہاں صرف قانونی اختیارات کے عمل میں لانے کا نام حکومت ہے۔ اُس میں بھی اس قدر پتّے کو مارنا پڑتا ہے کہ بس جو کرتا ہے اُسی کا جی جانتا ہے ۔ آپ گھبرائیے نہیں ؛ اب انگریزی کا چرچا ان اطراف میں بھی بہت ہو چلا ہے ، کوئی دن کو یہ بھی بنگالہ ہوا جاتا ہے ۔

شارپ ۔ کچھ پروا کی بات نہیں ۔ اُس وقت تک ہماری سروس کی میعاد تو ہو چکے گی مگر یہ تو کہیے آپ کو اس کا انجام کیا معلوم ہوتا ہے ۔

حجۃالاسلام ۔ انجام کی خبر تو خدا ہی کو ہے۔ یہ باتیں بڑے لوگوں کے سوچنے کی ہیں ، کیا میں اور کیا میری رائے ۔

شارپ ۔ بھلا پھر بھی ؟ کیا ہوا ہر ایک انسان

رائے تو رکھتا ہے، صحیح ہو یا غلط۔

حجۃالاسلام ۔ خیر آپ پوچھتے ہیں تو عرض کرتا ہوں کہ میرے نزدیک انگریزی تعلیم کا یہ نتیجہ تو ایک نہ ایک دن ضرور ہونا ہے کہ گورنمنٹ کا گنگا جمنی رنگ کہ کسی قدر انگریزی ہے اور کسی قدر ایشیائی اور جس کے لیے یوریشین کا لفظ نہایت مناسب ہے اور ہم اپنی زبان میں ایسا لفظ بنانا چاہیں تو مغلئی اور انگریزی کو ملا کر مغریزی کہ سکتے ہیں، غرض گورنمنٹ کا یہ دو غلاپن تو باقی رہتا نظر نہیں آتا۔ ہندوستان اور ولایت میں جو پہلے درجے کی مغایرت اور اجنبیت تھی، یوماً فیوماً کم ہوتی چلی جاتی ہے اور اس کے چند در چند اسباب ہیں: انگریزی تعلیم، انگریزی اور دیسی اخباروں کی کثرت، ڈاک، ریل، تار، سفر ولایت کی سہولت، ہندوستانیوں اور انگریزوں دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے جاننے پہچاننے کا شوق؛ غرض جس قدر ہندوستانیوں کی آنکھیں کھلتی جاتی ہیں اسی قدر اُن کے حوصلے بڑھتے جاتے ہیں، انجام کار ہندوستانی ضرور خواہش کریں گے کہ ہوم گورنمنٹ[1] اور انڈین گورنمنٹ دونوں کا ایک رنگ ہو اور ولایت میں جو حقوق رعایائے سلطانی ہونے کی حیثیت سے آپ لوگوں کے تسلیم کیے گئے ہیں اور جو اختیار آپ لوگوں کو دیے گئے ہیں، وہی حقوق اس ملک میں ہندوستانیوں کے تسلیم کیے جائیں اور وہی اختیار اُن کو ملیں۔

شارپ ۔ درخواست تو معقول ہے کیونکہ ۱۸۵۷ء کے غدر سے ہندوستانیوں نے اپنی وفاداری کا بڑا عمدہ ثبوت دیا ہے!

۱۔ یعنی ولایت اور ہندوستان دونوں میں طرز انتظام یکساں ہو۔

حجة الاسلام - غدر میں رعیت کو آپ ناحق سانتے ہیں۔ غدر سے اور رعیت سے کیا تعلق ؟ غدر کیا آپ کی فوج نے ، رعیت کیوں فوج کی ذمہ دار ہونے لگی - رعیت عبارت ہے رئیسان بااقتدار سے بہ حیثیت مجموعی ، زمینداروں سے بہ حیثیت مجموعی ، تجارت پیشوں سے بہ حیثیت مجموعی ، اہل حرفہ سے بحثیت مجموعی، تمام رعایا کو تو بھلا کون باغی ٹھہرا سکتا ہے ؟ آپ کسی ایک گروہ کا نام لیجیے کہ اُس نے بہ‌حثیت مجموعی تمام ملک میں بغاوت کی ہے۔ جناب بہ حیثیت مجموعی تو آپ کی فوج نے بھی بغاوت نہیں کی ؛ بغاوت ایک جاہلانہ شورش تھی خاص خاص لوگوں کی، خاص خاص وجوہ سے، خاص خاص مقامات میں اور ایسی شورشیں ولایت میں بھی اکثر ہوتی رہتی ہیں اور اگر خدا نہ خواستہ رعایا نے بہ‌حیثیت مجموعی بغاوت کی ہوتی تو معاذ اللہ وہ طوفان کسی کے روکے رکتا بھی ؟

شارپ - خیر جی وہ غدر تو گیا گزرا ہوا اور میں سمجھتا ہوں کہ اُس کا ہونا انگریزی گورنمنٹ کے حق میں مفید ہوا کیوں کہ ہندوستانیوں کے دل میں یہ بھی ایک ارمان تھا سو نکل گیا - ہم لوگ ہمیشہ بلوے اور ہنگامے کے نام سے ڈرتے تھے ، اب معلوم ہوا کہ اس ملک میں بلوا اور ہنگامہ بچوں کی بیچا ہے۔ سارے ملک سے ہتیار رکھوا لیے گئے ہیں اور گورنمنٹ پہلے سے بہت زیادہ قوی اور مطمئن ہے مگر آپ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بغاوت کا مادہ دلوں میں موجود ہے اور یہ ضرور پھر ایک نہ ایک دن اپنا رنگ لائے گا۔ کس طرح کے لوگ ہیں کہ غدر کی وجہ سے اتنی آفتیں نازل ہوئیں اور پھر باز نہ آئے - ان کے لیے تو حقیقت میں خالص ایشیائی حکومت چاہیے ، اسی کے یہ ہمیشہ سے خوگر ہیں اور اسی

سے یہ ٹھیک بھی رہتے ہیں۔

حجۃالاسلام ۔ محال عقل ہے کہ برٹش گورنمنٹ ایسی اجلی اور مہذّب اور شائستہ گورنمنٹ ہو کر وحشی اور بیہودہ اور نالائق گورنمنٹوں کا طریقہ اختیار کرے۔

شارپ ۔ پھر آپ لوگ برٹش گورنمنٹ کی جیسی چاہیے قدر کیوں نہیں کرتے؟

حجۃالاسلام ۔ تمام ہندوستان میں کسی مذہب کسی قوم کا ایک متنفس بھی ایسا نہیں جو برٹش گورنمنٹ کو تہ دل سے عزیز نہ رکھتا ہو۔ ہم لوگ نیم وحشی، جاہل، نا مہذّب جو کچھ ہیں، سو ہیں مگر باؤلے نہیں کہ اپنے نفع و نقصان میں امتیاز نہ کر سکیں۔ امن اور آسائش اور آزادی اور انصاف اور جان اور مال اور مذہب یعنی تمام حقوق کی حفاظت اور فلاح اور بہبود جو انگریزی عملداری میں ہے ہم سب سمجھتے اور سب کے لیے پہلے خدا کے اور خدا کے بعد گورنمنٹ کے بہت بہت شکرگزار ہیں۔ ہم نے ایشیائی گورنمنٹ کی مصیبت نہیں جھیلی تو بھی ہم اس کی حقیقت سے واقف ہیں، ہم نے بزرگوں سے بہت سے دردناک افسانے سنے ہیں اور ایشیائی گورنمنٹ کے نمونے اگرچہ برٹش گورنمنٹ کے طفیل سے پورے پورے نہیں مگر ناقص اور ادھورے جابجا دیسی ریاستوں میں اب بھی موجود ہیں اور ہم میں کے بہت لوگوں کو دوسرے ملکوں میں جانے اور رہنے کا اتفاق ہوتا ہے؛ غرض پردے کی بیٹھنی والی عورتیں تک جانتیاں ہیں کہ انگریزی عملداری کے برابر روئے زمین پر کہیں آرام نہیں۔

شارپ - آپ ھی یہ بھی کہتے ھیں اور آپ ھی کے بیان سے یہ بھی مستنبط ھوا کہ لوگ انگریزی عملداری سے خوش نہیں -

حجۃالاسلام - میری زبان سے ایسے الفاظ شاید نکلے ھوں مگر خیر مطلب ایک ھی ھے - بات یہ ھے کہ ھمارے ملک میں گنتی کے چند آدمی پولیٹیکل باتوں کے سوچنے سمجھنے کی لیاقت رکھتے ھیں اور وہ چند آدمی بھی اکثر بلکہ سب سرکار کے بنائے ، تیار کیے ھوئے ھیں جنھوں نے سرکاری کالجوں میں تعلیم پائی اور اُن کی دو سے چار آنکھیں ھوئیں؛ غرض پولیٹیکل خیالات اس زمانے کی جدید تعلیم کے نتیجے ھیں ، جوں جوں تعلیم کا رواج ھوتا جاتا ھے پولیٹیکل خیالات کی کثرت ھوتی جاتی ھے ، قومی اتفاق جس کو آپ نیشنیلٹی کہتے ھیں نہ ھندوستان میں اب ھے اور نہ آئندہ اُس کے قائم ھونے کی اُمید ، نہ سارے ھندوستان کا کبھی ایک مذھب ھوگا اور نہ یہاں کے باشندے کبھی ایک نیشن بنیں گے - پس ناراض ، ناخوش جو کچھ سمجھیے نئے تعلیم یافتہ کہ یہی لوگ اخباروں میں ، لکچروں میں ، اکثر جلی کٹی کہتے رھتے ھیں؛ سو اُن کی نارضامندی اور ناخوشی بھی ھرگز مخالفانہ اور باغیانہ نہیں ھے بلکہ اُسی قسم کی جیسے آپ کے عملوں میں سے کوئی شخص اپنے تئیں ترقی کا مستحق سمجھتا ھے اور اُس کو اُس کی خواھش کے مطابق ترقی نہیں ملتی - آپ فرماتے ھیں کہ غدر کے بعد بھی لوگ باز نہ آئے؛ سو جناب من ! غدر کے بعد سے تو ھندوستانی اور بھی شیخی میں آ گئے - اُن کی توقعات کی کچھ حد نہیں رھی ، کہتے ھیں کہ غدر میں لٹے کُھسٹے ، برباد ھوئے مگر خدا نے کمپنی سے

پیچھا چھڑایا ۔ سوداگر لکھ پتی ، کروڑ پتی سہی مگر آخر ہے تو سوداگر جس نے ہر پیسے میں سے کچھ کوڑیاں بچا بچا کر دولت جمع کی ہے ، اس میں بادشاہ کی سی سیر چشمی اور فیاضی کہاں اور پھر سوداگر کے علاوہ ملک کے ٹھیکیدار اور ٹھیکہ بھی میعادی ، ان کو بادشاہ کی طرح رعیت کی پرداخت کا خیال کیوں ہونے لگا تھا ۔ غرض کچھ ملے یا نہ ملے (اور نہ کیوں ملے ، ملے ہی گا) لوگ تو بڑی بڑی آمیدیں لگا رہے ہیں ؛ ملکہ کو دیکھا نہیں ، بھالا نہیں اور دیکھنے کی آمید بھی نہیں مگر خدا جانے کیا بات ہے کوئی دل نہیں جس میں ملکہ کے نام کے ساتھ جوش نہ پیدا ہوتا ہو ۔

شارپ ۔ او صاحب ! اگر یہ صرف بنگالی بابوؤں کا غل ہے تو کچھ ہونا جانا نہیں ؛ آن کے دماغ میں یہ خبط سایا ہے کہ صرف ٹوٹی پھوٹی انگریزی پڑھ لینے سے ہم بھی یورپینز[1] کی طرح کے آدمی ہیں اور ہمارے ساتھ بھی یورپینز کی سی مدارات ہونی چاہیے ۔ سو سرے سے یہ یورپینز کی طرح کے آدمی ہی نہیں ، یورپینز کی طرح کی ان میں نیشنیلٹی نہیں ، پبلک نہیں ، پبلک اوپینین نہیں ، آزادی نہیں ، روشن ضمیری نہیں ، جفا کشی نہیں ، استقلال نہیں ، جرأت نہیں ، سچائی نہیں ، سچ کی تلاش نہیں ، یک دلی نہیں ، اتفاق نہیں ۔

حجۃالاسلام ۔ یہ آپ کا فرمانا بالکل درست ہے مگر لوگوں میں انگریزیت آتی چلی ہے اور گورنمنٹ بھی آہستہ آہستہ ہندوستانیوں کو اختیارات دیتی جاتی ہے ۔ ابھی غدر کو کے دن ہوئے ، گورنمنٹ کی شان ہی دوسری ہوگئی ہے ۔

---

۱ ۔ اہل یورپ ۔

اس کے بعد شارپ صاحب نے سامنے میز پر ٹائم پیس[1] کو دیکھا تو حجۃ الاسلام نے کہا کہ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ آج میں نے آپ کا بہت سا قیمتی وقت صرف کرا دیا۔

شارپ۔ مجھ کو آپ کی ملاقات سے بڑی خوشی ہوئی اور جیسا کہ وکٹر صاحب نے لکھا ہے آپ بڑی معلومات اور بڑی عمدہ رائے کے آدمی ہیں اور مجھ کو ہمیشہ آپ کی ملاقات سے خوشی ہوگی۔ میں وکٹر صاحب کو بڑی شکر گزاری لکھونگا اور میں آپ کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اپنے بھائی ابن الوقت صاحب کے بارے میں بالکل سچی سچی خبر دی ورنہ مجھ کو لوگوں نے اُن سے بہت ہی بد ظن کر دیا تھا۔

حجۃ الاسلام۔ آپ کی اس قدر عنایت دیکھ کر اب تو مجھ سے بھی صبر نہیں ہو سکتا اور میں بہ منت آپ سے التماس کرتا ہوں کہ آپ بھائی ابن الوقت کی طرف سے صاف ہو جائیے۔

شارپ۔ میں نے تمام غلط خیالات کو دل سے نکال ڈالا اور میں افسوس کرتا ہوں کہ مجھ سے اُن کے بارے میں غلطی ہوئی، جو باتیں لوگوں نے مجھ سے کہیں اُن کے ظاہر حال سے اُن کی تصدیق ہوتی تھی۔ میں نے اُن سے سب کام نکال لیا تھا اور ہرچند صاحب کمشنر نے لکھا ہے کہ بغاوت کا محکمہ رازداری کا محکمہ ہے اور اُس کے فیصلے عام قوانین کے تابع نہیں، محکمہ بغاوت کی مثلیں دوسرے عملوں کو مت دیکھنے دو اور جن مقدمات میں ابن الوقت کارروائی کر چکے ہوں، اُن ہی سے فیصلہ کراؤ، مگر میرا ارادہ ابن الوقت صاحب کو کام دینے کا نہ تھا اور امروز فردا میں میں رپورٹ کرتا مگر آپ نے جو حالات بیان کیے اُن سے میری رائے بالکل بدل گئی۔ آج ہی ڈپٹی صاحب

۱۔ ایک قسم کی گھڑی۔

کو اُن کے کام پر مُسلّط کردوں گا۔

حجۃالاسلام - کام نکال لیے جانے کی تو اُن کو مطلق شکایت نہیں۔ اُن کو اگر شکایت ھے تو اس بات کی ھے کہ آپ نے اُن کو اپنی صفائی کے ثابت کرنے کا موقع نہیں دیا ورنہ یہاں تک نوبت ھی نہ پہنچتی۔

شارپ۔ شکر ھے کہ میرے ھاتھ سے اُن کو کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچا۔

حجۃالاسلام۔ یہ تو نہ فرمائیے ، سوسائٹی میں اُن کی بڑی بے وقعتی ھوئی۔

شارپ۔ (ذرا تامل کرکے) میں سوچ کر اس کی تلافی کردوں گا مگر اُنھوں نے وضع ایسی اختیار کی ھے کہ کوئی انگریز اُن کے ساتھ دوستانہ برتاؤ کر نہیں سکتا۔

حجۃالاسلام۔ آپ کو اُن سے خانگی طور پر ملنے نہ ملنے کا اختیار ھے مگر میں اُن کے تعزّز منصبی کی حفاظت کے لیے عرض کرتا ھوں۔

شارپ ۔ میں ضرور اس کا خیال کروں گا۔

چنانچہ اُسی دن شارپ صاحب نے تحقیقات بغاوت کے تمام مقدمات۔ کامل و ناکامل سب ابن الوقت کے محکمے میں واپس کردیے۔ روبکار میں استمالت کے الفاظ جن سے ایک طرح کی معذرت بھی مترشح ھوتی تھی ، لکھوا دیے اور ابن الوقت کے نام ایک چٹھی الگ لکھی کہ آپ کے بھائی حجۃ الاسلام سے جو میں نے آپ کے حالات سنے ، میرے سارے شکوک رفع ھو گئے اور میں آپ سے اپنی غلطی کی معافی چاھتا ھوں اور اگر آپ اپنے بھائی حجۃ الاسلام کی سی وضع اختیار کریں جو آپ کی قومی وضع ھے

اور جس میں آپ نے بھی اپنی عمر کا بڑا حصہ بسر کیا ہے اور
جو ہر ایک ہندوستانی شریف کے لیے زیبا اور راحت بخش ہے تو
مجھ میں اور آپ میں ایسی دوستی قایم ہوگی جس کو میں ساری
عمر نباہوں گا -

فصل بست و هفتم

حجة الاسلام اور ابن‌الوقت کی دوسری ملاقات اور پھر مذھبی بحث

اگلے دن ابن‌الوقت کو تو صبح ھی سے حجۃالاسلام کا انتظار تھا مگر یہ گھر سے کھانا وانا کھا پی کر چلے تو پہنچتے پہنچتے ساڑھے دس بج گئے تھے۔ دور سے دیکھتے ھی حجۃالاسلام سے کہا ''آپ حقیقت میں بڑے خوش تقدیر ھیں کہ شہر میں جاتے ھی آسی رات پانی برسا اور خوب برسا۔ لُو تو اب بالکل گئی، ٹٹیاں دو چار دن کی مہمان اور ھیں''۔

حجۃالاسلام۔ الحمد للہ ثُمّ الحمد للہ۔

ابن‌الوقت۔ ثُمّ الحمد للہ کیسا۔

حجۃالاسلام۔ تم ایک ھی ثُمّ[1] لیے پھرتے ھو، خداوند کریم کے تمام بندوں پر ھمہ وقت اتنے وافر احسانات ھیں کہ ایسے ایسے لاکھوں کروڑوں ثُمّ بھی اُن کی تلافی نہیں کر سکتے مگر میں نے پہلا الحمد للہ اپنی خوش تقدیری پر کہا اور دوسرا اس بات پر کہ بھلا تم نے تقدیر کو تو مانا۔

ابن‌الوقت۔ یہ لفظ تو بے خیالی میں عادت کے مطابق میرے منہ سے نکل گیا ورنہ میں تقدیر کا بالکل قائل نہیں اور میرے نزدیک اسی طرح کے لغو معتقدات نے مسلمانوں کو کاھل اور نالائق بنا کر اس درجے کو پہنچایا ھے کہ روئے زمین پر اُن سے زیادہ مفلس اور تباہ حال کوئی قوم نہیں۔

۱- پھر۔

حجۃالاسلام ۔ تم کیوں اس قدر مسلمانوں کے پیچھے پڑے ہو۔ کیا رفارمر بننے کے لیے اس کی بھی ضرورت ہے کہ زبردستی کوئی نہ کوئی الزام کسی کے پلّے باندھ کر اپنے تئیں سرخ رو اور دوسرے کو انگشت نما کیجیے؛ مسلمانوں کی کیا تخصیص ہے! جو شخص خدا کو مانتا ہے کسی مذہب کا ہو، وہ ضرور تقدیر کا بھی قائل ہوگا۔ پہلے سمجھو تو سہی کہ تقدیر ہے کیا چیز؟ تقدیر کے لغوی معنی ہیں اندازہ ٹھہرانا۔ دنیا میں کوئی چیز نہیں جس کا اندازہ نہ ہو۔ «انّا کل شیٍٔ خلقناہ بقدر»[1]۔ پس اگر دنیا ہے تو اُس کے ساتھ تقدیر بھی ہے یا دوسرے طور پر سمجھو مثلاً تم جانور یا درخت نہیں بنائے گئے بلکہ آدمی، یہ تقدیر ہے؛ مرد بنائے گئے عورت نہیں، یہ تقدیر ہے؛ ہندوستان میں اور ہندوستان میں سے خاص دلّی میں پیدا ہوئے، یورپ یا افریقہ یا امریکہ یا کسی دوسری جگہ نہیں، یہ تقدیر ہے؛ تیرھویں صدی کے خاص حصے میں تمھاری ہستی ہوئی اس سے پہلے یا پیچھے نہیں، یہ تقدیر ہے؛ ایک خاص مسلمان کے گھر پیدا ہوئے، ہندو یا عیسائی یا کسی دوسری قوم یا کسی دوسرے شخص کے یہاں نہیں، یہ تقدیر ہے؛ ایک خاص حالت میں پرورش پائی، بڑے ہوئے، پڑھے، لیاقت پیدا کی، نواب معشوق محل بیگم کی سرکار کے مختارکل ہوئے، یہ تقدیر ہے؛ غدر کے وقت اسی شہر میں موجود تھے، عین اُسی زمانے میں نوبل صاحب ولایت جاتے ہوئے دلّی میں ٹھہرے، باغیوں نے اُن کو پکڑا اور اپنے پندار میں مار ڈالا، تم جا پہنچے اور نیم جان کو اُٹھا کر گھر لے گئے، مرہم پٹی کی، اچھے ہوئے، تمھارے گھر اُن کا رہنا

۱۔ ہم نے ہر چیز اندازے کے ساتھ پیدا کی ہے۔

کسی طرح پر ظاہر نہ ہوا"، آخرکار صحیح سلامت انگریزوں میں جا ملے ، یہ سب تقدیر ہے ؛ تم کو دفعۃً بھرا بھتولا گھر چھوڑ کر شہر سے نکل جانا پڑا ، بے سر و سامان باہر پڑے پھرتے تھے اور قریب تھا کہ فوج فتح مند کے سوار بیگار میں پکڑ کر تم سے مزدور کا کام لیں کہ اتنے میں نوبل صاحب رجال الغیب کی طرح آ موجود ہوئے اور تم کو عزّت اور آبرو سے لے جا کر گھر میں بسایا ، جاگیر اور نوکری دلوائی ، یہ سب تقدیر ہے ؛ اس اثناء میں تم کو انگریز بننے کے خبط نے آ گھیرا ، خوب خوب ڈنر[1] دیے اور بڑی بڑی پارٹیاں[2] بلائیں، ہندوستانیوں کے روٹھنے ، چھوٹنے کی تو تمھیں کیوں پروا ہونے لگی تھی ، انگریز بھی بجائے خود چڑے بگڑے ، لیکن گھٹیا ، چائے اور کافی، سوڈا واٹر اور برف اور سگرٹ کے لالچ سے اور بڑھیا، کچھ تو نوبل صاحب کی مروت سے اور کچھ تمھاری خیرخواہی اور تعزّز منصبی کے لحاظ سے ، طوعاً کرھاً تم سے ملنے لگے ، تم نے سمجھا انگریزوں نے مجھ کو اپنی سوسائٹی میں لے لیا ، یہ سب تقدیر ہے ؛ خدا نے ایک دم پانسو روپے ماہوار کی آمدنی کر دی تھی ، ہندوستانی بھلے آدمی بن کر رہتے تو آج کو امیر ہوتے اور کچھ نہیں تو دس بارہ ہزار روپیہ تمھارے پلّے ہوتا ، سو تم نے ایک خبط کے پیچھے ساری آمدنی پر پانی پھیرا ، دس بارہ ہزار اُلٹا قرض کیا ، اب بزرگوں کی پیدا کی ہوئی جائداد کے بیچنے کی نوبت پہنچی ، یہ سب تقدیر ہے ؛ اچانک نوبل صاحب کو ولایت جانا پڑا ، ان کا منہ موڑنا تھا کہ تمھارے خواب پریشان کی تعبیر سامنے آنے لگی ، یہ سب

۱- رات کا کھانا ۔ ۲- محفل ۔

تقدیر ہے؛ تم اپنی عادت کے مطابق ہوا خوری کو گئے، دریا گنج کے نکڑ پر صاحب کلکٹر مل گئے، وہ پیادہ اور تم سوار، تم نے اپنے نزدیک اچھا کیا اور ہو گیا برا، انھوں نے تم سے گستاخی کا جواب طلب کیا، تمام کام چھین کر کہ دیا کہ کچہری میں بیٹھے مکھیاں مارا کرو، یہ سب تقدیر ہے؛

دو برس سے اماں جان مجھ کو بلا رہی تھیں اور میرا آنا نہیں ہوتا تھا، اب جو صاحب کلکٹر کی خفگی اور بارہ دری کی فروخت کا حال معلوم ہوا، ضبط نہ ہو سکا، رخصت لی، وکٹر صاحب سے ملنے گیا، تمھارے شارپ صاحب نکلے اُن کے رشتے کے بہنوئی، اُنھوں نے از خود چٹھی دی، شارپ صاحب سے ملاقات ہوئی، تمھارا تذکرہ آیا، خدا نے کیا صفائی ہو گئی، یہ سب تقدیر ہے۔ کیوں ہے یا نہیں؟

ابن الوقت۔ توبہ! تقدیر کیا ہے شیطان کی انتڑی ہے، کہیں پھر آپ میری زبان نہ پکڑئیے گا۔ شیطان طوفان کو بھی میں مانتا وانتا خاک نہیں۔

حجۃالاسلام۔ تمھارے ماننے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے۔ جو واقعات حقّہ اور نفس الامری ہیں اگر سارا جہان اُن سے انکار کرے تو بھی واقعات کا بُطلان نہیں ہو سکتا۔

ابن الوقت۔ تو کیا آپ کے نزدیک شیطان بھی کوئی شے ہے موجود فی الخارج؟

حجۃالاسلام۔ جی ہاں! شے ہے موجود فی الخارج۔

ابن الوقت۔ پھر دوسری اشیائے موجودہ فی الخارج کی طرح ہم کو نظر کیوں نہیں آتا۔

حجۃالاسلام۔ ہوا اور پانی میں جو بے شمار بُھنگے ہیں اور جن کو بے مدد خردبین نہیں دیکھ سکتے یا مکھی کی لاکھ آنکھیں

ہیں یا چاند میں سمندر اور پہاڑ ہیں اور بڑے پلّے کی دوربین سے صاف دکھائی دیتے ہیں، آخر یہ چیزیں تو خارج میں موجود ہیں اور ہم کو نظر نہیں آتیں۔

ابن الوقت ۔ آنکھ سے دیکھا تو دیکھا اور خردبین کی مدد سے دیکھا تو دیکھا، غرض کسی نہ کسی طرح دیکھا تو سہی۔

حجۃالاسلام ۔ لیکن جس زمانے میں دوربین، خردبین ایجاد نہیں ہوئی تھی، لوگ ان چیزوں کو موجود فی الخارج مانتے یا نہ مانتے یا اب لاکھوں کروڑوں بندگان خدا ہیں جو خردبین، دوربین کے نام سے بھی آگاہ نہیں، وہ ان چیزوں کو موجود فی الخارج مانیں گے یا نہیں مانیں گے؟

ابن الوقت ۔ نہ مانتے اور نہیں مانیں گے۔

حجۃالاسلام۔ ہاں مگر ان کے نہ ماننے سے یہ لازم آجائے گا کہ مکھی کی لاکھ آنکھیں نہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص مثل تمھارے وجود شیطان سے انکار کرے صرف اس وجہ سے کہ وہ شیطان کو دیکھ نہیں سکتا تو اُسکا انکار کیوں مستند ہونے لگا؟

ابن الوقت ۔ ہم نے تو خردبین سے مکھی کی آنکھوں اور دوربین سے چاند کے پہاڑوں کے ہونے کا یقین کیا۔ اسی طرح آپ کوئی ذریعہ بیان کیجیے جس سے شیطان کے ہونے کا یقین کیا جائے۔

حجۃالاسلام ۔ وہ ذریعہ ہے خدا اور خدا کے رسول صلعم کا ارشاد۔

ابن الوقت ۔ بدیہیات میں سے تو نہ ہوا۔

حجۃالاسلام ۔ جن کی چشم بصیرت نور ایمان سے منوّر ہے اُن کے نزدیک بدیہی بھی نہیں بلکہ اجلی البدیہیات[1]۔ «فانہا لا

۱۔ ظاہر ترین بدیہیات۔

تعمی الابصار و لکن تعمی القلوب التی فی الصدور»[1] ۔

ابن الوقت ۔ اگر شیطان کو موجود منفرد مانا جائے تو خدا کو ظالم اور انسان کو مجبور مطلق ماننا پڑے گا ۔ کیا انصاف ہے کہ آدمی پر ایک دشمن پنہاں مسلّط ہو ۔

حجة الاسلام ۔ تو تمھارا مطلب یہ ہے کہ سرے سے انسان کا پیدا کرنا ہی خلاف انصاف ہے کیوں کہ شیطان موجود منفرد ہو تو اور انسانی قوت ہو تو دونوں کا مآل واحد ہے ۔

ابن الوقت ۔ خیر آپ کی عقل ایسی ڈھکوسلوں کو قبول کرتی ہو گی ، کہیے تو آپ کی خاطر سے جھوٹ بول دوں ورنہ میں تو نہیں سمجھتا کہ جب تک مسلمان تقدیر اور شیطان اور اسی طرح کی دوسری لغویات کے معتقد رہیں گے اُن کو کبھی فلاح ہو ۔

حجة الاسلام ۔ ملّاحی گالیوں کی سنہی نہیں ، خلط مبحث مت کرو ، مقرر کرکے ایک ایک بات کہو تو جواب دیا جائے ۔

ابن الوقت ۔ آپ ہی انصاف سے کہیے کہ تقدیر کے عقیدے نے مسلمانوں کو کاہل اور قاصر الہمّت نہیں کیا ؟ سب سے بڑے دین دار ، ورثة الانبیا ، دین کے حافظ ، دین کے حامی ، دین کے رواج دینے والے مولوی مشائخ اور یہ تو ہمارے گھر کا کام ہے ، ساری حقیقت آپ کو بھی معلوم ہے مجھ کو بھی معلوم ہے ، مرد و زن ملا کر ڈیڑھ سو پونے دو سو آدمیوں کی گزر کس چیز پر تھی ؟ خیر خیرات پر ، جس کو دیکھو تن بہ تقدیر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہے ۔

---

۱ ۔ آنکھیں اندھی نہیں ہو جاتیں بلکہ دل جو سینے میں ہیں ۔

حجۃالاسلام ۔ شخصیات سے بحث کرنے میں تو غیبت ہوتی ہے اور کسی کی نیت کا حال کیا معلوم؟ مگر تمھارا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ تقدیر کے عقیدے نے مسلمانوں کو کاہل اور قاصر الہمت کر دیا ۔ دنیا میں مسلمانوں نے کیا نہیں؛ کیا ملک گیریاں کیں، ملک داریاں کیں، خشکی اور تری کے سفر کیے، تجارتیں کیں، صناعیاں کیں، دست کاریاں کیں، علم تحصیل کیے، ایجادیں کیں، غرض دنیا کے سبھی کام کیے اور ایسے کیے کہ اُن کے زمانے میں دوسروں سے نہیں ہو سکتے تھے اور اب بھی زمینداری، کاشتکاری، دست کاری، تھوڑی بہت تجارت، برا بھلا پڑھنا، لکھنا، نوکری، چاکری سبھی کچھ کرتے ہیں اور کرتے نہیں تو کھاتے پیتے کہاں سے ہیں؟ یہ بات دوسری ہے کہ جو چاہیے نہیں کرتے یا کرنے میں کمی کرتے ہیں مگر اس کے اسباب دوسرے ہیں نہ یہ کہ عقیدہ تقدیر نے ان کو کاہل کر دیا ہے ۔ ہندو، عیسائی، یہودی کون ہے جو تقدیر کا قائل نہیں؟ تو اگر مجرد تقدیر پر عقیدہ رکھنا کاہلی کا باعث ہوتا یہ سب بھی کاہل ہوتے، حال آں کہ تم بالتخصیص مسلمانوں ہی کو ملزم ٹھہراتے ہو اور چونکہ تقدیر کا حال کسی کو معلوم نہیں، تقدیر پر عقیدہ رکھنا کاہلی کا سبب کیوں ہونے لگا بلکہ وافر مثالیں موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ تقدیر پر بھروسا رکھنے کی وجہ سے لوگوں نے ثابت قدمی اور استقلال مزاجی کے ساتھ کوشش کی اور آخر کو کامیاب ہوئے ۔ اس کی ایک مثال تو جالوت طالوت کا قصہ ہے کہ جب فوج طالوت لشکر جالوت کے مقابل ہوئی تو طالوت کی فوج بہت تھوڑی تھی، لوگ کہنے لگے ”ہم میں جالوت اور اُس کے لشکر کی مقاومت

کی طاقت نہیں"۔ یہ سن کر وہ لوگ جن کو خیال تھا کہ مرے پیچھے ہم کو خدا پاس جانا ہے کہنے لگے "اکثر ایسا ہوا ہے کہ تھوڑے لوگوں نے بہتوں کو ہرایا ہے اور خدا صبر کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے"۔ اس کے بعد جو طالوت والوں نے کچکچا کر دھاوا کیا تو جالوت والوں کو مار ہٹایا اور جالوت مارا گیا۔ یہ قصّہ قرآن میں مذکور ہے اگر تم کو خیال ہو۔ اس کو پرانی کہانی مت سمجھنا۔ ایسی باتیں اکثر اب بھی واقع ہوتی ہیں کہ صرف تقدیر کے بھروسے پر لوگ ہمت کر بیٹھتے اور مشکلات پر غالب آتے ہیں۔

مرد باید کہ ہراساں نشود
مشکلے نیست کہ آساں نشود

ابن الوقت ۔ آپ تو فرماتے تھے کہ تقدیر کا حال کسی کو معلوم نہیں، پھر جو لوگ تقدیر پر بھروسا کرکے کسی کام کی ہمّت کر بیٹھتے ہیں اُن کو کہاں سے خبر ہو جاتی ہے کہ تقدیر موافق و مساعد ہے۔

حجۃ الاسلام ۔ یہ بھروسا کرنے والوں کے دل سے پوچھنا چاہیے مثلاً طرف داران طالوت نے «واللہ مع الصابرین»[1] سے مساعدت تقدیر کا اذعان کرلیا اور اُن کا اذعان سچ نکلا۔ ایک زمیندار کا حال مجھ کو معلوم ہے، وہ کچھ بسوے ہار گیا تھا۔ سنا کہ بارہ برس سے اسی دُھن میں پھرتا ہے، کہیں شنوائی نہیں ہوتی۔ آدمی تھا نمازی، ایک دن مسجد میں ملا، میں نے اُس کو سمجھایا، «کیوں پریشان ہوتے ہو، صبر کرو»۔ کہنے لگا «ناخدا ترس وکیلوں نے میرے مقدّمے کو خراب کیا مگر 'الحق یعلو'[2]

۱۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔
۲۔ حق بات ور رہتی ہے۔

میرا حق کبھی نہ کبھی ضرور مجھ کو ملے گا» پھر سنا کہ ڈسٹرکٹ جج کو جنگل میں اُس نے اکیلا پاکر اپنا سارا حال بیان کیا اور اُن کو اپنی صداقت سے مطمئن کر دیا۔ جج نے کوئی تدبیر کرکے اُس کے بسوے نکلوا دیے۔ یہ تو میں نے تم کو مسئلۂ تقدیر کا ایک پہلو دکھایا ہے یعنی انجام کار فوز اور کامیابی ہو تو اذعان تقدیر سے انسان کو کس قدر تقویت پہنچتی ہے، وہ تقدیر کے بھروسے پر جان توڑ کر محنت اور محنت کو خوش دلی سے برداشت کرتا ہے۔ رہی ناکامی اس کی جراحت کا تو اذعان تقدیر سے بہتر کوئی مرہم نہیں۔ معتقد تقدیر حرمان کو من جانب اللہ سمجھ کر اپنے دل کو تسلّی دے لیتا ہے کہ اسی میں کوئی مصلحت مضمر ہوگی۔ غرض تعجب ہے کہ تقدیر کا ایسا عمدہ مسئلہ اور تم اُس پر معترض، ایسا صحیح خیال اور تم اُس سے منکر!

ابن الوقت ۔ اگر دنیا میں اونچ نیچ، خوشی اور رنج یعنی اختلاف حالات، امر تقدیری ہے تو خدا کو دانش مند اور منصف اور رحیم ماننا مشکل۔

حجۃالاسلام ۔ تم کو سرے سے خدا ہی کا ماننا مشکل ہو رہا ہے۔ اس مشکل کو خدا آسان کرے تو پھر دین کی ساری باتیں تم کو سہل اور سلیس معلوم ہوں اور آسانی سے سمجھ میں آئیں۔ بھائی جان! دینیات میں غور کرنے کا یہ طریقہ نہیں جو تم نے اختیار کیا ہے۔ مولانائے روم فرماتے ہیں:

گر بہ استدلال کار دیں بدے　　فخر رازی رازدار دیں بدے

تمھاری باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تم کو حاجت مندانہ دین کی طلب اور تلاش نہیں بلکہ تم دین کی باتوں سے اس طرح

مخاصمانہ پیش آتے ہو جیسے کوئی عیّار وکیل فریق مقابل کے گواہ سے؛ یوں تو دین کی نعمت نہ ملی ہے نہ ملے گی۔ ایک تدبیر تم کو میں بتاتا ہوں کہ جس وقت تمہاری طبیعت افکار دنیا سے بالکل فارغ اور مطمئن ہوا کرے، تنہائی میں خصوصاً رات کے وقت کبھی کبھی سوچا کرو کہ دنیا ہے کیا چیز؟ دنیا کا ایک بڑا بھاری عظیم الشان کارخانہ ہے؛ کہنے کو محدود ہے مگر کسی نے اس کی انتہا نہیں پائی، اس کارخانے کے مقابلے میں زمین کی با ایں وسعت اتنی بھی تو حقیقت نہیں جیسے بڑے سے بڑے پہاڑ کے آگے ایک ذرّے کی۔ کیا علم ہیئت کی باتیں خیال سے اتر گئیں؟ تم تو سب سے زیادہ اُن کی طرف داری کیا کرتے تھے؛ اگر وہ سب باتیں سچی ہیں اور جب مشاہدات اور اُصول ہندسہ پر مبنی ہیں تو اُن کو غلط ہی کون کہہ سکتا ہے، تو بارو ناچار انسان کو اپنی درماندگی کا، نارسائی اور بے حقیقتی کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ ہزار، دس ہزار، بیس ہزار، پچاس ہزار، لاکھ کوس تک کا بھی خیر ہم یوں ہی سا کچھ اندازہ کر سکتے ہیں، مہا سنکھ در مہا سنکھ کوسوں کے سمجھنے کو کس کی اٹکل لائیں؟ بھلا کچھ ٹھکانا ہے ان دوریوں کا کہ زمین پر سے گولہ چھوٹے اور شبانہ روز متّصل ایک رفتار سے سیدھا چلا جائے تو اُنیس برس میں جا کر آفتاب تک پہنچے۔ اللہ اکبر جل شانہ!

بڑے سے بڑے بلّے کی دوربینیں ایجاد ہوئیں مگر ہم نے اجرام فلکی کا کیا دیکھا؟ ایک جھلک، وہ بھی اُن معدودے چند کی جو زمین سے بہ نسبت دوسرے بے شمار اجرام کے قریب ہیں۔ کبھی آسمان خوب صاف ہوتا ہے تو اندھیری رات میں کس کثرت سے ستارے دکھائی دیتے ہیں! گویا گہری افشاں چھڑکی

ہوئی ہے اور اگر کسی طرح اونچے سے اونچے ستارے پر پہنچنا ممکن ہوتا تو وہاں سے بھی جہاں تک اور آگے کو نظر کام کرتی یہی کیفیت دکھائی دیتی «وَ ھُلّم جرّاً[1] » پھر خدا جانے کتنے کالے کوسوں کی مسافت ہے کہ ستارے ہم کو ننّھے ننّھے نقطے دکھائی دیتے ہیں ورنہ جس طرح اس کا یقین ہے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں اسی طرح جاننے والوں کو اور خاص کر تم کو اس کا اذعان ہونا چاہیے کہ ایک ایک نقطہ بجائے خود جہان ہے اور جہان بھی کیسا کہ اگر اس کو بڑا مٹکا فرض کرو تو زمین اس کے سامنے خشخاش کا نہ سہی، تو رائی کا دانہ ۔ جو تارے زمین سے زیادہ پاس ہیں یعنی ان کی دوری لاکھوں کوس کے پیٹے کے اندر ہی اندر ہے، دوربین کی مدد سے ان کے حالات کسی قدر زیادہ دریافت ہوئے ہیں اور پاس پڑوس کی آخر تھوڑی بہت خبر ہونی ہی چاہیے ۔ سمندر، جھیلیں، پہاڑ، دھوپ چھاؤں، ہوا بادل، یہ سب چیزیں ان تاروں میں صاف دیکھ پڑتی ہیں، اس سے اور دوسرے بہت سے قرائن سے علمائے ہیئت قیاس کرتے ہیں اور بجا قیاس کرتے ہیں کہ زمین کی طرح ان جہانوں میں بھی جان دار آباد ہیں۔ یہاں عقل انسانی کے اوسان اور بھی گم ہیں! بھلا اتنے بے شمار جہانوں کی کل مخلوقات کا تو ہم کیا اندازہ کر سکتے ہیں جب کہ ایک زمین کی مخلوقات کی گنتی تو درکنار تمام اقسام تک منضبط نہیں[1]۔ «وما من دابۃ فی الارض ولا طائر یطیر بجناحیہ الا امم امثالکم»[2] ۔

کسی کتاب میں نظر سے گزرا کہ زمانۂ حال کا کوئی فلسفی خردبین میں پانی کی ایک بوند کو دیکھ رہا تھا؛ سو سے زیادہ

۱۔ اسی طرح اور آگے کو بڑھتے جاؤ۔

۲۔ جو چیزیں زمین پر نقل و حرکت کرتی ہیں اور جو پرندے پروں سے اڑتے ہیں، سب تمھاری ہی طرح کی مخلوق ہیں۔

طرح کے جان دار تو وہ اس ایک بوند میں بہ مشکل شمار کر سکا، آخر تھک کر بیٹھ رہا ۔ ایک بوند میں اتنی مخلوقات ہو تو تمام کرۂ آب میں جو تین چوتھائی زمین کو ڈھانکے ہوئے ہے، کتنی مخلوقات ہوگی؟ خدا ہی کو خبر ہے۔ «وما یعلم جنود ربک الا ھو»[1]۔ پھر زمین کے گردا گرد ۴۰ میل کے دَل کا ہوا کا کرّہ ہے اور اس میں بھی جان داروں کی ایسی ہی یا اس سے زیادہ کثرت ہے۔ ہر چند کارخانۂ قدرت الٰہی کی عظمت اور شان فہم بشر سے خارج ہے مگر جس طریق پر میں نے اجمالاً بیان کیا اگر کوئی آدمی متواتر اور متّصل مدتوں تک غور کرتا رہے تو ضرور اس کے دل میں اپنی بے حقیقتی اور درماندگی اور بے وقعتی کا تیقّن پیدا ہوگا جس کو میں دین داری کی بنیاد یا تمہید سمجھتا ہوں ۔ اس کے بعد ذہن کو اس طرف متوجہ کرنا چاہیے کہ اتنا بڑا کارخانۂ با این عظمت کیسی عمدگی اور کیسے انضباط کے ساتھ چل رہا ہے کہ عقل دنگ ہوتی ہے! اجرام فلکی کے اتنے اتنے بڑے بے شمار گولے کہ خدا کی پناہ اور خود زمین سب چکّر میں ہیں، خدا جانے کب سے اور کیوں اور کب تک آور، نہ آپس میں ٹکراتے ہیں اور نہ بال برابر اپنی رفتار بدلتے ہیں ۔ اب جو آدمیوں کو قاعدہ معلوم ہو گیا ہے تو سینکڑوں ہزاروں برس پہلے سے پیشین گوئی ہو سکتی ہے کہ فلاں ستارہ فلاں وقت فلاں مقام پر ہوگا اور وہیں ہوتا ہے، حساب میں اگر غلطی نہ ہو تو منٹ اور سیکنڈ کیسا سیکنڈ کے ہزارویں حصے کی قدر بھی آگا پیچھا نہیں ہوسکتا ۔ «والشمس تجری لمستقر لہا ذالک تقدیرالعزیز العلیم○ والقمر قدرناہ منازل حتی عاد کا لعرجون القدیم○ لاالشمس

۱۔ اور تیرے پروردگار کے لشکروں کی خبر اس کے سوائے کسی کو نہیں۔

ینبغی لہا ان تدرک القمر و لَاالیلُّ سابق النہار وکل فی فلک یسبحون»[1]۔

یہاں روئے زمین پر ایک بُھنگے ، ایک دانے ، ایک پھل ، ایک پنکھڑی ، گھاس کے ایک ڈنٹھل ، چھوٹی سے چھوٹی اور ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کو بھی نظر غور سے دیکھو تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز کی کچھ نہ کچھ غرض وغایت ہے جس کی تکمیل کا پورا پورا سامان اس چیز میں موجود ہے مثلاً ریگستانی علاقوں میں اونٹ پیدا کیا گیا ہے تو اُس کے پاؤں کے تلوے چوڑے اور اسفنج کی طرح پولے ہیں کہ ریت میں نہ دھسیں ، اُس کی گردن بہت لمبی ہے تا کہ اونچے درختوں کے پتے چر سکے ، اس کو ایک خاص طرح کا خانہ دار معدہ دیا گیا ہے جس میں کئی کئی ہفتوں کے لیے کھانا ۔ پانی بھر لیتا ہے کیوں کہ جیسے ملک میں وہ پیدا کیا گیا ہے وہاں کئی کئی دن متواتر تک پانی چارے کا نہ ملنا کچھ تعجب نہیں ؛ اس کے علاوہ اُس کے پاس کوہان کا گودام ہے کہ اگر اس کو ایک عرصے خاص تک کھانا پینا کچھ بھی نہ ملے تو کوھان کی چربی «بَدلِ ما یتحلّل»[۲] کا کام دے۔ ھرن وغیرہ جنگلی جانوروں کی ٹانگیں پتلی پتلی ہیں تا کہ شکاری جانوروں سے بچنے کے لیے پھرتی کے ساتھ بھاگ سکیں ؛ ھاتھی کے ایک سونڈ لٹک رہی ہے جس سے وہ ھاتھ کا کام لیتا ہے ؛ پرندوں کے جُثّے سبک ہیں تا کہ ہوا میں اُڑ سکیں ؛ دریائی جانوروں کے

۱۔ اور آفتاب اپنے ٹھکانے کی طرف چل رہا ہے۔ یہ قدرت والے ، جاننے والے کا باندھا ہوا اندازہ ہے اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں یہاں تک کہ پھر پرانے کتارے کی شکل کا ہو جاتا ہے۔ نہ تو آفتاب چاند کو پکڑ سکتا ہے اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے اور سب کے سب ایک گھیرے میں پڑے تیر رہے ہیں۔

۲- جو چیز تحلیل ہوتی جائے اس کا بدلہ ۔

پنجے کھال سے جڑے ہوئے ہیں، گویا کہ ہر ایک کے پاس قدرتی چپو ہیں؛ گوشت خوار جانوروں کے پنجے اور دانت اُن کی غذا کے مناسب ہیں؛ نباتات میں پھل پھول کی حفاظت کے واسطے کانٹے ہیں، پوست ہیں، خول ہیں؛ سرد ملک کے جانوروں کی اُون بڑی بڑی اور گھنی ہے کہ جاڑہ نہ کھائیں۔ جتنے جان دار معرض تلف میں ہیں اُن میں توالد تناسل کی کثرت ہے تاکہ نسل معدوم نہ ہو مثلاً ایک ایک مچھلی لاکھ لاکھ سے زیادہ انڈے دیتی ہے؛ آدمی چوں کہ ابقائے حیات کا سامان عقل کی مدد سے بہم پہنچا سکتا ہے، سینگ اور پنجے اور اُون اس قسم کے قدرتی سامان اُس کو نہیں دیے گئے۔

جس ملک میں نباتات کی کثرت ہے وہیں برسات بھی زیادہ ہوتی ہے کیوں کہ وہ ملک پانی کا محتاج ہے۔ انسان اگر اپنی ہی بناوٹ میں غور کرے تو اُس کا ایک ایک رُواں صانع قدرت کی کمال دانش مندی اور عنایت پر گواہی دے رہا ہے ؎

بر ہر بن مو کہ می نہم گوش   فوارہ فیض اوست در جوش

اُس کے جسم میں ایک چھوٹا اور آسان سا پُرزہ ہاتھ ہے کہ دنیا میں جس قدر انسان کے تصرّفات ہیں اور انسان کی بساط پر خیال کرو تو ان تصرّفات کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، سب اسی پرزے کے ہیں۔

اہل یورپ نے عقل کے زور سے بڑی بڑی عمدہ کلیں بنائی ہیں، اس میں شک نہیں کہ ان کلوں سے عقل انسانی کی قوت بڑی شدو مد کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے مگر مجھ کو بھی دو چار کلوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے؛ ایک بکھیڑا ہے کہ بیگھوں زمین پر پھیلا ہے، سینکڑوں پرزے، ہزارہا پیچ، بیلن، پہیّے، چرخیاں، کمانیاں، خدا جانے دنیا بھر کے کیا کیا سامان جمع کیے ہیں تب کہیں جا کر وہ ایک مطلب حاصل ہوتا ہے

جس کے لیے کل بنائی گئی ہے - تو آدمی کی بنائی ہوئی کلوں کا حال ہے اور ایک ادنیٰ سی کل خدا کی بنائی ہوئی ہے ؛ یہی آدمی کا ہاتھ کہ ہزار ہا قسم کے کام اس سے نکلتے ہیں اور ترکیب دیکھو تو ایسی سلیس اور مختصر کہ ایک کف دست ہے اور تین تین جوڑ کی پانچ انگلیاں، اللہ اللہ خیر صلاح -

انسان کے بدن میں ایک اور ذرّے بھر کی چیز آنکھ ہے، اُس کی ساخت میں جو اندرونی حکمتیں ہیں، اُن سے بالاستعیاب ایک کتاب بن سکتی ہے مگر خارج کی احتیاطوں کو تو دیکھو کہ پہلے گویا ہڈیوں کا کاواک ہے جس میں نگینے کی طرح آنکھ تعبیہ کی ہوئی ہے، اوپر بھووں کا چھجے دار سایہ بان، سامنے پپوٹوں کا پردہ، پردے میں پلکوں کی جھالر، پھر پپوٹوں کے اندر منافذ ہیں جن میں سے آئینۂ چشم کے صاف رکھنے کو ہمیشہ ایک خاص طرح کی رطوبت رستی رہتی ہے، یہ وہی رطوبت ہے جو زیادہ ہو کر آنسو بن جاتی ہے؛ جتنی دفعہ انسان پلک جھپکاتا ہے گویا اتنی ہی دفعہ آئینے پر پچارا پھرتا ہے، گرد اور دھوئیں اور کنک کی صورت میں بے اختیار آنسو بہنے لگتے ہیں، جس کے یہ معنی ہیں کہ پچارا کافی نہیں بلکہ آئینے کو دھونے کی ضرورت ہے « فتبارک اللہ احسن الخالقین [1] » میرا تو کیا منہ ہے کہ موجودات عالم میں جو اسرار حکمت مضمر ہیں، اُن کا ایک شمّہ بھی بیان کر سکوں « ولو ان ما فی الارض من شجرۃ اقلام والبحر یمدہ من بعدہ سبعۃ ابحر ما نفدت کلمات اللہ ان اللہ عزیز حکیم [2] » مگر میری غرض اسی قدر ہے کہ دنیا کے کار خانے کو اس نظر سے

۱- اللہ جو سب سے بہتر پیدا کرنے والا ہے، بابرکت ہے-

۲- اور اگر زمین کے سارے درختوں کے قلم بنائے جائیں اور سمندر اور ویسے ہی سات اور کی سیاہی تو بھی اللہ کی باتیں تمام نہ ہوں بے شک اللہ قدرت والا دانا ہے -

دیکھنا چاہیے -

کل میں نے آیۃ اللہ (ابن الوقت کے چھوٹے بھتیجے کا نام ہے) کا سبق سنا ، وہ عجائب قدرت پڑھتا ہے - کسی شخص نے نیچرل[1] فلاسفی میں سے بعض بعض مضامین چھانٹ کر اردو میں ترجمہ کر دیے ہیں ، اسی میں لکھا تھا کہ مچھر کے منہ کے آگے جو ایک پتلی سونڈ سی ہوتی ہے، وہ حقیقت میں ایک نلوا ہے، اس نلوے میں تین اوزار : ایک تو سوئی ، جس کو مچھر مسام میں داخل کرتا ہے ، ایک آری کہ مسام کو چوڑا کرنے کی ضرورت ہو تو اس سے کام لے اور ایک سینگی جس کی راہ خون چوستا ہے - اس میں اتنی بات اور بھی تھی کہ اس شکل خاص میں مچھر کی حیات کی مدت صرف تین دن کی ہے - ایک مقام پر تھا کہ تیتری کے ایک پر میں کھپروں کی طرح تیس ہزار دیولیاں ہیں - اس طرح کی باتوں کو اگر انسان سرسری طور پر نہ سنے جیسی کہ اس کی عادت ہے تو ہر ہر ذرہ اس بات کی گواہی دے گا کہ اس کو کسی بڑے قدرت والے دانش مند ہمہ داں ، حاضر ، ناظر ، سمیع و بصیر نے کسی مصلحت سے جان بوجھ کر بنایا ہے - ممکن نہیں کہ انسان صمیم قلب سے موجودات عالم میں غور اور خوض کرے اور اس کا دل اندر سے نہ بولنے لگے کہ یہ اتنا بڑا کارخانہ بہ ایں عمدگی و انضباط خود بخود یا اتفاقیہ طور پر تو نہیں ہو گیا کیوں کہ واقعات اتفاقی کی شان ہی دوسری ہوتی ہے - ان میں قاعدے کا کہاں پتا اور انضباط کا کیا مذکور اور قاعدہ اور انضباط بھی کیسا کہ دنیا کی ابتدا سے لے کر آج کی گھڑی تک تو ان میں رتی برابر فرق پڑا نہیں» فلن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا

۱- یعنی علم طبعی -

ولن تجد لسنۃ اللہ تحویلا¹ ۔

جس غور کی طرف میں تم کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں اُس میں یہ بھی داخل ہے کہ وقت کیا چیز ہے، جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا۔ اگرچہ وقت کی وسعت کا اندازہ بھی فہم بشر سے خارج ہے مگر خیر جہاں تک تم سے اجرام فلکی کے فاصلوں کی طرح اندازہ کرتے بن پڑے لاکھ، دو لاکھ، چار لاکھ برس کا ایک محدود وقت لے کر اُسی کی وسعت کو سوچو اور تمثیلاً یوں تصوّر کرو کہ وقت ایک بڑا لمبا خط ہے، اُس میں سے تمھاری ہستی اگرچہ تمھارے معتقدات کے مطابق طب انگریزی پر پورا عمل کرنے سے حد طبعی سے بھی کتنی ہی متجاوز کیوں نہ ہو جائے تاہم اُس کو وقت مفروض کے ساتھ کیا نسبت ہوگی؟ شاید جیسی محیط زمین کے مقابلے میں ایک انچ کو یا اس سے بھی کم۔ یہ تو انسان کی ہستی ہے اور اُس پر خدا سے انکار اور اپنی عقل پر نازِ بے جا! انسان سے دنیا میں ہزار ہا طرح کی بیہودگیاں سرزد ہوتی ہیں مگر یہ سب بیہودگیوں پر فوق لے گئی ہے کہ خدا ہی کا منکر ہو۔ بڑے افسوس کی بات ہے اور پرلے درجے کی بد قسمتی کہ عقل جو انسان کو اسی غرض سے دی گئی ہے کہ مخلوقات سے خالق کو پہچانے، ورنہ دنیا کی چند روزہ زندگی تو جانور بھی بسر کر لیتے ہیں جن کو بہت سا کھانا اور پانی درکار ہوتا ہے اور مزہ یہ ہے کہ حاجتیں کثیر اور عقل کم اور پھر انسان سے کہیں زیادہ خوش حال «تغدو خماصاً و تروح بطاناً»² غرض بڑے افسوس کی بات ہے کہ وہی عقل انسان کو ایسا گمراہ کرے کہ خدا کا قائل نہ ہونے دے۔ حقیقت میں

۱۔ اور ہرگز نہیں پائے گا تو عادت الٰہی میں تبدیلی اور ہرگز نہیں پائے تو عادت الٰہی میں انقلاب ۔

۲۔ صبح سویرے نکلے بھوکے اور شام کو لوٹے پیٹ بھرے ۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی آدمی کس منھ سے کہ سکتا ہے کہ خدا نہیں۔ تم مجھ کو اتنا تو سمجھاؤ کہ تم نے اپنے تئیں سمجھا ہے کیا؟ چندیں ہزار عالم کے مقابلے میں تمھاری کیا حقیقت ہے اور چندیں ہزار عالم بھی نہ سہی، ان کی مخلوقات بھی نہ سہی؛ ایک روئے زمین پر ابتدا سے اب تک تم جیسے اور تم سے بہتر اور تم سے بہتر سے بہتر کروڑھا آدمی پیدا ہوئے اور اپنی زندگی میں انھوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ خدا کے ایسے ایسے بھی بہت سے بےشمار بندے ہوئے ہیں جنھوں نے حکومتیں کیں، سلطنتیں کیں، اپنے زمانے میں نامی نامور ہوئے اور پھر ایسے مٹے کہ گویا پیدا ہی نہیں ہوئے تھے، نہ ان کا نام ہے نہ نشان ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ تم کوئی انوکھے آدمی ہو؟ تم بھی اپنے ارادے سے پیدا نہیں ہوئے اور قسم ہے اس ذات پاک کی کہ جس کے ہاتھ میں میری اور تمھاری دونوں کی اور سب جان داروں کی جان ہے، اپنے ارادے سے زندہ بھی نہیں ہو اور اپنے ارادے سے مرو گے بھی نہیں اور مرے بعد مہینے دو مہینے پیچھے نہ سہی پچاس، سو، دوسو، ہزار برس بعد روئے زمین پر اتنا جاننے والا بھی تو نہیں ہوگا کہ ابن الوقت بھی کوئی تھے۔ بندۂ خدا! ذرا تو سوچ کر کہو خدا بھی ہے یا تم ہی تم ہو۔

ابن الوقت۔ آپ نے تو ناحق ڈپٹی کلکٹری کی، آپ کو تو سلطان الواعظین ہونا چاہیے تھا لیکن گستاخی معاف جتنی باتیں آپ نے کہیں اساطیر الاوّلین ہیں، مجھ کو بھی معلوم ہیں۔ آپ کی تمام تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ نے لاعلمی کا نام خدا رکھ چھوڑا ہے؛ دریافت سبب سے عاجز ہوئے خدا ماننے لگے۔ لوگ دیکھتے ہیں کہ مثلاً آدمی پانی نہیں برسا سکتا تو کہتے ہیں خدا برساتا ہے لیکن فرض کیجیے کہ کسی وقت پانی کو

ہم اپنے بس میں کر لیں اور جب چاہیں برسا لیا کریں اور جب ہم کو یہاں تک پتا لگ گیا ہے کہ ہوا بسیط نہیں جیسا کہ متقدّمین فلاسفہ خیال کرتے تھے بلکہ آکسیجن ، ہیڈروجن ، نیٹروجن ، تین قسم کی ہواؤں سے مرکب ہے اور ہوا میں اس درجے تک ہیڈروجن غالب ہو تو ہوا پانی بن جاتی ہے ۔ کیا تعجب ہے کہ کسی نہ کسی دن ہم پانی کے برسانے پر قادر ہو جائیں ۔ جب سے یورپ میں علوم جدیدہ شائع ہونے شروع ہوئے ، ثابت ہوتا گیا کہ انسان کی طاقت محدود نہیں ۔ کون کہ سکتا ہے کہ انسان جس نے ریل چلائی، تار دوڑایا اور ہزارہا نئی نئی چیزیں دریافت کیں ، آئندہ کیا کچھ نہیں کرے گا ۔

حجۃالاسلام ۔ میں واقعات پیش کرتا ہوں اور تم مفروضات کا حوالہ دیتے ہو ۔ یہ سچ ہے کہ اس زمانے میں انسان نے اپنی قوّت کو بہت بڑھا لیا ہے مگر «تانت باجی راگ پایا» ۔ معلوم ہے کہ انسان کہاں تک ترقی کر سکتا ہے ؛ اس کی ساری پیری اتنی بات پر ختم ہے کہ وہ چیزوں میں ، سو بھی سب میں نہیں ، کسی قدر تصرف کر سکتا ہے اور بس مثلاً ریل میں سوائے اس کے اور کیا دھرا ہے کہ خدا نے کسی کے ذہن کو اس طرف منتقل کر دیا کہ بھاپ میں بڑی طاقت ہے ، پھر لوگ لگے اس طاقت سے کام لینے کی تدبیریں کرنے ۔ رفتہ رفتہ ریل چل کھڑی ہوئی مگر یہ تو فرماؤ ریل کی ایجاد میں انسان نے سب کچھ تو کیا لیکن پانی ، آگ، بھاپ ، لوہا ، لکڑی جو جو چیزیں ریل میں کام آتی ہیں ، اُن میں سے کوئی چیز یا کسی چیز کی کوئی خاصیت خلق بھی کی ۔ یاد رکھو دریافت کرنے اور خلق کرنے میں بہت بڑا فرق ہے ۔ مجھ کو بھی یاد ہے میں نے مدرسے میں ٹریشم صاحب

کو یہ تماشا کرتے ہوئے دیکھا تھا کہ ایک شفاف بوتل میں ہوا بھر لی، تھوڑی دیر میں بوتل کے اندر پانی کی بوندیں بن جاتیں۔ اسی پر تم کو خیال ہوا ہو گا کہ آدمی پانی برسانے پر قادر ہو جائے تو تعجب نہیں۔ تم کو تو شروع سے انگریزوں کے ساتھ عقیدہ ہے، اس تماشے کی تم ہی نے کچھ عظمت کی ہو گی۔ میں تو کئی بار بولنے کو ہوا تھا کہ اس میں آپ نے کمال ہی کیا کیا؟ ہم تو اپنے گھروں میں ہر روز دیگچی کی چپنی سے بوندیں جھڑتی ہوئی دیکھتے ہیں۔ لیکن صرف اتنی بات سے کہ آدمی نے تھوڑی سی جگہ میں کسی تدبیر سے اس قدر ہیڈروجن جمع کر دی جتنی ہوا کے پانی بن جانے کے لیے ضرور ہے، نہ خدا سے انکار کر سکتا اور نہ خدا سے مستغنی ہو سکتا اور نہ خود دعوائے خدائی کر سکتا اور جب آدمی ہی بہ ایں عقل و دانش خدا نہ ہو سکا تو چاند، سورج، عناصر وغیرہ کسی میں بھی خدا ہونے کی لیاقت نہیں، کیوں کہ اُن میں تو عقل و ارادہ کی بھی کمی ہے اور مجبور محض اور لا یعقل محض معلوم ہوتے ہیں کالجماد اور حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوۃ نے جو چاند، سورج اور تاروں کو دیکھ کر فرمایا تھا «لا احب الآفلین» کہ میں چھپ جانے والوں کو نہیں چاہتا، اُن کا بھی یہی مطلب تھا۔

ابن الوقت۔ بات یہ ہے کہ دنیا کی پہیلی کا کسی نے اتا پتا تو پایا نہیں، جو جس کی سمجھ میں آتا ہے کہتا ہے۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ ناحق کیوں سر دُکھایا، جس طرح دنیا چلی آئی، اُس کو چلنے دیا جائے۔ میں تو حافظ کے اس شعر کو بہت پسند کرتا ہوں ؎

سخن از مطرب و می گو ز راز دهر کمتر جو
که کس نه کشود و نه کشاید به حکمت این معمارا

حجۃالاسلام۔ اول تو شاعروں کے مقولات معاملات مذہبی میں قابل استشہاد نہیں اور پھر آپ اس کو اپنے مطلب پر بھی خوب ڈھال لے گئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس راز کی جستجو کو حافظ منع کرتا ہے وہ وہ اسرار ہیں جن کو خدا نے آدمی سے مخفی رکھنا چاہا ہے مثلاً « ان اللہ عندہ علم الساعۃ وینزل الغیث و یعلم مافی الارحام و ماتدری نفس ماذاتکسب غدا و ماتدری نفس بایّ ارض تموت ان اللہ علیم خبیر[1] » ۔ یا مثلاً، وہی بات جس میں تم کو شک واقع ہوا اور ابھی تھوڑی دیر ہوئی اُس کی نسبت تم نے کہا کہ اگر دنیا میں اونچ نیچ خوشی اور رنج یعنی اختلاف حالات امر تقدیری ہے تو خدا کو دانش مند اور منصف اور رحیم ماننا مشکل یا جیسے کوئی انسان خالق عالم کی غرض و غایت کی تفتیش کرنا چاہے اور ہر واقعہ اور ہر موجود کے بارے میں پوچھنے لگے کہ یوں کیوں ہوا یا مثلاً معلوم کرنا چاہے کہ روح کیا چیز ہے اور جسم سے کس طرح کا تعلق رکھتی ہے یا علّت و معلول میں کیا علاقہ ہے ؟ اس قسم کی ہزاروں باتیں ہیں کہ اس ہستی میں انسان پر منکشف ہونے والی نہیں۔ ان چیزوں کی جستجو انسان کو کرنی ضرور نہیں بلکہ جو کچھ ہو رہا ہے نظر استحسان سے دیکھ خاموش ہو رہے اور کسی بات کو نہ سمجھ سکے تو اعتراض نہ کرے بلکہ قصور فہم کا معترف ہو۔ علاوہ بریں تم کو البتہ اختیار ہے کہ اس قسم کے خیالات کو دل میں

۱۔ اللہ ہی کے پاس روز قیامت کا علم ہے اور پانی برساتا اور جو کچھ رحم میں ہے جانتا ۔ کسیٔ کو معلوم نہیں کل کیا پیش آئے گا اور کسی کو معلوم نہیں کس زمین میں مرے گا ، اللہ ہی جاننے والا ہے اور خبر رکھنے والا ۔

جگہ نہ دو لیکن اس کی ایسی مثال ہوگی کہ نصف النہار کے وقت آفتاب بڑی آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہے اور چمگدڑ اُس کو نہیں دیکھنا چاہتی، نہ دیکھے مگر آفتاب کا اس میں کیا زیاں ہے ؎

گر نہ بیند بہ روز شپّرہ چشم - چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

چمگدڑ کا یہیں تک بس چل سکتا ہے کہ نہ دیکھے نہ یہ کہ دوسروں کو نہ دیکھنے دے یا آفتاب کو تیرہ و تار کر دے یا اُس کو اُس کے معمول کے مطابق نہ نکلنے دے لیکن ایک دن پرسش ہونی ہے کہ آنکھیں تھیں، کیوں نہیں دیکھا؟ کان تھے کس لیے نہیں سنا؟ عقل تھی کس واسطے نہیں سمجھا؟

ابن الوقت۔ ابھی ایک بحث طے نہیں ہوئی کہ آپ نے قیامت اور اُس کی بازخواست کی دوسری بات نکال کھڑی کی۔

حجۃ الاسلام - بحث مت کہو، میں تو مذہب کے بارے میں مناظرے اور مباحثے کا سخت مخالف ہوں اور میں نے شروع ہی میں تم سے کہہ دیا تھا کہ دین حجت اور تکرار سے حاصل ہونے والی چیز نہیں؛ دین دوا ہے بیمار کی، تسلی ہے بے قرار کی، متاع ہے خریدار کی، بشارت ہے اُمیدوار کی، نجات ہے گنہ گار کی، یعنی عنایت ہے پروردگار کی۔ جو کچھ میں نے تم سے کہا ہرگز از راہ بحث نہیں کہا بلکہ بہ تقاضائے محبت تم کو اپنی سمجھ کے مطابق ایک تدبیر بتائی کہ اگر اپنے دل میں صدق نیت کے ساتھ غور کرو تو عجب نہیں خلجان باقی نہ رہے اور قیامت اور بازخواست قیامت کی بات کے نکالنے کی جو تم نے کہی تو یہ تمام زحمتیں اُسی دن کے لیے ہیں۔ اگر قیامت اور قیامت کی بازخواست نہ ہوتی تو کیوں دین ڈھونڈتے اور کس لیے مذہب کی تلاش کرتے؛ بڑی مشکل تو یہی ہے کہ مرنے سے بھی آدمی کا پنڈ نہیں چھوٹتا،

یہ زندگیٔ دنیا تو چند روزہ ہے، بھلی طرح بھی گزر جائے گی اور بری طرح بھی گزر جائے گی۔ پہاڑ زندگی تو وہ ہے جو مرنے سے شروع ہو گی گویا از سر نو پیدا ہوئے اور جس کی اصلاح دین کا مقصود اصلی ہے۔

ابن الوقت۔ خدا کے ہونے پر تو بھلا آپ نے ایک دلیل قائم کی بھی۔ ہر چند میرے دل کو اس سے تسلی نہیں ہوئی اور میں اس وقت تک یہی سمجھتا ہوں کہ لوگ ہو رہے ہیں اسباب کے خوگر، جدھر آنکھ اٹھا کر دیکھتے ہیں سبب ہی سبب نظر آ رہے ہیں۔ اس وجہ سے انھوں نے ذہن میں تعمیم کر لی ہے کہ ہر واقعے کے لیے سبب کا ہونا ضرور ہے اور سبب نہیں پاتے تو جھٹ سے خدا کے قائل ہو جاتے ہیں مگر میں سننا چاہتا ہوں کہ قیامت اور بازخواست قیامت کا آپ کے پاس کیا ثبوت ہے۔

حجۃالاسلام۔ میں نہیں جانتا کہ خدا کے لیے تم کس طرح کا ثبوت چاہتے ہو۔ اگر یہ مطلب ہے کہ آنکھ سے دیکھوں یا ہاتھ سے ٹٹولوں تو میں کیا کوئی بھی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ تم کو خدا کا دیدار دکھا دے گا مگر یہ تو فرماؤ کہ ثبوت، حجت، دلیل سارے اذعان حاصل کرنے کے ذریعے ہیں، اذعان مرئیات اور ملموسات ہی میں منحصر ہے؟ ہر گز نہیں۔ ہر شخص اپنے وجدانیات کا اذعان کرتا ہے حالانکہ امور وجدانی نہ مرئی ہیں نہ ملموس اور تعمیم پر جو تم نے اعتراض کیا کیوں کر میں سمجھوں کہ حقیقت میں تم کو شک ہے جب کہ میں دیکھتا ہوں کہ تم کہتے کچھ ہو اور کرتے کچھ ہو۔

ابن الوقت۔ یہ آپ نے کیا بات فرمائی؟

حجۃالاسلام۔ میرے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ تم لوگوں پر

تو اعتراض کرتے ہو کہ کثرت سے اسباب دیکھتے دیکھتے اُنھوں نے تعمیم کر لی ہے کہ ہر واقعے کے لیے سبب کا ہونا ضرور ہے یعنی یہ تعمیم تمھارے نزدیک لوگوں کی غلطی ہے مگر میں پوچھتا ہوں کہ اگر تمھاری میز پر کی ایک پنسل جگہ سے بے جگہ ہو جائے تو ضرور تم کو یقین ہوگا کہ کسی نے میری میز کو چھیڑا اور بے شک تم نوکروں پر خفا ہو گے کہ کیوں میری چیزوں کو ہٹاتے ، سرکاتے ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو اور لوگ کرتے ہیں وہی تم بھی دن میں ہزاروں بار کرتے ہو، تمھارا نوکروں پر خفا ہونا نتیجہ ہے اُس تعمیم کا جو پہلے سے تمھارے ذہن میں مرتکز ہے کہ کوئی شے از قسم جماد اپنے ارادے سے حرکت نہیں کر سکتی تا وقتیکہ کوئی محرک اُس کو نہ ہلائے یا مثلاً تم کو اس کا تو اذعان ہے کہ جس نے بشریت کا جامہ پہنا ہے، ایک نہ ایک دن ضرور مرے گا لیکن تم نے کتنے آدمیوں کو مرتے دیکھا اور سنا اور تم کو محدود معلومات پر گو وہ فی حد ذاتہا کتنی ہی وافر اور وسیع کیوں نہ ہو کُلّیہ قاعدہ قرار دے لینے کا کیا منصب ہے ؟ بلکہ تمھارے اعتراض کا ماحصل تو حقیقت میں یہ ہے کہ کُلّیہ ٹھہرانا ہی غلطی ہے حالانکہ ساری دنیا کا اس پر اجماع ہے کہ قوائے عقلی میں سے ایک قوت تعمیم ہے اور دنیا کے کاروبار کا مدار اسی پر ہے اور قیامت اور باز خواست قیامت کا ثبوت پوچھو تو میں اسی کے لیے نہیں بلکہ کل دینیات کے لیے وہی ایک ہدایت کرتا ہوں کہ پہلے دنیا کے حالات میں غور کرنے کی عادت ڈالو اور خدا کو منظور ہے تو (میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ کتنے دن میں مگر مخاصانہ طور پر نہ ہو تو امید ہے کہ جلد) سب سے پہلے دل میں انکسار کی سی کیفیت پیدا ہوگی یعنی تم پر یہ ثابت

ہو جائے گا کہ میں اس عظیم الشان کارخانے میں محض ایک ذرۂ ناچیز ہوں اور میری ہستی خواب وخیال سے بھی زیادہ بے ثبات ہے۔ تب میں یقین کرتا ہوں کہ تمہارے شکوک خود بہ خود دفع ہو جائیں گے اور بے دلیل اور بلا ثبوت تمہارا دل اندر سے گواہی دینے لگے گا کہ لاریب دنیا اور مافیہا سب کا خالق خدا ہے، اس کی قدرت کی حد و پایاں نہیں، کسی بشر کا مقدور نہیں کہ اس کی صفات کماحقہ پر احاطہ کر سکے، وہ ہمارا مالک ہے اور اس کو ہر طرح کا استحقاق ہے اور ہم پر جس طرح چاہے حکم رانی کرے۔ اس وقت تم کو قیامت اور بازخواست قیامت اور دین کی سبھی باتیں مستبعد معلوم ہوتی ہوں گی لیکن اسی غور سے تمہارا سارا استبعاد جاتا رہے گا کیوں کہ دین بے جوڑ باتوں کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اصول و فروع سب ایک دوسرے سے ملتے ہوئے ہیں۔ ممکن نہیں کہ آدمی خدا کا اذعان کرے «کما ھو حق اذعانہ» اور پھر دین کی کسی بات میں ذرا بھی چون و چرا کرسکے «کلالو تعلمون علم الیقین[1]»۔ ہم تو بھائی سیدھے مسلمان ہیں، خدا کو مانتے ہیں اور اس کو شرط انسانیت سمجھتے ہیں۔ دنیا کے حالات پر نظر کرتے ہیں تو عاقبت کا ہونا ایک امر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ دل ہی کچھ اس طرح کا بنایا گیا ہے کہ نیکی بدی میں امتیاز کرتا ہے اور خدا جانے کیوں کر بیٹھ گئی ہے، کسی طرح یہ بات ذہن سے نہیں نکلتی کہ اس دنیا میں تو نہیں، ہو نہ ہو مرے بعد اس کا نتیجہ ضرور نکلے گا پر نکلے گا۔

ابن الوقت ۔ ہمارے دل میں تو ایک لمحے کو بھی ایسے خیالات نہیں آتے۔

حجۃ الاسلام ۔ آتے نہیں یا تم آنے نہیں دیتے اور آتے تو

۱۔ اے کاش تم کو علم الیقین ہوتا!

کیوں نہ ہوں گے مگر یوں کہو کہ "تم ایسے خیالات کو دل میں ٹھہرنے نہیں دیتے اور سچ ہے دنیا ہے بھی ایسی ہی جگہ ، اس میں کثرت سے وجوہ صارف موجود ہیں ۔ اسی کا فضل دست گیری کرے تو انسان مشاغل دُنیوی پر غالب آسکتا ہے۔ اس جہان میں اور اس جہان میں نقد و نسیہ ، موجود و موعود ، عاجل و اجل، شاهد و غائب ، ظاهر و باطن ، مجاز و حقیقت کا فرق ہے ۔ واقع میں ادھر سے ٹوٹنا ، چھوٹنا آسان کام نہیں مگر تاہم «مالا یدرک کله لا یترک کله[1] ۔ آدمی اپنی طرف سے کوشش کرے اور اس کی عنایت کا امیدوار رہے ۔

میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ دین و مذہب کا اصل اصول طبیعت میں انکسار پیدا کرنا ہے ، جس ڈھب سے ہو ۔ یوں سمجھو کہ آدمی بیمار ہے اور دین اعتدال مزاج ؛ ہم کو دین کی ویسی ہی قدر ہونی چاہیے جیسی ایک شخص کو جو مرض مہلک میں مبتلا ہے، تن درستی کی ہوتی ہے ۔ جو شخص بیماری سے آگاہ ہے، کبھی اپنا علاج آپ کرتا ہے مگر «رای العلیل علیل[2]» اکثر طبیب ہی کی طرف رجوع لاتے ہیں ؛ وہ نبض سے، قارورے سے ، مریض کے بیان سے ، مرض اور اسباب مرض کو تشخیص کر کے دوا اور پرہیز دونوں بتاتا ہے اور خدا کو منظور ہوتا ہے تو مریض اس تدبیر ظاهر پر عمل کرنے سے آخر کار جان بر ہو جاتا ہے ۔ دین کے اعتبار سے ہم تم دونوں بیمار ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ تم اپنے تئیں بیمار نہیں جانتے ، تمھاری بیماری درجۂ ردائت کو پہنچ گئی ہے اور تم کو خبر نہیں ۔ تم نے علاج کی طرف بالکل توجہ نہیں کی ۔ میں بیماری کو سمجھتا ہوں مگر

۱۔ جو چیز ساری میسر نہ آئے تو ساری چھوڑی بھی تو نہیں جاتی ۔
۲۔ بیمار کی رائے بھی بیمار۔

افسوس ہے کہ طبیب نہیں لیکن جس طرح دائم المرض اپنا علاج
کرتے کرتے بعض دواؤں کی خاصیتیں جاننے پہنچاننے لگتا ہے ،
اتنا کہ سکتا ہوں کہ تم کو طبیعت میں انکسار پیدا کرنے
کی ضرورت ہے اور یہ ساز و سامان اور تزک و احتشام اور امارت
اور حکومت یعنی لوازم رعونت سب سخت درجے کی بد پرہیزیاں
ہیں جن کے رہتے طبیعت میں انکسار کا پیدا ہونا محال نہیں تو
مشکل ہونے میں کچھ شک بھی نہیں۔ وہ غور جو میں نے بتایا
ہے ، عمدہ دوا ہے اور مجھ کو اس نے بہت فائدہ دیا ہے۔
مرض گیا تو نہیں لیکن کمی ضرور ہے ، طبیب کی مجھ کو بھی
تلاش ہے مگر میسر نہیں۔ تم سمجھے طبیب سے میری کیا مراد
ہے؟ پیر طریقت۔ طبیعت میں انکسار پیدا کرنے کے لیے یہ لوگ بہت
سی تدبیریں کرتے ہیں؛ بعض ریاضات اور مجاہدات سے ، بعض
اسفار و سیاحات سے اور کوئی کوئی صرف غور و فکر یعنی مراقبات
سے۔ یہ طبیعتوں کے اختلاف حالات پر موقوف ہے کہ کون سی
تدبیر سودمند واقع ہوگی اور اس کی تعیین قابل اطمینان
طبیب دین یعنی پیر طریقت ہی کر سکتا ہے۔ نزول مصائب
کو طبائع کے رام کرنے میں اکثر سریع الاثر دیکھا ہے۔
«ھوالذی یسیرکم فی البروالبحر حتی اذا کنتم فی الفلک و جرین
بہم بریح طیّبہ و فرحوا بہا جاءتہا ریح عاصف و جاء ھم الموج من
کل مکان و ظنوا انھم احیط بہم دعواللہ مخلصین لہ الدین لئن انجیتنا
من ھذہ لنکونن من الشاکرین ○ فلما انجاھم اذا ھم یبغون فی الارض
بغیر الحق یا ایہا الناس انما بغیکم علی انفسکم متاع الحیوۃ الدینا
ثم الینا مرجعکم فننبئکم بما کنتم تعملون○ انما مثل الحیوۃ الدنیا
کماء انزلناہ من السماء فاختلط بہ نبات الارض مما یاکل الناس والانعام
حتی اذا اخذت الارض زخرفہا و ازینت و ظن اھلہا انھم قادرون

علیہا اتٰہا امرنا لیلاً او نہاراً فجعلناھا حصیدا کان لم تغن بالامس کذلک نفصل آلآیات لقوم یتفکرون[1] » اللہ اللہ کیا بیان ہے۔ آدمی اگر آنکھوں پر ٹھیکریاں نہ رکھے کانوں میں روڑ نہ ٹھونس لے، جان بوجھ کر مگرا نہ بنے تو اُس کو دین دار کرنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے مگر سہ

نسیم غفلت کی چل رہی ہے اُمنڈ رہی ہیں بلا کی نیندیں
کچھ ایسا سوئے ہیں سونے والے کہ جاگنا حشر تک قسم ہے

غرض مصیبت بھی دین دار کے حق میں بڑی نعمت ہے اور یہی وجہ ہے کہ بزرگان دین مصیبت کو عزیز رکھتے تھے۔ بعض قلوب خلقتاً رقیق ہوتے ہیں اور دوسرے کو مبتلائے مصیبت دیکھ کر پگھل جاتے ہیں ۔ پیغمبر صاحب ص نے علیہ سن

۱۔ وہ تمھیں سیر کراتا ہے خشکی اور تریؔ کی یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور وہ تم کو اچھی ہوا کے ساتھ لے چلتی ہے اور یہ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں تو زور کی ہوا آتی ہے اور ہر طرف سے موج آنے لگتی ہے اور خیال کرتے ہیں کہ اب تو گھر گئے تو خلوص کے ساتھ خدا کو پکارتے ہیں کہ اگر ہم کو اس بلا سے نجات دے تو ہم تیری شکر گزاری کریں گے، پھر جب اُن کو نجات دیتا ہے تو ناحق زمین میں سرکشی کرنے لگتے ہیں۔ لوگو! تمھاری سرکشی کا نقصان تمھاری ہی جانوں پر ہے ۔ دنیا میں فائدہ اٹھا لو، پھر تم کو ہمارے پاس لوٹ کر آنا ہے تو ہم تم کو جتائیں گے جو تم عمل کرتے تھے ۔ دنیا کی زندگانی کی مثال اُس پانی کی سی ہے جس کو ہم نے آسمان سے اُتارا، پھر اُس میں زمین کی روئیدگی مل گئی جس کو لوگ اور چوپائے کھاتے ہیں یہاں تک کہ جب زمین بن سنور گئی اور آراستہ ہو گئی اور لوگ سمجھے کہ اب ہمارے بس کی بات ہے، ہمارا حکم رات یا دن کو پہنچا اور ہم نے اُس کو روند ڈالا گویا کل تھی ہی نہیں ۔ جو لوگ فکر کرتے ہیں ان کے لیے ہم نشانیوں کو اسی طرح تفصیل سے بیان کرتے ہیں ۔

الصلوۃ اکملہا شروع شروع میں انسداد بت پرستی کے لیے
زیارت قبور سے منع فرمایا تھا پھر ارشاد ہوا «کنت نہیتکم
عن زیارات القبور الا فزوروھا فانہا الین للقلوب[1] » خشک سالی اور
وبا اور آفات ارضی ، ساوی، مثلاً شدید زلزلہ یا سخت آندھی
یا بارش مفرط یا ژالہ زدگی وغیرہ ایسے مواقع پر بھی لوگوں
کو انابت الی اللہ ہوتی ہے اور بعض نفوس قدسی ایسے بھی
ہیں کہ رھٹ چلتے دیکھا اور انقلاب دنیا کے خیال سے اُن کی
حالت متغیر ہوئی۔ ع برآواز دولاب مستی کنند ۔ اپنے نفس کا اندازہ
تم ھی خوب کر سکتے ہو جس تدبیر کو موثر پاؤ کرو مگر کرو ضرور

کیا وہ دنیا جس میں ہو کوشش نہ دیں کے واسطے
واسطے واں کے بھی کچھ یا سب یہیں کے واسطے

ابن الوقت ۔ آپ تو مجھ کو راھب بنانا چاھتے ھیں ،
آپ کی یہ تعلیم خاص کر آپ کے مذھب اسلام کے بالکل خلاف
ھے ۔ مرنا مسلّم ھے مگر ھم دیکھتے ھیں کہ اسی مختصر
زندگی میں ھم خوش بھی رہ سکتے ھیں ۔ خوشی کے بہت سے
سامان ھیں اور ھم کو خوشی اور رنج دونوں کا احساس بھی ھے ۔
ھمارے احساس اور سامان خوشی دونوں کے جمع ہونے سے اس
کے سوائے اور کیا نتیجہ نکل سکتا ھے کہ جہاں تک ممکن
ھو ھم کو یہ زندگی خوشی میں بسر کرنی چاھیے اور اگر ھم
موت کے خوف سے جوگیوں کی طرح بھوکے اور ننگے رہ کر
مر جائیں تو اس کا مطلب یہ ھوگا کہ دنیا لغو و لاحاصل ھے ۔ کیا
حال ھو دنیا کا اگر سب لوگ اسی خیال کے ھو جائیں ؟

حجۃ الاسلام ۔ میں تم کو دیکھتا ھوں دنیا میں اس درجے
منہمک کہ تم کو دین سے کچھ لگاؤ ھی نہیں ۔ اگر اسلام

۱۔ میں نے تم کو زیارت قبور کی مناھی کی تھی ، سنو جی! قبروں
پر جایا کرو ، اس سے دل خوب نرم ھوتے ھیں۔

کی بہت سی سہولتوں میں سے توبہ نہ ہوتی تو میں تم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح کفارۂ خود کشی کی صلاح دیتا ۔ تمھیں تو کیا یاد ہوگا مگر سورۂ بقر میں ہے « واذ قال موسی لقومہ یا قوم انکم ظلمتم انفسکم باتخاذ کم العجل فتوبوا الی بارئکم فاقتلوا انفسکم ذلکم خیر لکم عند بارئکم[1] » تاہم فرماؤ میری کس بات سے تم نے سمجھا کہ میں رہبانیت کی تعلیم کرتا ہوں ؟ اس سے کہ دنیا کے حالات میں غور کرو یا اس سے کہ خدا کی عظمت کو اپنے ذہن میں بٹھاؤ یا اس سے کہ طبیعت میں انکسار پیدا کرو ؟

ابن الوقت ـ کیا ایسے خیالات رکھ کر آدمی دنیا میں خوش بھی رہ سکتا ہے ـ پھر وہ رہبانیت ہوئی یا کیا ہوئی ؟

حجۃ الاسلام ـ اگر مذاق عقل صحیح ہو تو دین سے بڑھ کر کسی چیز میں خوشی ہو نہیں سکتی ـ دنیا کی فانی ، عارضی ، چند روزہ ، بے ثبات خوشیوں کو خوشی سمجھنا غلطی ہے ـ جیسے ایک لڑکا کھیل میں اپنا وقت ضائع کرنے سے یا ایک جواری جوا کھیلنے سے یا ایک افیونی افیون کے عمل سے یا ایک نادان بیمار بدپرہیزی سے خوش ہوتا ہے ـ اصلی اور پاکیزہ اور ابدی خوشی وہ تھی جس کے لیے پیغمبر صاحب صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اوپر اس قدر زحمت اٹھاتے کہ راتوں کو نماز میں کھڑے رہنے سے پاؤں سوج سوج جاتے ـ ساری عمر بے چھنے جو کی روکھی روٹی کبھی پیٹ بھر کر کھائی ہی نہیں ـ گرسنگی کی ایذا کو دبانے کے لیے ہمیشہ بطن مبارک پر پتھر باندھے رہتے

۱ـ اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا ”لوگو! تم نے بچھڑا پوج کر بڑا غضب کیا ، خدا کی طرف رجوع کرو ، اپنی جانوں کو ہلاک کرو ، خدا کے نزدیک یہ تمھارے حق میں بہتر ہوگا ـ“

تھے - اکثر راتیں اہل بیت نبوی پر گزر جاتیں کہ چراغ تک نہیں جلتا تھا - کھجور کے کُھرّے بورے پر لیٹنے سے پہلوؤں میں اور پیٹھ میں بدّھیاں پڑ پڑ جاتی تھیں اور حدیث « و قرۃ عینی فی الصلوۃ » میں تو آپ نے فرما بھی دیا کہ میرا جی تو نماز ہی میں خوش ہوتا ہے -

ابن الوقت - یہ تو آپ وہی عاقبت کی خوشیوں کو پھر لے دوڑے - میرا اعتراض تو یہ ہے کہ دین کے خیالات دنیا کی خوشی کو منغص کر دیتے ہیں -

حجۃ الاسلام - تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے - دنیا کی خوشی اور دنیا کا رنج دونوں کا مدار اکثر انسان کا اپنا خیال ہے - جس قدر دنیا اور دنیا کے تعلقات کی تم قدر و وقعت کرتے ہو، اسی قدر تم دنیاوی خوشی اور رنج سے متاثر ہو سکتے ہو - دین جس کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا اور دنیا کے تعلقات سب ہیچ ہیں، دنیاوی خوشیوں کو منغص نہیں بلکہ دنیاوی رنج اور خوشی دونوں کو انسان کی نظر میں حقیر اور نا چیز کر دیتا ہے - جو شخص غصّے کو پی جائے، انتقام نہ لے، جھوٹ نہ بولے، غیبت نہ کرے، حریص و طماع نہ ہو، جابر و سخت گیر نہ ہو، ممسک و بخیل نہ ہو، مغرور و متکبر نہ ہو، نہ کسی سے لڑے نہ جھگڑے، نہ کسی کا حسد کرے، نہ کسی کو دیکھ کر جلے، عافیت میں شاکر، مصیبت میں صابر، ہنس خلق، بردبار، متحمل، متواضع، منکسر مستغنی، نفس پر ضابط، قانع، سیر چشم، متوکل، ثواب عاقبت کا امید وار، یعنی خلاصہ یہ ہے کہ دین دار ہو، میں نہیں سمجھتا کہ دنیا میں اس سے بڑھ کر کسی اور کو بھی خوشی ہو سکتی ہے اگرچہ وہ ہفت اقلیم کا بادشاہ ہی کیوں نہ ہو - ایسا شخص آپ بھی خوش اور اس سے عزیز، قریب دوست،

آشنا بھی خوش ، رضی اللہ عنھم و رضواعنہ۔ دنیا دار آدمی تبھی خوش رہ سکتا ھے کہ جس جس چیز کو اُس کا جی چاھتا جائے فی‌الوقت مہیا و میسر ھوتی چلی جائے مگر کسی کو ابتدائے دنیا سے آج تک یہ بات نصیب ھوئی ھے یا آیندہ تا بقائے دنیا کسی کو اس بات کے نصیب ھونے کی توقع کی جا سکتی ھے ؟ کسی کو بھی نہیں۔ پس معلوم ھوا کہ دنیا میں کامل خوشی تو نہ ھوئی ھے اور نہ ھوسکتی ھے۔ دوسرا طریقہ خوشی کے حاصل کرنے کا یہ ھے کہ طبیعت کو روکا ، خواھشوں کو دبایا ، حاجتوں کو کم کیا جائے اور یہی ھے خلاصہ دین کی تعلیم کا جہاں تک اُس کو اصلاحِ معاش سے تعلق ھے ۔

ابن الوقت۔ ایسے بھی کوئی ھوں گے جن کی دنیا بوجہ دین داری آرام سے گزرتی ھوگی ؟ مجھے تو دین فی حد ذاتہ مصیبت کا ایک پہاڑ دکھائی دیتا ھے ۔ دنیا میں سینکڑوں تو مذھب ھیں اور ھر مذھب میں ایک سے ایک عقیل، ایک سے ایک خدا پرست ، ایک سے ایک نیک ،ایک سے ایک حق پسند ،ایک سے ایک راست‌باز اور پھر اھل مذاھب میں اس بلا کا محاسدہ ھے کہ ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتا ؛ جس کو دیکھو اپنے ھی تئیں بر سر حق جانتا ھے اور تمام دنیا کو گم‌راہ۔ نہیں معلوم آپ نے مذھب کی طرف سے کیوں کر اپنا اطمینان کر لیا ھے ۔ میرا خیال تو یہ ھے کہ ھر شخص تقلیدی مذھب رکھتا ھے ۔ ایک مسلمان اس واسطے مسلمان ھے کہ وہ اتفاق سے مسلمان کے گھر پیدا ھوا ھے ۔

حجۃالاسلام ۔ دین کے لحاظ سے دیکھا جاتا ھے تو ھم سب کی الاماشاءاللہ بڑی تباہ حالت ھے ! ایسا کون سا بندہ بشر ھے جو مبتلائے گناہ نہیں ؛ ھماری ھمت اس طرح کی ضعیف واقع ھوئی ھے

کہ ہم اس دام میں بے پھنسے رہ نہیں سکتے ۔ ہماری مجال نہیں کہ دنیاوی حکومتوں کے آگے ذرا بھی سر اٹھا سکیں مگر خدائے بر حق، قادر مطلق ، شاہنشاہ دو جہاں کی حکومت کے استخفاف کو ہم نے کھیل سمجھ رکھا ہے ۔ ع

کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ

غرض یوں تو ہر فرد بشر سے دن رات میں ہزارہا نالائقیاں سرزد ہوتی ہیں مگر یہ سب سے بڑی نالائقی ہے کہ وہ دین کے پیرائے میں اپنی طبیعت کے پاجی پن کو ظاہر کرے۔ دوسروں کو میں کیا الزام دے سکتا ہوں کہ میں آپ سب سے بدتر نکھٹو ہوں لیکن ان مذہبی مباحثات کو تو میں نہایت ہی حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں ۔ شاید میری رائے غلط ہو ، مجھ کو تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام کشاکش آپس کی ضد اور تعلّی اور سخن پروری اور بے جا تعصب کی وجہ سے ہے ۔ خیر! اول تو شامت نفس سے میں دینیات میں بہت ہی تھوڑا وقت صرف کر سکتا ہوں اور جس قدر کر سکتا ہوں وہ میرے اپنے ہی نفس کے احتساب کو کافی نہیں۔ میں مذہبی مباحثات کو ذہن میں آنے ہی نہیں دیتا ، اگر کبھی ایسا خیال ہوا تو میں یہ کہ کر ٹال دیا کرتا ہوں ع

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

اور یہی مضمون ایک جگہ قران مجید میں بھی ہے: یاایھاالذین آمنوا علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم الی اللہ مرجعکم جمیعا فینبئکم بما کنتم تعملون ۔[1] دوسروں پر حملہ کرنے کی مصیبت سے تو یوں بچیے کہ اپنی کرنی اپنی بھرنی ، وہ جانیں ان کا کام جانے ،

۱- اے ایمان والو اپنی خبر رکھو۔ اگر تم راہ راست پر ہو تو دوسرے کی گم راہی سے تم کو کچھ ضرر نہیں ۔ تم سب کو اللہ کے پاس لوٹ کر آنا ہے ، وہ تم کو آگاہ کر دے گا کہ تمہارے عمل کیسے تھے۔

نہ میں کسی کا محتسب، نہ دین کا ٹھیکہ دار، نہ منصب ہدایت پر مامور۔ مجھ کو کیا پڑی کہ دوسروں کے معاملات میں دخل دیتا پھروں۔ «لاتزر وازرۃ وزر اخری[1]» رہ گئی اپنے معتقدات کی حمایت، سو میرے معتقدات میرے دل کی تسلی کے لیے ہیں، دوسروں کو اُن سے تسلّی نہ ہو، نہ ہو۔ الغرض میری سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ لوگوں میں مذہبی لڑائی کیوں ہوتی ہے اور کیا اُس سے مفاد ہے؟ اگر تم میری صلاح مانو تو علم کلام کی کتاب کو تو بھول کر بھی آنکھ اُٹھا کر مت دیکھنا۔ ایک بڑا نقصان جو طلب گار دین کو اس فن کی کتابوں سے پہنچتا ہے، یہ ہے کہ اُس کی طبیعت دینیات میں متشکّی ہو جاتی ہے۔ جس ترتیب کے ساتھ میں نے تم کو دینیات میں غور کرنے کو بتایا اس کا لحاظ بھی حیرت اختلاف سے بچنے کے لیے مفید ہے۔ جب انسان اس بات کو نصب العین کر لے گا کہ میں ایک فانی اور بے حقیقت مخلوق ہوں اور معلوم نہیں کہ بعد مرگ کیا پیش آئے، میں نہیں سمجھتا کہ ایسا آدمی ان جھگڑوں کی طرف متوجہ ہونے کے لیے اپنی طبیعت کو حاضر پائے۔ بعض باتوں سے تو وہ بہ ایں خیال اعراض کرے گا کہ میں ان سے زیادہ اہم کام میں مصروف ہوں

کیا جانیں ہم زمانے کو حادث ہے یا قدیم
کچھ ہو بلا سے اپنی کہ ہیں فانیوں میں ہم

اور بعض کی نسبت شاید وہ یہ خیال کرے کہ اگر میری سمجھ میں نہیں بھی آتا تو میری ہی فہم کا قصور ہے۔

میں نے مناظرے اور مباحثے کی نظر سے تو کبھی کسی مذہب کی تفتیش وتلاش کی نہیں مگر ہاں یوں ہندو، عیسائی، پارسی، یہودی جو مذاہب ہمارے ملک میں مروّج ہیں، ان کے

۱۔ کسی پر دوسرے کا بوجھ نہیں لادا جاتا۔

معتقدات کا حال معلوم ہے، غایت مافی الباب یہ کہ بالتفصیل نہ سہی، سو جن دلائل سے مجھ کو اس بات کا اذعان ہے کہ خدا ہے، انھیں دلیلوں سے اس کا بھی تیقن ہے کہ کوئی اُس کا شریک نہیں۔ ہندوؤں اور پارسیوں سے تو یوں سستے چھوٹے، رہ گئے عیسائی اور یہودی، اس میں شک نہیں کہ ہیں اہل کتاب، دین بھی ہمارا اُن کا ایک، اختلاف اگر ہے تو شرائع کا ہے مگر وحدانیّت کو انھوں نے بھی ڈگمگا رکھا ہے، پس ہم کو تو اسلام کے سوائے اپنا ٹھکانا کہیں نظر آتا نہیں۔ جس بات نے مجھ کو زیادہ تر مذہب اسلام کا گرویدہ کیا، یہ ہے کہ اسلام میں تصنّع نہیں۔ پیغمبر اسلامؐ نے حد بشریّت سے بڑھ چڑھ کر اپنے لیے کسی تقدّس یا کسی اختیار یا کسی استحقاق کا دعویٰ کیا ہی نہیں۔ آپ پکارے کہتے تھے «انما انا بشر مثلکم و ما ادری مایفعل بی ولا بکم[1]» «لا املک لنفسی نفعا ولا ضرا الا ماشاء اللہ ط ولو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر وما مسنی السوء[2]» پس جب آپ سے لوگوں نے معجزات دکھانے کو کہا تو آپ نے صاف انکار کیا کہ یہ میرے اختیار کی بات نہیں «ویقولون لولا انزل علیہ آیۃ من ربّہ قل انّما الایات عند اللہ۔ وقالوا لن نّومن لک حتّی تفجر لنا من الارض ینبوعاًo اوتکون لک جنّت من نّخیل و عنب فتفجر الانہار خلالہا تفجیراo اوتسقط السّماء کما زعمت علینا کسفا او تاتی باللہ والملئکۃ قبیلاo اویکون لک بیت مّن زخرف اوترقی فی السّماء ولن نوّمن لرقیک حتی تنزل علینا کتاباً نقرؤہ قل سبحان ربّی ہل

۱۔ میں بھی تم ہی جیسا آدمی ہوں اور مجھ کو خبر نہیں میرے اور تمھارے ساتھ کیسا معاملہ کیا جائے گا۔

۲۔ میرا اپنا نفع وضرر میرے اختیار میں نہیں مگر جو خدا چاہے اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو بہت سی بھلائی سمیٹ لیتا اور مجھ کو کوئی گزند نہ پہنچتا۔

الاّبشرارسّولا'o» اکثر لوگوں کو یہی خیال ہے کہ پیغمبر کو معجزات کا دکھانا ضرور ہے تاکہ لوگ اُس کا پیغمبر ہونا تسلیم کریں لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں میری نظر میں معجزات کی کچھ بھی وقعت نہیں، میرے نزدیک پیغمبر آپ ہی سب سے بڑا معجزہ ہے ؎ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔

مثلاً یوسف[۴] علیہ السلام کا وہ مقولہ «معاذ اللہ انہ ربی احسن مثوای[۲]» میرے قلب پر اس قدر اثر کرتا ہے کہ اگر یوسف[۴] میری آنکھوں کے سامنے مردے کو جلا کھڑا کرتے تاہم مجھ کو ان کی خدمت میں ایسی عقیدت نہ ہوتی۔ اسی طرح اسلام کی ساری باتیں ایسی آسانی کے ساتھ سمجھ میں آتی ہیں کہ خود بخود دل اُن کو قبول کر لیتا ہے مثلاً توبہ، ظاہر بات ہے کہ اگر ہم سے کوئی قصور عمداً یا خطاً سر زد ہو جائے سوائے افسوس اور ندامت کے ہم اس کی کچھ تلافی کر ہی نہیں سکتے۔ توبہ کو عیسائیوں[۳] کے کفارے کے ساتھ مقابلہ کر کے دیکھو تو تم کو اس کی خوبی معلوم ہو۔ پھر اسلام میں یہ کتنی بڑی عمدہ بات ہے کہ

۱۔ اور کہتے ہیں اُس پر کوئی نشانی خدا کی طرف سے کیوں نہیں آتری۔ کہ نشانیاں خدا کے پاس ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تجھ پر ہر گز ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ تو زمیں پھاڑ کر ایک چشمہ نکالے یا تیرے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو اور تو اُس میں سے نہریں نکال دے یا جیسا تو کہا کرتا تھا آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے ہم پر گرادے یا خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لا کھڑا کرے یا تیرے پاس سونے کا ایک گھر ہو یا تو آسمان میں چڑھ جائے اور ہم تیرے جادو کو ماننے والے نہیں یہاں تک کہ تو ہم پر ایک کتاب آتارے جس کو ہم پڑھیں۔ کہ اے پیغمبر! سبحان اللہ، نہیں ہوں میں مگر آدمی بھیجا ہوا۔

۲۔ توبہ توبہ وہ میرا آقا ہے، اس نے مجھ کو اچھی طرح رکھا ہے۔ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ جب زلیخا نے حضرت یوسف[۴] سے نالائق بات کی درخواست کی تو حضرت یوسف[۴] نے عزیز مصر کے حقوق کا خیال کر کے انکار کیا۔

۳۔ عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا بندوں کے گناہ معاف نہیں کر سکتا تھا اس لیے اُس نے حضرت عیسیٰ کا جامہ پہن کر پھانسی پائی اور یوں ساری دنیا کے گناہوں کا کفارہ دیا۔

تکلیف مالایطاق نہیں۔ یہود اور عیسائیوں کے احکام عشرہ میں یہ باتیں بھی ہیں کہ کل کے واسطے ذخیرہ مت کرو، اگر تمھارے داھنے گلے پر کوئی تھپڑ کھینچ مارے بایاں گلہ بھی اس کے سامنے کردو کہ لے اور مار، اپنے جانی دشمن کے لیے اسی طرح دعا کرو جس طرح اپنے اکلوتے بیٹے کے حق میں کرتے ہو۔ اس طرح کی ان ہونی باتوں کی جگہ اسلام تعلیم کرتا ہے «کلوا و اشربوا و لاتسرفوا انہ لایحبّ المسرفین o من حرّم زینت اللہ الّتی اخرج لعبادہ والطّیبات من الرّزق ط قل ھی للّذین آمنوا فی الحیوۃ الدّنیا خالصۃً یوم القیامۃ o وجزاء سیّئۃ سیّئۃٌ مثلھا فمن عفا واصلح فاجرہ علی اللہ انہ لایحبّ الظّالمین[1] o» اب تم آپ دل میں انصاف کر لو کہ دونوں طریقوں میں کون سا ممکن التعمیل ہے اور کون ناممکن التعمیل۔

مباحثہ اور مناظرہ تو مجھ کو پسند نہیں جیسا کہ میں نے تم سے بار بار کہا مگر یوں اپنے طور پر میں نے مذھب کے بارے میں برسوں غور کیا ہے اور اب بھی اکثر غور کرتا رھتا ھوں اور جن وجوہ سے میں نے اسلام کو حق سمجھا اور جن دلائل سے میرے دل کو تسلی ھوئی اُن کو میں نے اپنے بچوں کے گوش زد کرنے کی غرض سے ایک کتاب میں جمع کر رکھا ہے، اگر تم دیکھنا چاھو تو میں بہت خوشی سے تم کو دوں گا۔ یہ مباحث دو چار، دس پندرہ ملاقاتوں میں طے ھونے کے نہیں ھیں۔ میں یہ

۱۔ کھاؤ پیو اور فضول خرچی مت کرو، خدا فضول خرچوں کو پسند نہیں کرتا۔ اللہ نے جو زینت کی چیز اپنے بندوں کے لیے پیدا کی، اُس کو اور پاکیزہ روزی کو کس نے حرام کیا؟ اے پیغمبر! لوگوں سے کہ دے کہ جو لوگ دنیا میں ایمان لائیں، یہ چیزیں قیامت کے دن خاص کر انھیں کو ملیں گی۔ برائی کا بدلہ ویسی ھی برائی اور جو معاف کر دے اور آپس میں رفع دفع کرے، اس کا اجر خدا پر ہے، خدا ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

دعویٰ نہیں کرتا کہ تمھاری یا دوسرں کی بھی تشفی کر سکتا ہوں۔ تشفی بدون تائید الٰہی ہو نہیں سکتی «فمن یرداللّٰہ ان یہدیہ یشرح صدرہ للاسلام ومن یرد ان یضلہ یجعل صدرہ ضیقاً حرجاً کا نما یصعد فی السماء[1]» اور میں پھر ایک بار تم سے کہتا ہوں کہ طلب گار دین کو عموماً اور تم کو خصوصاً نہ کسی کتاب کے دیکھنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی سے پوچھنے کی حاجت۔ دنیا میں جدھر کو آنکھ آٹھا کر دیکھو دین کے دفتر کے دفتر کھلے پڑے ہیں بشرطے کہ چشم بصیرت وا ہو۔ تم ہی میں سب کچھ ہے مگر سوجھتا نہیں «و فی انفسکم افلا تبصرون[2]» ایک بات کے کہنے کی اور ضرورت باقی ہے کہ اگر تمھارا نفس دین کی کسی بات سے مطمئن ہو جائے تو مجرّد اس سے کہ تمھارے دل کو اُس بات میں کسی طرح کا خلجان نہیں، نفس کے فریب میں مت آجانا۔ کامل کی شناخت یہ ہے کہ اعمال میں، افعال میں، اقوال میں، اس کا اثر ظاہر ہو۔ دنیا میں کسی ملک، کسی مذہب کا ایک متنفس بھی نہ ہے نہ ہوگا جس کو مرنے کا اذعان نہ ہو مگر کتنے ہیں جن کے برتاؤ سے اس اذعان کا ثبوت ہوتا ہو؟ پکی پکی حویلیاں بن رہی ہیں، باغ نصب ہو رہے ہیں، معاملات میں ڈیوڑھی ڈیوڑھی، دونی دونی عمر طبعی کے وعدے کیے جا رہے ہیں، روز مرہ کے استعمال کی جتنی چیزیں ہیں یہاں تک کہ جوتی میں پائداری پر نظر ہے۔ غرض توقعات کی کچھ حد و غایت نہیں اور منہ سے کہنے کو ــــ

کیا بھروسا ہے زندگانی کا * آدمی بلبلا ہے پانی کا

۱- جس کو خدا ہدایت دینی چاہتا ہے اسلام کے لئے اُس کے سینے کو کھول دیتا ہے اور جس کو گم راہ کرنا چاہتا ہے اُس کے سینے کو تنگ اور رکا ہوا کر دیتا ہے، گویا آسمان میں چڑھ رہا ہے۔

۲- خود تم میں ہماری قدرت کی نشانیاں موجود ہیں تو کیا تم نہیں دیکھتے۔

ہم تو ایسے اذعان کے قائل ہیں نہیں۔ قولاً اقراراً ، عملاً انکار۔ ہاں اذعان ہے ریل کے مسافر کا جس کو ایک خاص مقام پر اترنا ہے۔ اول تو وہ سرے سے اسباب کو ضرورت سے زیادہ کھولتا پھیلاتا ہی نہیں اور جو بہ مجبوری نکالا ہے تو دو دو تین تین اسٹیشن پہلے سے گری پڑی چیز کو جمع کرتا ہے ، شاید اخیر شب ہے اور نیند کے جھونکے پر جھونکے چلے آتے ہیں مگر نہیں سوتا ، ٹکٹ معلوم ہے کہ ہے مگر بہ نظر مزید احتیاط پھر اس کو دیکھ کر سنبھال کر جیب میں رکھتا ہے کہ وقت پر ڈھونڈنا نہ پڑے ، ابھی ریل کی رفتار مدھم نہیں ہوئی اور یہ بیگ ہاتھ میں لیے مسافروں پر سے کود پھاند کھڑکی سے آلگا ، صریحاً دیکھ رہا ہے کہ اس سرے سے کھڑکیاں کھلتی چلی آرہی ہیں لیکن مستعجل ہے اور پکار رہا ہے کہ صاحب ہم بھی اسی اسٹیشن پر اتریں گے۔ کسی ایک غریب مصیبت مند آدمی کی نسبت بھی تم ایسا خیال کر سکتے ہو کہ دفعتاً تو بھلا خیر، اب سے شام تک کی اس کو مہلت دی جائے کہ نماز مغرب کے بعد تم کو مثلاً ضرور امریکہ چلنا ہوگا اور وہاں تمہارے لیے ہر طرح کی آسائش کا سامان مہیا ہے اور وہ وقت پر چل کھڑا ہو۔ بھلا پھر سفر موت تو دوسری ہی طرح کا سفر ہے ، اس کے لیے تو ہم میں سے کوئی بھی تیار نہیں ، نہ آج ، نہ کل، نہ برس بعد ، نہ دس برس بعد۔

ابن الوقت۔ بس وہی رہبانیت! رہبانیت تو آپ کے کلام کا ترجیع بند ہے کہ دو چار باتیں کیں اور پھر

ماسقیان کوئے دل داریم

حجۃ الاسلام۔ میں ڈپٹی کلکٹر سمجھ کر تم سے ملنے نہیں آیا، نہ ڈپٹی کلکٹر سمجھ کر تم سے باتیں کر رہا ہوں ، ساتھ کھیلا

ہوں، ساتھ پڑھا ہوں، عمر میں، رشتے میں، تم سے بڑا ہوں۔ برا نہ مانتنا۔ ارے احمق! اتنا تو سمجھ کہ میں نے ایک بات نہیں کہی جس کا حوالہ قرآن سے نہ دیا ہو اور نہ دیا ہو تو اب دینے کو موجود ہوں اور دین کا یہ حال ہے «خیرالقرون قرنی ثم الّذین یلونہم ثم الّذین یلونہم[1]» اگر قرآن کی تعلیم کا نتیجہ رہبانیت ہوتا تو پیغمبر صاحب علیہ الصّلواۃ و السّلام اور صحابۂ کرام رض اس قدر تھوڑے عرصے میں جس کی نظیر کسی ملک کی تاریخ میں پائی نہیں جاتی ، اسلام کی اتنی بڑی وسیع اور زبردست سلطنت قائم نہ کر سکتے اور اس وقت کے اہل اسلام نہ صرف سلطنت کی وجہ سے اقوام روزگار میں ممتاز تھے بلکہ ان کے زمانے میں جتنے ہنر تھے سب میں اپنے اقران پر سبقت لے گئے تھے ۔ پس اگر تعلیم قرآن کا نتیجہ رہبانیت ہوتا تو بزرگان دین دنیا کو اور دنیا بھی ایسی دنیا ، اس خوبی اور عمدگی اور شائستگی کے ساتھ سنبھال نہ سکتے۔

ابن الوقت۔ صاحب آپ برا مانیے یا بھلا مانیے میری سمجھ میں تو آپ کی دو رخی بات بالکل نہیں آتی ۔ ایک طرف تو آپ دنیا سے نفرت دلاتے ہیں اور دوسری طرف رہبانیت کے نام سے بھنّاتے ہیں ۔ جن کو آپ بزرگان دین کہتے ہیں ، ان کے دنیاوی عروج کی نسبت تو کوئی کلام کر نہیں سکتا ، ان کی ملک گیریاں ، ان کی فتوحات ، ان کے انتظام، ان کے ارادے ، ان کی شجاعتیں ، چار دانگ عالم میں مشہور ہیں ۔ مگر جس طرح کی دین داری آپ مجھ کو تعلیم کرتے ہیں ، کوئی شخص اپنی ارادت سے جو چاہے فرض کر لے مگر تاوقتیکہ اُن کے ظاہر حالات میں اُس کے شواہد نہ ہوں دوسرا آدمی کیوں ماننے لگا ۔

حجۃ الاسلام۔ اُن کے ظاہر حالات ہی میں اُن کی اسی طرح کی

۱۔ سب زمانوں سے بہتر میرا زمانہ، پھر اُن کے بعد، پھر اُن کے بعد۔

دین داری کے شواھد موجود تھے اور به افراط موجود تھے۔ جناب رسالت مآبؐ کے زھد کا حال تو «مشتے نمونه از خروارے» میں تم سے خوشی کے بیان میں که چکا ھوں۔ قریب قریب یہی حال اکثر اصحابؓ کا تھا۔ عقل پر کیا پتھر پڑ گئے! واقعات تاریخی بھی سب بھلا ڈالے، یا زمان طالب العلمی میں تاریخ دانی کا وہ زور و شور تھا که سارا کالج لوھا مانتا تھا۔ ان سے بڑھ کر کوئی کیا زھد کرے گا جنھوں نے پیغمبر کی رفاقت میں وطن چھوڑا، گھر بار چھوڑا، مال و متاع چھوڑا، عزیز واقارب چھوڑے اور پردیس میں پرائی روٹیوں پر اور وہ بھی غیر مقرّر، قناعت اختیار کی۔ ان سے بڑھ کر کوئی کیا زھد کرے گا جو همه وقت پیغمبرؐ کے ساتھ جان دینے کو موجود اور صرف موجود ھی نہیں بلکه خدا کی راہ میں جان کے قربان کر دینے کو فوز عظیم سمجھتے تھے۔ ان سے بڑھ کر کوئی کیا زھد کرے گا، جن پر پیغمبرؐ صاحب نے تجہیز جیش کی ضرورت ظاھر کی اور کسی نے سارا اور کسی نے آدھا مال بے تامّل لا حاضر کیا۔ ان سے بڑھ کر کوئی کیا زھد کرے گا جنھوں نے وقت کے امیرالمومنین کہلا کر اپنے ھاتھوں اینٹیں پاتھیں، پیوند لگے ھوئے کپڑے پہنے، نمود و نمائش کے مواقع پر پیدل چلے، خچروں پر سوار ھوئے۔ اُن سے بڑھ کر کوئی کیا زھد کرے گا جنھوں نے احتساباً اپنی حاجتوں پر دوسروں کی حاجتوں کو مقدّم رکھا، آپ بھوکے رہے دوسروں کو کھلایا، آپ ادھار لیے اور دوسروں کو غنی بنایا۔ کہیں تم تجاھل عارفانه تو نہیں کرتے ورنه سیر[1] کی کتابوں میں اس قسم کی ھزاروں باتیں ضرور تمھاری نظر سے گزری ھوں گی۔

۱- تاریخ

ابن الوقت ۔ اتنا میں بھی سمجھتا ہوں کہ دنیا میں اگر کوئی مذہب اختیار کرنے کے قابل ہے تو وہ اسلام ہے ۔ اب تو آپ خوش ہوئے ؟

حجۃ الاسلام ۔ قل لا تمنوا علی اسلامکم بل اللہ یمن علیکم ان ہدا کم للایمان ان کنتم صادقین[1] ۔

ابن الوقت ۔ خیراب دنیا کی باتیں کیجیے ۔ ہمارے کلکٹر صاحب تک آپ کیوں کر پہنچے ، کیا کیا باتیں ہوئیں ۔

حجۃ الاسلام ۔ ایسی لا یعنی باتیں کرنے کی مجھ کو فرصت نہیں ۔ اب دوسری ملاقات میں ۔

ابن الوقت ۔ مجھ کو آپ سے بہت سی ضروری باتوں میں مشورہ لینا ہے ۔

حجۃ الاسلام ۔ ایک بار کہہ تو دیا 'دوسری ملاقات میں'۔

ابن الوقت ۔ کب ۔

حجۃ الاسلام ۔ دیکھو ان شاء اللہ اسی ہفتے کے اندر ہی اندر، جب موقع ملے ۔

ابن الوقت ۔ بھلا اتنا تو فرمائیے صاحب کلکٹر سے میرے ملنے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ۔

حجۃ الاسلام ۔ ان سے تو ملنے کا نام ہی نہ لینا ۔ یہ بھی خدا جانے کیا اتفاق تھا کہ وہ اتنے بھی رو بہ راہ ہوئے بلکہ میں تو تم کو یہی صلاح دوں گا کہ یہ وضع تم کو کیا کسی کو بھی سازگار نہیں ۔ اس کو قطعاً ترک کرو اور ابھی کچھ اور خمیازہ بھگتنا باقی ہو تو اختیار ہے ۔

۱۔ مجھ پر اپنے اسلام کا احسان مت دھرو بلکہ اللہ تم پر احسان جتاتا ہے کہ تم کو ایمان کی راہ دکھائی اگر تم سچے ہو ۔

فصل بست و ہشتم

ابن الوقت شہر میں پھوپھی کے گھر جا کر حجۃ الاسلام سے تیسری بار ملا اور دونوں میں پہلے پولٹیکل اور پھر مذہبی گفتگو

صاحب کلکٹر کے ساتھ صفائی کا ہونا تھا کہ ابن الوقت کا بازار پھر گرم ہو چلا۔ نوبل صاحب کے بعد سے ابن الوقت، اس کا بنگلہ، اس کی کچہری، اس کے عملے، اس کے ذاتی ملازم سبھی چیزیں گویا کوارنٹین[1] میں تھیں کہ لوگ اُن سے مٹھ بھیڑ کرتے ہوئے ڈرتے تھے یا کام پر مسلّط ہونے کی خبر کے مشہتر ہوتے ہی بعضے تو بے غیرتی کا جامہ پہن پہن اسی شام کو آ دھمکے۔ لیکن ابن الوقت کو ایسا جھکولا نہیں لگا تھا کہ اس قدر جلد بھول جاتا اور حجۃالاسلام کی نصحیت اس کے کانوں میں گونج رہی تھی سو الگ؛ غرض انگریزیت کے ولولے ابن الوقت کے دل سے سلب تو نہیں ہوئے تھے پر ٹھنڈے ضرور پڑ گئے تھے۔ وہ لوگوں سے ملا مگر کچھ لمبے چوڑے تپاک سے نہیں۔ اس پر بھی جن کو ابن الوقت کی دعوتوں کی چاٹیں پڑی ہوئی تھیں بے صلاح دیے باز نہ رہے کہ مسٹر شارپ کو بڑا بھاری ڈنر دیا اور سٹیشن کے تمام انگریزوں کو مدعو کیا جائے۔

حجۃ الاسلام نے ابن الوقت سے ملنے کا وعدہ کیا ہی تھا اور وہ ہفتے کے اندر ہی اندر ملتے، پر ملتے لیکن ابن الوقت کو صبر کہاں تھا! ادھر لوگ اس کو ڈنر کے لیے الگ اُکسا رہے تھے۔ حجۃ الاسلام تو اس طرح کے سیدھے سادے بے تکلّف سے

---

[1] قرنطینہ۔

آدمی تھے کہ اگر ابن الوقت جھوٹوں بھی کہلا بھیجے تو سچّوں دوڑے چلے آئیں مگر اُس کو بلوانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی، کچھ رشتے یا عمر کی بڑائی کی وجہ سے نہیں بلکہ اُن کی باتوں نے اُن کی بڑی وقعت اس کے ذہن میں جما دی تھی۔ آخر تیسرے دن کوئی چار چھ گھڑی رات گئے، کبھی کے پڑے ہوئے ہندوستانی کپڑے یاد آئے، جلدی سے بدل، سوار ہو، جا موجود ہوا۔

تبدیل وضع کے بعد سے یہ اس کا پہلا پھیرا تھا۔ کنبے کے لوگوں کو، رشتہ داروں کو اور خاص کر اُس کی پھوپھی کو جس قدر خوشی ہوئی بیان سے باہر ہے۔ سب نے ریجھ ریجھ کر اس سے باتیں کیں۔ ہر چند ان باتوں کا لکھنا خالی از لطف نہ تھا مگر یہ مذکور ہمارے مطلب سے خارج ہے۔ اُس نے حجۃ الاسلام سے کہا «حضرت لوگوں نے میری جان کھا رکھی ہے کہ صاحب کلکٹر کو ڈنر دو، ڈنر دو»۔

حجۃ الاسلام۔ اس وضع سے اگر تم صاحب کلکٹر سے ملنا چاہو تو چلو میں اب ملوا لاؤں مگر مجھ سے انھوں نے کھل کر کہہ دیا ہے کہ میں کسی ہندوستانی کو انگریزی لباس پہنے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا۔ تم نا حق کیوں اُن کے سر ہوتے ہو۔

ابن الوقت۔ پھر صفائی کیا خاک ہوئی؟

حجۃ الاسلام۔ نہیں ہوئی نہ سہی، جو تم سے بن پڑے سو کرو۔ تم بھی عجیب طرح کے نا شکر آدمی ہو۔ تمھارا کام تم کو پھر ملا، صاحب کلکٹر نے سچ پوچھو تو ایک طرح پر معذرت کی، کیوں کہ غلطی کا اقرار کرنا بھی معذرت ہے۔ لوگوں کی نظر میں جو تمھاری بے وقری ہو رہی تھی بالکل ڈُھل گئی، جہاں تک تم کو صاحب کلکٹر کے ساتھ سرکاری تعلق ہے، بس پوری پوری صفائی ہو گئی۔ رہ گئی یہ بات کہ وہ تمھاری انگریزی وضع

کو نا پسند کرتے ہیں، یہ اُن کا ذاتی خیال ہے اور انھیں کا نہیں بلکہ تمام انگریزوں کا۔ کسی کی آنکھ میں مروّت زیادہ ہوئی اُس نے منہ سے نہ کہا مگر دل میں وہ بھی ضرور برا مانتا ہو گا۔

ابن الوقت ـ میں نہیں سمجھتا کہ صاحب کلکٹر یا کسی یورپین کو اگرچہ وہ وایسرائے ہی کیوں نہ ہو، ہمارے لباس اور طرز تمدّن میں دخل دینے کا انصافاً کیا استحقاق ہے؟ اور آج کو تو لباس ہے کل کو رعایا کے مذہب میں مداخلت شروع کریں گے۔ یہ بالکل برٹش گورنمنٹ کے اصول کے خلاف ہے اور دیکھیے گا کہ آخر کار شارپ صاحب اس معاملے مین بڑی زک اٹھائیں گے۔

حجۃ الاسلام ـ اگر انگریزوں کو اس ملک پر حکم رانی کا استحقاق ہے تو ضرور اس بات کا بھی استحقاق ہے کہ جو چیزیں ضعف حکومت کی طرف منجر ہوں، اُن کا انسداد کریں اور تمھارا طرز لباس اور طرز تمدن ان چیزوں میں ہے جن سے ضعف کا اندیشہ ہے۔ کوئی ہندوستانی جو اپنی مانوس، قدیمی، قومی وضع چھوڑ کر تمھاری طرح انگریزی وضع اختیار کرے گا، اس کی غرض سوائے اس کے اور کیا ہو گی کہ وہ حکّام وقت کے ساتھ برابری کا دعوے رکھتا ہے اور حاکم ومحکوم میں مساوات کا ہونا ضعف حکومت نہیں تو کیا ہے؟

ابن الوقت ـ تو آپ کے نزدیک رعایا کی آزادی جس پر برٹش گورنمنٹ کو بڑا فخر اور ناز ہے، صرف دھوکا ہی دھوکا ہے۔

حجۃالاسلام ـ رعایا کی آزادی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انگریز حکومت سے دست کش ہو جائیں اور نہ کوئی معقول پسند آدمی انگریزوں سے اس طرح کی توقع رکھ سکتا ہے۔

ابن الوقت ۔ یہ آپ اُن انگریزوں کے خیالات بیان کر رہے ہیں جو ہندوستان میں برسر حکومت ہیں مگر ولایت والوں کا یہ حال نہیں ہے ؛ وہ ہندوستان کی اور انگلستان کی رعایا میں سرمو فرق نہیں کرتے ۔ آپ شاید یہ سمجھتے ہوں گے کہ یہیں کے انگریز جو چاہتے ہیں سو کرتے ہیں ، وہ زمانہ گیا ۔ شارپ صاحب کیا میری ایک متنفس کی وضع کے پیچھے پڑے ہیں، ابھی تو اُن کو بہت کچھ خلاف مزاج دیکھنا اور سننا ہوگا ۔ وہ وقت قریب آ لگا ہے کہ اسی ملک میں سول سروس کا امتحان ہوا کرے گا ، کسی ملکی خدمت کے لیے انگریزوں کی تخصیص باقی نہ رہے گی جیسی کہ اب ہے ، وایسرائے کی کونسل میں برابر کے ہندوستانی ہوں گے اور کوئی قانون بدون ان کے صلاح و مشورے کے جاری نہ ہوسکے گا ۔ غرض انتظام ملک میں ہندوستانی ویسے ہی دخیل ہوں گے جیسے انگلستان میں وہاں کی رعایا اور جب بادشاہ ایک ہے ، کوئی سبب معلوم نہیں ہوتا کہ دونوں ملکوں کی رعیّت کے ساتھ ایک طرح کا برتاؤ نہ کیا جائے ۔

حجۃالاسلام ۔ اللہ اللہ! اس خبط کا کیا ٹھکانا ہے! کہیں تم نے متوالی کودوں تو نہیں کھالی «ایاز قدر خود بشناس» انگلستان کی رعایا کی سی قابلیت بہم پہنچائی ہوتی، ملکہ پر اپنا اعتبار ثابت کیا ہوتا تو ایسی بلند پروازیاں تم کو پھبتیں بھی «حلوا خوردن را روئے باید» نالیاقتی کا تو یہ حال ہے کہ نہ ہمت ہے، نہ جرأت ہے، نہ اتفاق ہے، نہ تہذیب ہے، نہ شائستگی ہے، نہ سچائی ہے ، نہ سچائی کی تلاش ہے ، نہ معلومات ہے ، نہ معلومات بہم پہنچانے کا شوق ہے ، نہ ہنر ہے ، نہ تجارت ہے ، نہ دولت ہے ، نہ ایجاد ہے ، نہ صناعت ہے ۔ غرض

صلاحیت تو اگر سچ پوچھو ، خانہ داری کی بھی نہیں اور حوصلے دیکھو تو ملک گیری کے اور ھندستانیوں پر کیا موقوف ھے میں تو سمجھتا ھوں تمام ایشیا کی آب و ھوا میں کچھ اس طرح کی رداءت آگئی ھے کہ اس سر زمین میں کوئی شخص جس کو ضابط اور منتظم سمجھا جائے ، پیدا ھوتا ھی نہیں ۔ بلکہ میں جب حج سے واپس آکر بمبئی میں اترا اور یہاں کے غدر کے تفصیلی حالات سنے تو بے ساختہ میرے منہ سے نکلا کہ ناحق انگریزوں نے اتنی زحمت اٹھائی ، جیسے لوگوں نے بغاوت کی تھی ، زیادہ نہیں تو ایک ھی ضلع تھوڑے دنوں کے لیے بالکل چھوڑ بیٹھے ھوتے کہ ھماری عملداری سے نا خوش ھو تو خود کرکے دکھاؤ۔ یقین ھے کہ ایک برس بھی پورا گزرنے نہ پاتا کہ لوگ بدعملی سے عاجز آکر بہ منت انگریزوں کو منا کرلے جاتے اور پھر کبھی بھول کر بغاوت کا نام نہ لیتے ۔

میں خیال کرتا ھوں تو انگریزی عملداری تمھاری ھی نہیں بلکہ ھم لوگوں کی بھی شرط زندگی ھوگئی ھے ۔ چاقو ، مقراض سوئی ، تاگا ، دیا سلائی ، انواع واقسام کے کپڑے، غرض ضرورت اور آسائش کی اکثر چیزیں انگریزی ھی انگریزی دکھائی دیتی ھیں ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انگریزوں سے محض بے تعلقی ھوجائے تو ھمارا کیا حال ھو ۔ بھلا خیر فرض کیا کہ خدا کے فضل سے گورنری تک کے لیے بھی بہت سے بنگالی یا دوسرے انگریزی خواں ملیں گے بلکہ دور کیوں جائیں تم ھی ماشا اللہ کس بات میں کم ھو مگر یہ تو فرماؤ ضرورت کی چیزوں کا بنانے ، بہم پہنچانے والا بھی کوئی ھے؟ انگریزی تعلیم کے فیضان سے گورنر ، کونسلر ، لفٹیننٹ گورنر ، بورڈ کے ممبر ، کمشنر ، کلکٹر ، جسٹس ، مجسٹریٹ ، اس

قسم کے لوگ تو ہمارے بنگالے میں بہتیرے نکل پڑے اور امن کے پندرہ بیس برس گزرنے دو یہاں بھی بہتیرے نکل پڑیں گے مگر کوئی ایسا بھی ہوا کہ انگریزوں کی طرح کلیں نکالتا یا زیادہ نہ سہی تو ان ہی کے کیل پرزوں کو جا بٹھا کر اُن سے کام لیتا ۔ غیرت ہو تو چلّو بھر پانی لے کر ڈوب مریں کہ ہمارے ملک کی پیداوار ولایت جائے اور وہاں سے بن سنور کر پھر آئے اور ہمارے ہی ہاتھوں چوگنے چھگنے داموں پر بکے ۔

ہندوستان کا خطّہ معدنیات، نباتات، حیوانات ، غرض جملہ اعتبارات سے تمام روئے زمین کا لب لباب ہے مگر ہم کو ان چیزوں سے فائدہ اٹھانے کا سلیقہ نہیں تو ہماری طرف سے ہو تو بلا سے اور نہ ہو تو بلا سے ۔ سب کچھ کھو کھوا کر معاش کے دو ذریعے رہ گئے تھے، کاشتکاری اور تجارت ۔ سو کاشتکاری کی برکتیں روز بہ روز سلب ہوتی چلی جاتی ہیں ، زمین کو مہلت تو ملتی نہیں ، اُس کی قوت گئی گھٹ ۔ ہم کو اس کا بھید معلوم نہیں کہ زمین میں سے کیا چیز نکل گئی ہے اور کیوں کر اُس کی تلافی کی جاتی ہے ۔ پس اگلے وقتوں کے سے اللّے تللّے کے پیداوار ہوں تو کہاں سے ہوں ؟

تمھاری دلّی ہی کے سواد میں رائے پتھورا کا اب سے دو سوا دو ہزار برس پہلے کا بنا ہوا محل کھڑا ہے، پتھروں پر ان وقتوں کے ہل ، ان وقتوں کے چھکڑے بنے ہیں ۔ مدّت ہوئی جب میں نے اُس کو اول بار دیکھا تو خیال آیا اللہ اکبر! زمانے میں اتنے انقلاب ہوئے ، کتنی عملداریاں بدل گئیں ، قومیں بدل گئیں ، غرض دنیا بدل گئی اور نہ بدلے تو ہل اور چھکڑے کہ

جیسے تب تھے بجنسہ ویسے ہی اب بھی موجود ہیں۔ کاشتکاری ایسا تو ضروری پیشہ کہ سب کا مدار رزق اور ہمہ وقت لاکھوں آدمی اس میں مصروف؛ یہ خدا کا حکم نہیں تو کیا ہے کہ کسی کا ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوتا کہ لاؤ اس میں کوئی کام کی بات نکالیں۔

ایک کاشتکار ولایت کے ہیں کہ مرضی کے مطابق نہ آب و ہوا ہے، نہ موسم ہے، نہ زمین ہے مگر کاشتکاری میں اس قدر ترقی کی ہے کہ ہمارے ہاں رو کر، جھینک کر بیگھے میں پیدا ہو دس سیر، تو اُن کے یہاں پیدا ہو من بھر۔ بات تھی بکار آمد ایسے پیچھے لپٹے، ایسے پیچھے لپٹے کہ آخر کار سوچتے سوچتے گویا پیداوار کو اپنے بس میں کر لیا۔ سینکڑوں تو کلیں بنا ڈالیں کہ کھیتی کے جتنے کام ہیں انھیں کلوں سے پڑے ہو رہے ہیں؛ وقت بچا، ھاتھ پاؤں کی محنت بچی اور کام دیکھو تو دو گنا چوگنا بھی نہیں ہزار گنا اور اس افراط پر بہتر سے بہتر دوسری باتوں کا کیا مذکور ہے پیداوار کی ذات اور جانوروں کی نسلیں تک پلٹ گئیں۔

معاش کا دوسرا ذریعہ تجارت ہے سو اُس کا واقعی حال یہ ہے کہ گودا تو اہل یورپ چٹ کرتے ہیں، رہ گئیں خالی ھڈیاں، اُن کو چاہے میمن اور بوھرے پڑے چچوڑا کریں یا پنجابی یا مارواڑی، یا میں چاھوں تو میں اور تم چاھو تو تم؛ خلاصہ یہ ہے کہ عقل معاش کے اعتبار سے اہل یورپ کے مقابلے میں ہمارے ملک کے لوگ ایسے ہی کودن اور کندۂ نا تراش ہیں جیسے ہمارے مقابلے میں ایک بھیل یا کوئی اور جنگلی وحشی آدمی۔ ہم میں اور اہل انگلستان میں

بڑی وجہ فارق تو یہ ہے ۔ اس کے علاوہ ہم انگریزوں کے ہم قوم نہیں ، ہم مذہب نہیں ، ہم وطن نہیں ، انھوں نے ہم کو تلوار کے زور سے مطیع کیا ہے ، جیسے کبھی ہمارے بزرگوں نے ہندوؤں پر اپنی سلطنت بٹھائی تھی ۔ انگریز ہماری طرف سے کبھی مطمئن ہو نہیں سکتے اور احتیاط بھی اسی کی مقتضی ہے ۔ «الحزم سوءالظّن[1]» تم کو تو کسی زمانے میں تاریخ دانی کا بڑا دعویٰ تھا ، خیال کرو کہ ہم لوگوں نے ہندوؤں پر کس قدر اعتبار کیا تھا ؛ کہیں سینکڑوں برس کی سلطنت کے بعد وہ بھی اس وقت کہ بد قسمتی جو سر پر سوار ہوئی تو ہمارے بزرگ یہیں رہ پڑے اور ہندوؤں سے اختلاط کر کے انھیں کی طرح آرام طلب اور کاہل اور مبتلائے اوہام ہو گئے اور آخر کار سلطنت کھو بیٹھے ۔ غرض کہیں سینکڑوں برس کی سلطنت کے بعد ہندوؤں کو یہ بات نصیب ہوئی تھی کہ مسلمان بادشاہوں کے دربار تک پہنچے اور اعتبار کی خدمتوں پر مامور ہونے لگے تھے ۔ انگریزوں کو اس ملک میں سلطنت کرتے ہوئے ابھی کَے دن ہوئے اور جو کچھ ذرا ظہور اعتبار پیدا ہو چلا تھا ، وہ اس کم بخت ۵۷ء کے غدر نے ملیامیٹ کر دیا ۔ اب کم سے کم سو برس اطمینان کے اَور گزریں ، تب بات سو بات ؛ لیکن ایک بغاوت تو خدا خدا کر کے فرو ہوئی ، تم نے ابھی سے دوسری بغاوت کی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی ۔

ابن الوقت- یک نہ شد دو شد! گورنمنٹ سے اپنے حقوق کا مطالبہ بھی آپ کے نزدیک داخل بغاوت ہے ۔ بس غنیمت ہوا کہ میری طرح آپ بغاوت کے محکمے کے افسر نہیں ہوئے ۔

۱- احتیاط نام ہے بدگمانی کا ۔

حجۃالاسلام ـ قوم مفتوح کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں ؟

ابن الوقت ـ حقوق کیوں نہیں ہوتے ، یہ بات دوسری ہے کہ کوئی وحشی اور ظالم گورنمنٹ اُن کو تسلیم نہ کرے ، لیکن برٹش گورنمنٹ تو بڑی مہذب اور عادل گورنمنٹ ہے اس سے ہر ایک طرح کا دعویٰ ہے ـ

حجۃالاسلام ـ اچھا اگر دعویٰ ہے تو اس کا فیصلہ کون کرے گا ؟

ابن الوقت ـ وہی گورنمنٹ اور اُسی کے انصاف پر تو ساری لڑائی ہے ـ

حجۃالاسلام ـ بس بس یہی تو میں کہتا ہوں کہ گورنمنٹ کے انصاف پر اعتماد کرتے ہو اور اُس کو عادل مانتے ہو تو اُس پر پورا پورا اعتماد کرو ـ عادل گورنمنٹ رعایا کی حاجتوں اور ضرورتوں سے غافل ہو نہیں سکتی ـ گورنمنٹ کے تمام عہدہ دار گورنر جنرل سے لے کر ایک اسسٹنٹ تک علیٰ قدر مراتب، سب رعایا کی خوشنودی ، رعایا کی آسائش کے فکر میں لگے ہیں ـ

ابن الوقت ـ تو اگر ہم نے اپنی ضرورتوں کو ظاہر کر دیا تو کیا غضب ہو گیا ؟ یہ من وجہ سرکار کی اعانت ہوئی یا بغاوت ؟

حجۃالاسلام ـ ظاہر کر دیا ، ظاہر کر دیا ! ذرا بنگالے کے دیسی اخباروں کو دیکھو تو معلوم ہو کہ رعیّت ہونے کی حیثیت سے اپنی ضرورتوں کو گورنمنٹ پر ظاہر کر رہے ہیں یا بیہودگی اور بے تمیزی کے ساتھ گورنمنٹ سے بھٹیاریوں کی سی لڑائی لڑتے ہیں ـ سنو صاحب ! بات صاف صاف تو یہ ہے کہ رعایائے انگلستان کے سے

حقوق چاهو تو یه طلب محال ہے؛ نہ اُن کی طرح کی ہم رعایا ہیں اور نہ ویسے حقوق ہم کو مل سکتے ہیں۔ اول تو ہم کو کسی حق کی طلب گاری کی ضرورت نہیں؛ طلب گاری تو ہم اس صورت میں کریں کہ گورنمنٹ کو غافل اور بے انصاف سمجھیں اور خیر «اهل الغرض مجنون» ایسی ہی بے صبری ہے تو بیٹا بن کر سب کوئی کھاتا ہے، باپ بن کر کسی نے نہیں کھایا۔ یہ سچ ہے کہ حکّام انگریزی خود گورنمنٹ نہیں ہیں بلکہ گورنمنٹ کے ملازم ہیں مگر گورنمنٹ انھیں کی آنکھوں سے دیکھتی ہے اور اُنھیں کے کانوں سے سنتی ہے، اُن کے دلوں میں ہماری طرف سے کسی طرح کے محاسدے اور سوء مظنّہ کا پیدا ہونا ہمارے حق میں نہایت مضر ہے۔ لوگ فی زعمہم ملک کے مفاد میں کوشش کرتے ہیں اور میرے نزدیک چلتی گاڑی میں روڑے اٹکا رہے ہیں ع

بن مانگے موتی ملیں اور مانگے ملے نہ بھیک

میں جدھر خیال دوڑاتا ہوں تقدیر سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔ ہم میں سے بعض آدمی جو زمانۂ حال کی ضرورتوں کے مطابق تعلیم پا کر کچھ لیاقت پیدا کرتے ہیں «و قلیل ما ہم[1]» ان کی مت یوں ماری جاتی ہے کہ مدرسے سے نکلے اور ان کو نوکری کی سوجھی۔ نوکریوں کا حال یہ ہے کہ «یک انار و صد بیمار» جس کو نوکری نہ ملی وہی گورنمنٹ سے ناراض، منہ پھلائے ہوئے روٹھا ہوا بڑبڑاتا پھرتا ہے اور ایک عذاب ہے اپنے حق میں، سوسائٹی کے حق میں، اور گورنمنٹ کے حق میں۔ ان ہی کو اگر خدا توفیق دے اور تعلیم سے فراغ حاصل کرنے کے بعد معاش کے لیے گورنمنٹ کے آگے ہاتھ نہ پھیلائیں، اُمیدوارانہ دھکے نہ کھائیں اور نوکری کے علاوہ دوسرے ذریعوں سے متوکّلین علی اللہ معاش کی کوشش

۱۔ ایسے لوگ تھوڑے ہیں۔

کریں تو معاش کے لیے کتنے تو نئے ذریعے پیدا ہو جائیں اور جو ذریعے بالفعل مروج ہیں، ان کی لیاقتوں کے انضمام سے ان میں بہت کچھ رونق ہو۔ باتیں جتنی چاہو بناؤ، جس کے جی میں آئے رفارمر بن لے، قومی خیرخواہی کا مدعی ہو، ملکی ہمدردی کا حیلہ کرے، اصل مطلب ہے نوکری اور فرض کیا کہ سرکار نے اس غل شور کے فرو کرنے کے لیے نوکری کو عام بھی کر دیا «دھن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ» مگر اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہی نہ کہ ہزار، دو ہزار یا مثلاً دس ہزار آدمیوں کی روٹی کا سہارا نکل آیا، لیکن کیا اتنی بات سے ملک میں فلاح ہوتی پڑی ہے۔ استغفراللہ، اونٹ کے منہ میں زیرا!

اگر فی الواقع تمہارے دل میں قوم کی سچی خیر خواہی ہے تو سرکار کا کیا پیچھا لیا ہے قوم ہی کو کیوں نہیں درست کرتے۔ یورپ میں جو آج تمام روئے زمین کی دولت پھٹ پڑی ہے کہ طوفان نوح کی طرح اوپر سے بھی برس رہی ہے اور زمین سے بھی ابل رہی ہے، نوکری تو نوکری سلطنت کو بھی تو اس میں دخل نہیں۔ ماشاءاللہ چشم بد دور! ایسے ایسے ہزاروں سوداگر ہیں جو تموّل کے اعتبار سے ایسی ویسی سلطنتوں کو بھی کچھ مال نہیں سمجھتے۔ خیال کرنے کی بات ہے مثلاً یہی ایک ہمارے ملک کی ریل ہے کہ روئے زمین پر کوئی سلطنت ایسی نہیں دکھائی دیتی جو اتنے بڑے مصارف کی متحمّل ہو سکے اور یہ انگلستان کی رعایا کا ادنیٰ سا کام ہے۔

پس اگر حقیقت میں ملک کی بہبود مد نظر ہے تو اس کا یہ رستہ نہیں ہے جو تم نے یا اس زمانے کے تعلیم یافتہ لوگوں نے اختیار کیا ہے۔ «ایں رہ کہ تو مے روی بہ ترکستان است» اس کا رستہ اگر ہے تو میرے نزدیک یہی ہے کہ بھلے قوم کے

خیالات کی اصلاح کرو۔ یہ بات کسی طرح اُن کے ذہن میں بیٹھ جانی چاہیے کہ ہماری سر زمین سونے کی سرزمین ہے مگر ہم میں سے کسی کو کیمیا کا وہ لٹکا[۱] معلوم نہیں جس سے مٹی کو سونا بنایا جاتا ہے؛ وہ لٹکا خدا نے اہل یورپ کو بتا دیا ہے، آؤ ہم بھی اُن سے سیکھیں اور ہمالیہ اور بندھیا چل اور اَرولی پربت اور گھاٹ جتنے پہاڑ ہیں سب کو سونے کا بنالیں؛ ہم بھی اہل یورپ کی طرح کے مخلوق ہیں، جن تدبیروں سے اُنھوں نے اپنی حالت کو درست کر لیا ہے انھیں کی دیکھا دیکھی، ویسی ہی تدبیریں عمل میں لا کر، ہم بھی کرارے ہو جائیں؛ کیوں گورنمنٹ کے دست نگر ہوں؟ کس لیے سرکار کی خوشامد کریں؟ کاھے کو حکّام پاس حاجت لے جائیں؟ کرنے پر آئیں تو ہم بھی سب کچھ کرسکتے ہیں، اہل یورپ خدا کی رحمتوں اور زمین کی برکتوں کے ٹھیکے دار نہیں۔

مگر یوں کہو کہ ہم سے کچھ ہو نہیں سکتا۔ ہاں! گورنمنٹ میں ہزاروں کیڑے ڈالنے کو موجود۔ وہ تو گورنمنٹ ہی کچھ ایسی متحمّل مزاج مل گئی ہے کہ جلی کٹی ایک کان سے سنی اور دوسرے کان سے نکال دی، جیسے ایک پہاڑ کہ آندھیاں چل رہی ہیں اور وہ جس شان سے کھڑا تھا، اُسی شان سے کھڑا ہے۔ ۱۸۵۷ء کا غدر کیا کچھ ھلکی بات تھی؟ مگر بڑے لوگوں کے بڑے ظرف! پہلے تو بہ تقاضائے سیاست باغیوں کا خوب ہی سر کچلا اور جب دیکھا کہ بغاوت مستاصل ہوچکی، امن عام کی منادی پھیردی۔ اے جزاک اللہ ؎

این کار ازتو آید و مرداں چنیں کنند
بر عفو و انتقام تو صد آفریں کنند

۱۔ نسخہ، ترکیب۔

تعلیم ، ڈاک ، ریل ، تار ، قاعدے، قانون ، پولیس ، ایک چیز ہو تو اُس کا نام بھی لیا جائے ، میں تو جس جس پہلو سے دیکھتا ہوں انگریزی عمل داری رحمت الٰہی معلوم ہوتی ہے اور جب سے فارس اور روم کے انتظام کے نمونے دیکھ کر آیا ہوں، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ انگریزی عمل داری کو دنیا کی بہشت سمجھتا ہوں ۔ روم اور فارس کی عمل داری تو خیر دور ہے ، اسی ہندوستان میں کسی مسلمان نواب یا ہندو راجا کی عمل داری میں جا کر رہو تو قدر عافیت معلوم ہو اور پھر بھی ان ریاستوں میں انگریزوں کی نگرانی اور سر پرستی کی وجہ سے بڑا امن ہے ۔

میں یہ نہیں کہتا کہ انگریزی انتظام میں نقص نہیں ۔ ہیں اور ہونے چاہییں کیوں کہ انگریز بھی بشر ہیں اور ع

کہ ہیچ نفس بشر خالی از خطا نہ بود

پھر سلطنت کے انتظام اور سلطنت بھی ہندوستان کی سلطنت ، بڑے پیچیدہ اور نازک کام ہیں ۔ ملک کی وسعت کو دیکھو، پھر اس بات پر بھی نظر کرو کہ کیسے کیسے مختلف الطبائع ، مختلف العقائد ، مختلف الحالات لوگ اس ملک میں بستے ہیں اور اس پر اجنبی محض لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنا ہے؛ ایسی صورت میں انتظام میں نقص کیا نقصانات کا ہونا کیا کچھ تعجب کی بات ہے؟ مگر میں دیکھتا ہوں تو حکّام وقت کی نیت بہ خیر ہے، ہمہ تن اصلاح حال رعایا میں مصروف ہیں ۔ ہم جو چلتے ہوئے بیل کے آر ماریں تو اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دولتّی کھانے کو جی چاہا ہے ۔

ابن الوقت ۔ آپ نے تو میرے سارے منصوبے ہی غلط کر دیے ۔

حجۃ الاسلام ۔ میں نے غلط کر دیے یا وہ تھے ہی غلط ۔ میں خوب جانتا ہوں کہ نیّت تمھاری بھی خدا نہ خواستہ کچھ بری

نہ تھی۔ ہم نے خیال کیا اور ٹھیک خیال کیا اور جس کو خدا نے ذری سی بھی عقل دی ہے خیال کر سکتا ہے کہ انگریزی عمل داری میں ہم مسلمانوں کے ساتھ ہر چند کسی خاص طرح کی رعایت نہیں کی جاتی (یہ بات دوسری ہے کہ ہماری حالت خاص رعایت کی مستحق ہے یا نہیں) مگر سرکار ہمارے ساتھ کسی طرح کی ضد اور مخالفت بھی تو نہیں کرتی، جو حال اور رعایا کا وہ ہمارا ، مگر مسلمانوں میں خستہ حالی ، مفلسی اور نکبت یوماً فیوماً بڑھتی چلی جاتی ہے ۔ پھر ہم نے خیال کیا اور ٹھیک خیال کیا کہ مسلمان اکثر بلکہ قریب کل نوکری پیشہ ہیں ؛ کچھ آج سے نہیں بلکہ جب گھر کی سلطنت تھی ، تب بھی اُن کا یہی حال تھا ۔ اب نوکری سے بھی اُن کو دوسری قوموں نے گویا کہ بے دخل کر دیا ، الّا ماشا اللہ ۔ ہم نے سبب کی تفتیش کی اور سمجھا اور ٹھیک سمجھا کہ نوکریوں میں سرکار انگریزی دانی کی قید لگاتی چلی جاتی ہے اور اگرچہ مسلمانوں کو انگریزوں سے مذھباً مغایریت نہیں ہونی چاھیے کیوں کہ انگریز بھی اہل کتاب ہیں اور اُن کے ساتھ مناکحت اور مواکلت کی صاف اجازت قرآن میں موجود ہے «و طعام الّذین اوتوا الکتاب حلّ لکم وطعامکم حلّ لھم والمحصنات من المومنات والمحصنات من الّذین اوتوا الکتاب من قبلکم اذا آتیتموھن اجورھنّ محصنین غیر مسافحین ولا متّخذی اخدان[1]» لیکن ازبس کہ انگریز اجنبی محض ہیں اور ان کے ساتھ ہند کے مسلمانوں کو کبھی اختلاط نہیں رہا اور پشتہا پشت سے ھندوؤں میں رہ کر وھمی سے بھی ہو گئے ہیں،

۱۔ اہل کتاب کا کھانا تمھارے لیے حلال اور تمھارا اُن کے لیے ، اسی طرح مسلمان عورتیں اور اہل کتاب کی عورتیں جب تم ان کے مہر دو اور تم کو خانہ داری منظور ہو نہ آشنائی اور عورتوں کے ساتھ یاری جوڑنی نہیں ۔

غرض کچھ اجنبیت اور کچھ واھمہ ، لگے انگریزی لباس ، انگریزی طرز تمدّن یعنی انگریزوں کی تمام چیزوں سے حتّیٰ کہ زبان انگریزی سے بھی پرھیز کرنے، معاش کے لیے وھی ایک نوکری کا دروازہ تھا ، سو تیغہ ھوکر اس میں ایک ذرا سا موکھا رہ گیا ۔

یہاں تک مجھ کو تمھارے ساتھ بالکل اتفاق ھے ، اس کے بعد کی تمھاری ساری کارروائی غلط ھے ۔ اول سرے تو تم نے یہی غلط سمجھا کہ سرکاری نوکریوں سے مسلمانوں میں خوش حالی آ جائے گی ؛ اول تو سرکار کے انتظام ایسی جزرسی اور کفایت شعاری کے ساتھ ھیں کہ جہاں ایک روپے کا خرچ ھے ، سرکار وھاں آٹھ ھی آنے میں کام نکالنا چاھتی ھے، وہ بھی بڑے مضایقے کے ساتھ ۔ اس کا ضروری نتیجہ ھے نوکریاں کم ، تنخواھیں تھوڑی اور اس پر ایک دنیا ھے کہ ستّو باندھ کر نوکریوں کے پیچھے پڑی ھے ۔ بنیے، بقال ، ٹھٹیرے ، کسیرے ، کنجڑے ، بھٹیارے ، انگریزوں کے کل شاگرد پیشہ یہاں تک کہ سائیس ، گراسکٹ جن کی ھفتاد پشت میں کبھی کوئی اھل قلم ھوا ھی نہیں ، نوکری کی دھن میں سب کے بچے مدرسوں میں پڑھ رھے ھیں، پس نوکریوں سے کیا فلاح ھونی ھے؟ پھر دوسری غلطی تم سے یہ ھوئی کہ مسلمانوں اور انگریزوں میں اختلاط پیدا کرنے کے لیے تم نے انگریزی وضع اختیار کی اور تمھاری دیکھا دیکھی اور بہتیروں نے، اور تمھاری غرض بھی یہی تھی ۔ سمجھے کچھ اور ھو گیا کچھ! ھندوستانیوں میں جیسی کچھ تمھاری رسوائی ھوئی سو ھوئی، بڑی مشکل یہ پیش آئی کہ انگریز رھے سہے ھتّے سے اکھڑ گئے ، گئے تھے نماز معاف کروانے اُلٹے روزے گلے پڑے ۔ «ازین سو راندہ وزاں سو درماندہ» یہ تو چند دنیاوی قباحتیں ھیں جو تمھاری سوءِ تدبیر پر متفرّع ھوئیں ۔ رھا دین، اس کا تم نے اور

تمھارے اتباع نے مل کر ایسا استخفاف کیا کہ باریش بابا ھم بازی کی بھی کچھ حقیقت باقی نہ رھی؛ ایک ایک لونڈا جس کو دین سے مس نہیں، مناسبت نہیں، دین کی اس کے ذھن میں قدر نہیں، وقعت نہیں، دین کی باتوں میں غور کرنے کی اس کی عمر نہیں، حالت نہیں، دین کی اس کو طلب نہیں، تلاش نہیں، ناواقف، بے خبر، برخود غلط، چلا اسلام کا مجدّد اور رفارمر بننے اور لگا اصول میں رائے زنی کرنے۔ امور دین میں مساھلت تو سبھی سے ھوتی ہے لیکن جو دین کا ادب رکھتے ھیں اپنے مساھلے پر نادم اور قصور کے معترف ھوتے ھیں؎

بندہ ھماں بہ کہ زتقصیر خویش عذر بدر گاہ خدا آورد
ورنـــہ سزاوار خداوندیش کس نہ تواند کہ بجا آورد

لیکن اب اس زمانے میں لوگوں کے خیالات دین کی طرف سے کچھ ایسے برگشتہ ھوئے ھیں کہ دینیات میں مساھلہ کرتے ھیں ھیکڑی کے ساتھ، چوری اور سرزوری اور آپ کرتے ھیں سو کرتے ھیں، قومی خیر خواہ اور رفارمر بن کر دوسروں کی باٹ مارتے ھیں سو الگ اور اتنا نہیں سمجھتے کہ جب قوم کا مذھب نہ رھا، لباس نہ رھا، طرز تمدّن نہ رھا، علم نہ رھا، زبان نہ رھی، تو امتیاز قومی بھی گیا گزرا ھوا؛ پھر کیسے رفارم اور کس کی خیر خواھی؟ اگر ھم ایک گھر کی رفارم کرنا چاھیں تو اس کے یہ معنے نہیں ھیں کہ اس کو جڑ بنیاد سے کھود کر پھینک دیں اور از سر نو دوسرا مکان بنا کھڑا کریں۔ اسی طرح مسلمانوں کی رفارم کو تو اسی وقت رفارم کہا جائے گا کہ مسلمان مسلمان رھیں، یعنے باپ دادا کے مذھب کے، وضع کے، پابند ھوں۔ دور سے الگ پہچان پڑیں کہ مسلمان ھیں اور پھر ان کے دلوں میں زمانۂ حال کے مطابق ترقی کی گدگدی پیدا کی جائے۔

ابن الوقت۔ آخر آپ کے نزدیک اس کی اور کیا تدبیر ہے؟

حجۃ الاسلام - اس کی جو تدبیر ہے خود بہ خود ہو رہی ہے «الدھر احسن المؤدّبین[1]» اب مسلمانوں میں اگلی سی وحشت کا کہیں پتا بھی نہیں -

ابن الوقت - یہ ہماری ہی کوششوں کا نتیجہ ہے -

حجۃ الاسلام - خیر تم یوں ہی سمجھو لیکن اگر ایک طرف تم نے مسلمانوں کی وحشت کو دور کیا تو دوسری طرف ان کو بے دین بنایا - یہ کیا چنید بازی ہے کہ دفع وحشت کی داد چاہو اور بے دینی کا الزام اپنے اوپر نہ آنے دو «میٹھا میٹھا ہپ ہپ کڑوا کڑوا تھو تھو»

ابن الوقت - اجی حضرت! وہ بھولے بھالے زمانے گئے کہ لوگ جلدی سے مذہبی ڈھکوسلوں کا یقین کر لیا کرتے تھے، اب عقل کا دور دورہ ہے۔ شاید آپ کو بھی اس سے انکار نہ ہو گا کہ آج کل کے لڑکے اگلے وقتوں کے بڈھوں کو چٹکیوں میں اڑاتے ہیں اور عقل کے آگے تو مذہب کی دال کا گلنا ذرا مشکل ہی ہے - فلاسفۂ یونان جن کی عقل کا لوہا ساری دنیا نے مانا، سب کے سب لا مذہب ؛ علیٰ ھذاالقیاس یورپ کہ شاید سو میں بمشکل پانچ ایسے نکلیں گے جو سچے دل سے مذہب کے معتقد ہوں -

حجۃ الاسلام - مجھ کو تو تمہاری یہ بات تسلیم نہیں۔ میرے نزدیک ہر زمانے اور ہر ملک میں مذہب کے ماننے والے بہت زیادہ رہے ہیں بہ‌نسبت نہ ماننے والوں کے اور جہاں تک میں خیال کرتا ہوں دنیا کا اب بھی یہی رنگ ہے - تم کو لامذہبوں کی شہرت سے دھوکا ہوا ہوگا سو ایسے لوگوں کی شہرت نہ کثرت کی وجہ سے ہے بلکہ صرف اس سبب سے کہ انھوں نے دنیا سے نرالی، انوکھی بات اختیار کی، نکّو اور انگشت نما

۱- وقت سب سے بہتر ادب دینے والا ہے -

ہو گئے ۔ پھر تمھاری ہی نظر میں ان لا مذہبوں کی عقل کی کچھ قدر اور وقعت ہوگی ، میں تو اُن کو سیانے کوّے سے بڑھ کر نہیں سمجھتا ؛ ضرور نہیں کہ جس کی عقل دنیا تیز ہو ، دین میں بھی اُس کی فہم رسا ہو ۔ خاص خاص عقلیں ، خاص خاص چیزوں سے زیادہ مناسب ہوتی ہیں ؛ ایک شخص شطرنج خوب کھیلتا ہے مگر حساب کا ادنیٰ سوال نہیں حل کر سکتا ۔ عقل فی حد ذاتہٖ ممدوح ہے لیکن وہیں تک کہ درجۂ اعتدال میں ہو «خیر الامور اوسطہا[1]» ورنہ افراط گُرپُزی ہے اور تفریط حمق اور دونوں مذموم اور یہی حال ہے کل فضائل کا بلکہ خدا کی تمام نعمتوں اور رحمتوں کا ؎

لطف حق با تو مواساها کند
چوں کہ از حد بگزرد رسوا کند

اور فرض کیا کہ مذہب سے انکار کرنے والے بڑے عاقل سہی، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم اپنی عقل سے جو مدار تکلیف ہے ، کام نہ لیں اور خود نہ سوچیں ۔ میں نے پچھلی ملاقات میں تم سے مفصلاً اور مشروحاً بیان کیا تھا کہ کہاں تک مذہب میں عقل کو دخل دینا چاہیے مگر شاید تمھارے خیال سے اُتر گیا یا تم نے میرے ساتھ یہ بھی ایک طرح کی چھیڑ خانی نکالی ہے تو مشغلے کے لیے اور بہت سی باتیں ہیں ۔ میں پسند نہیں کرتا کہ مذہب کے ساتھ تمسخّر واستہزاء کیا جائے ۔

ابن الوقت ۔ کیا آپ برا مان گئے ؟

حجۃالاسلام ۔ اگر تحقیق حق کے طور پر بحث کرو تو میں خوشی سے تمھارے اعتراضات کے سننے اور جہاں تک مجھ سے ہو سکتا ہے تمھاری تشفی کرنے کو موجود ہوں مگر مخاصمانہ گفتگو

---

۱ ۔ متوسط درجے کے کام بہتر ہوتے ہیں ۔

کرنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ تم بچے نہیں اور مذہب دوا نہیں کہ پچھاڑ کر تمھارے گلے میں آتار دی جائے، طلب صادق پیدا کرو تب مذہبی مناظرے کا نام لو۔ یاد ہے میں تم سے کہہ چکا ہوں فکر اور تدبّر انسان کو مذہب کے اختیار کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

ابن الوقت - اس کا تو میں آپ کو ہر طرح سے یقین دلا سکتا ہوں کہ استہزاء کا تو خیال بھی میرے دل میں نہیں آیا، ہاں مخاصمانہ کوئی بات میرے منہ سے نکلی ہوگی تو آپ معاف کیجیے، غور کرنے کا مجھے موقع نہیں ملا مگر کروں گا پرسوں یا اترسوں، ذرا کی ذرا سوچنا چاہا تو ذہن اس بات کی طرف منتقل ہو گیا کہ اگر مذہب امر ناگزیر ہو اور فرض کیا جائے کہ اسلام کے سوائے اور سب مذاہب باطل ہیں تو ساری دنیا میں مسلمان اور پھر اُن میں بھی سچے مسلمان کتنے ہیں۔ کسی طرح عقل قبول نہیں کرتی کہ معدودے چند مقبول ہوں باقی تمام جم غفیر مردود۔

حجۃالاسلام - تم تو پرواز کرتے ہی خدائی کی سرحد میں جا پہنچے۔ اول دنیا کی پہیلی کو تو بوجھ چکو، تب ہی آخرت کی چیستان میں عقل آزمائی کرنا۔ یہ بھی من جملہ انہیں اسرار کے ہے جن کے ادراک سے عقل بشر عاجز ہے۔ اگر واقع میں تم کو دین کی طلب گاری ہے تو سیدھا راستہ کیوں نہیں اختیار کرتے کہ دنیا کی ھستی اور اُس کا انتظام اس بات کا مقتضی ہے کہ کوئی اُس کا خالق اور صانع ضرور ہے۔ موجودات عالم پر نظر کرتے ہیں تو انسان کو اشرف المخلوقات پاتے ہیں کیوں کہ وہ صاحب عقل و ادراک ہے کہ اس صفت میں کوئی

اس کا مشارک نہیں، با ایں ہمہ وہ ایک عاجز و نا چیز مخلوق ہے۔
نتیجہ یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ کو نہ ہم دیکھ سکتے ہیں اور
نہ عقل کے زور سے اس کی ذات و صفات کو پورے طور پر دریافت
کر سکتے ہیں مگر جس طرح مخلوقات سے خالق کو پہچانتے ہیں
اسی طرح انھیں مخلوقات سے اتنی باتیں اور سمجھ میں آتی ہیں کہ
جس نے ان کو بنایا اور پیدا کیا ہے، تمام صفات کمالیہ کے ساتھ
متّصف ہے۔ بس یہ تو اصل دین ہے، باقی اسی کے فروع اور متّمات
ہیں۔ میں تم کو بتاؤں ، دین کے دو حصے کرو ؛ اولاً نفس اسلام
پھر اسلام کے فرقوں میں کوئی ایک فرقہ خاص، جس کے معتقدات
تم کو پسند ہوں۔ میں امید کرتا ہوں کہ مذہب کے متعلق
جو کچھ میں نے اب تک تم سے کہا پہلے حصے یعنی نفس اسلام
کی نسبت تمھاری تشفّی کر سکتا ہے بشرطیکہ تم کو تشفی درکار
ہو اور جب اسلام کی اصلی اور حقیقی عمدگی تمھارے ذہن میں
اچھی طرح بیٹھ جائے گی ، جس کی شناخت یہ ہے کہ اعمال
اضطراراً سرزد ہونے لگیں تو میری یہ بات لکھ رکھو کہ انگریزی
تعلیم خود تم ہی کو بہ تقاضائے مذہب وبال معلوم ہونے لگے گی۔
رہا دوسرا حصہ یعنی اسلام کے فرقوں میں کسی فرقۂ خاص
کی تعیین اس کو کسی دوسرے وقت پر رکھو۔

